(۷۲)

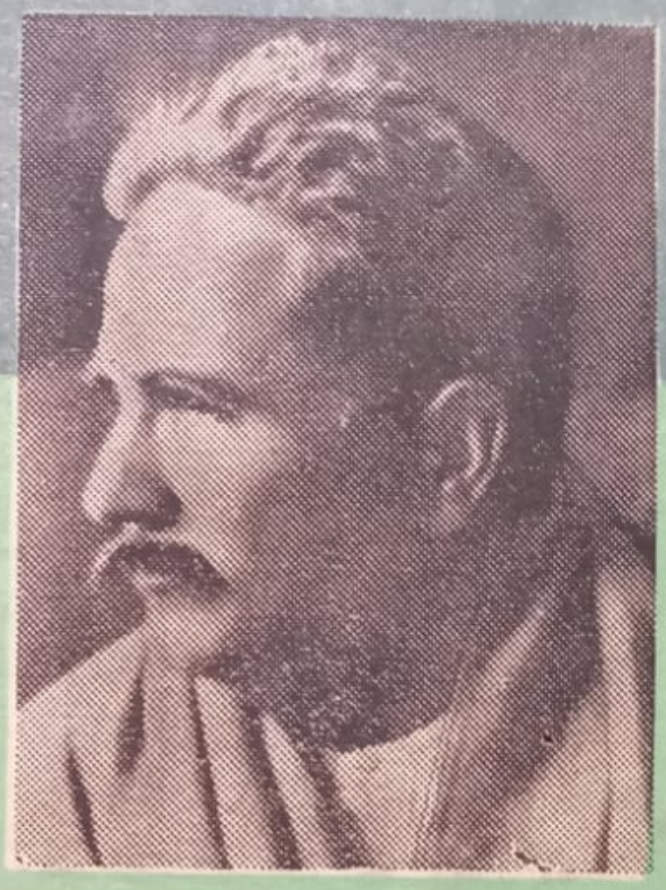

اقبالیات کا مُطالعہ

پروفیسر سیّد وقار عظیم

مُرتّبہ

ڈاکٹر سیّد مُعین الرحمٰن

علامہ اقبال
۱۹۷۷ء
مرکزی مجلس تقریبات ولادت

موصد

اقبالیات کا مُطالعہ

پروفیسر سیّد وقار عظیم

مُرتّبہ

ڈاکٹر سیّد مُعین الرحمٰن

نیشنل کمیٹی برائے صد سالہ تقریبات ولادت علامہ محمّد اقبالؒ

اِقبال اکادمی پاکستان

۹۰-بی-۲-گلبرگ ۳ ○ لاہور

جملہ حقوق محفوظ

ناشر ڈاکٹر محمد معزالدین
ڈائریکٹر ، اقبال اکادمی پاکستان ، لاہور

طابع سید اظہارالحسن رضوی

مطبع مطبع عالیہ ، ۱۲۰ ٹمپل روڈ ، لاہور

طبع اول ۱۹۷۷ء

تعداد ۱۱۰۰

مندرجات :

○ مقدمہ : ڈاکٹر سید معین الرحمٰن ۹-۳۴

مقالات :

۱- اقبال اور نژادِ نو ۱
۲- تلاش عزلت اور احساس تنہائی ۵۰
۳- طلسمِ گنجینۂ معنی ۹۸

جائزے :

۴- اقبالیات کے پانچ سال : ۱۹۳۷ء—۱۹۴۱ء ۱۱۳
۵- اقبال کی شاعری کے ادوار ۱۳۰
۶- اقبال کی اردو اور فارسی غزل ۱۴۳
۷- اقبال کی فطرت نگاری اور ان کا فلسفۂ جمال ۱۵۴
۸- پیغام اقبال کی آفاقیت ۱۶۸
۹- اقبال کا نظریۂ وطنیت ۱۷۶
۱۰- اقبال اور اشتراکیت ۱۸۳

متفرقات :

۱۱- اقبال—خطوں کی روشنی میں ۲۰۵
۱۲- خودی—بحرِ بے کنار ! ۲۱۰
۱۳- اقبال—حقیقت بیں ، حقیقت شناس ! ۲۱۶

۱۴- اقبال اور عشق رسول ۲۲۶
۱۵- غزل گو اقبال ۲۳۳

اضافات :

۱۶- ''اقبال کی شخصیت اور شاعری'' پر ایک نظر ۲۴۷
۱۷- اقبال اور سوزِ غمِ ملت ۲۵۱
۱۸- انیس اور اقبال ۲۷۱
۱۹- شذرات : متعلق بہ اقبال ۳۰۳
۲۰- ''عقل و دل'' اقبال کی نظر میں ۳۲۱
۲۱- IQBAL : Poet and Philosopher ۳۳۷
○ اشاریہ : ۳۴۵
(الف) اسماء الرجال
(ب) کتب و رسائل
(ج) اماکن

پیشکش

اقبال پر اپنے پہلے مجموعۂ مضامین ''اقبال--شاعر اور فلسفی'' کا انتساب وقار عظیم صاحب نے پروفیسر حمید احمد خاں کے نام کیا تھا - اُن کے مرتبہ مجموعۂ مضامین ''اقبال--معاصرین کی نظر میں'' کا انتساب ڈاکٹر ایس - ایم - اکرام کے نام ہے -

میں چشم تصور سے دیکھتا ہوں کہ اگر مرحوم زندہ ہوتے اور ''اقبالیات کا مطالعہ'' کو خود ترتیب دیتے تو اسے خواجہ منظور حسین (علیگ) کے نام نامی سے منسوب فرماتے جن کی صحبت اور رفاقت افسانوی ادب اور اقبالیات سے وقار عظیم صاحب کے اولین تعارف اور تعلق کا ایک باعث ہوئی - خدا انھیں سدا سلامت باکرامت رکھے !

--ڈاکٹر سید معین الرحمٰن

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن

ایم۔اے، پی ایچ ڈی

موجودہ مصروفیت :

وائس پرنسپل ، پروفیسر و صدر شعبۂ اردو
گورنمنٹ کالج ، فیصل آباد (لائلپور)

مطبوعات و مرتبات :

۱- بابائے اردو۔احوال و افکار ۱۹۶۴ء ، ۱۹۷۶ء
۲- سید وقار عظیم۔سوانحی خاکہ ۱۹۶۷ء
۳- نقدِ عبدالحق ۱۹۶۸ء
۴- خیالستانِ یلدرم ۱۹۶۸ء ، ۱۹۷۶ء
۵- اشاریۂ غالب ۱۹۶۹ء
۶- مطالعۂ یلدرم ۱۹۷۱ء
۷- غالبیات کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ ۱۹۷۲ء
۸- غالب اور انقلاب ستاون ۱۹۷۳ء ، ۱۹۷۶ء
۹- آپ بیتی۔رشید احمد صدیقی ۱۹۷۳ء ، ۱۹۷۷ء
۱۰- ذکرِ عبدالحق ۱۹۷۵ء
۱۱- فرمودات عبدالحق ۱۹۷۷ء
۱۲- قائداعظم اور لائلپور ۱۹۷۷ء
۱۳- جامعات میں اقبال کا تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ ۱۹۷۷ء
۱۴- اقبالیات کا مطالعہ (سید وقار عظیم) ۱۹۷۷ء

مستقل پتا :

رحمٰن اسٹریٹ نمبر ۱ ، بہاول نگر۔

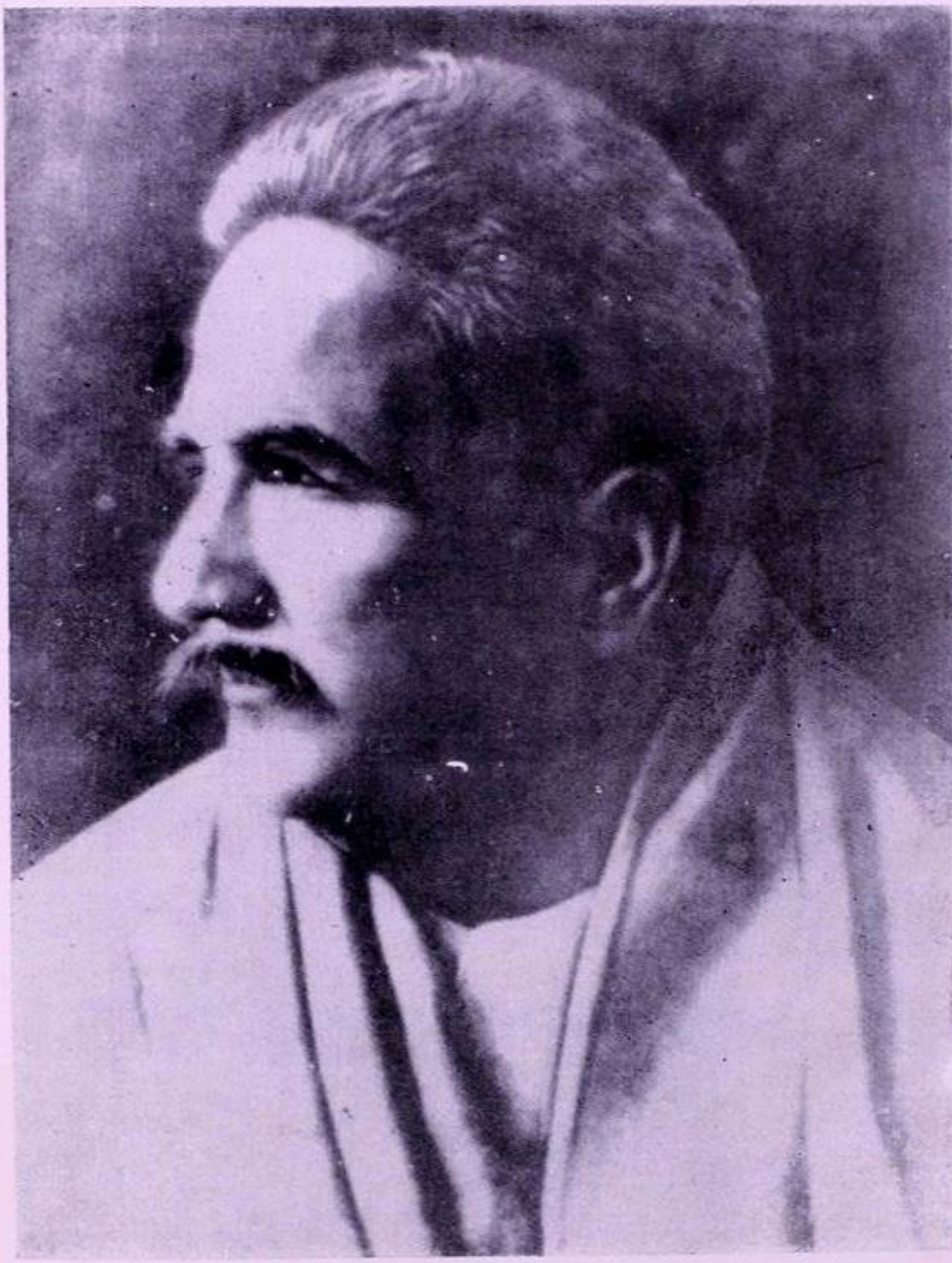

علّامہ مُحمّد اِقبالؒ

(۱۸۷۷ — ۱۹۳۸)

مقدمہ

'اقبالیات کا مطالعہ'

از

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن

علامہ اقبال (۱۸۷۷ء—۱۹۳۸ء) سے پروفیسر سید وقار عظیم (۱۹۰۹ء—۱۹۷۶ء) کی دلچسپی کا آغاز ۱۹۲۵ء میں ہوا - آگے چل کر یہ تعلق نہ صرف یہ کہ برقرار رہا بلکہ استوارتر ہوتا چلا گیا —یہاں تک کہ نومبر ۱۹۷۶ء میں وہ مرض الموت میں مبتلا ہو کر ہسپتال میں داخل ہوئے تو بھی اقبالیات کا ایک دفتر کا دفتر آن کے ساتھ تھا - اس طرح اقبال سے وقار عظیم صاحب کے تعلق خاطر کی کہانی کوئی دو چار دن کی بات نہیں ، یہ پوری ایک نصف صدی پر محیط ہے -

اقبال اور اقبالیات سے وقار عظیم صاحب کے عشق اور شغف کی یہ روداد ۱۹۲۵ء سے ۱۹۷۶ء تک جن مراحل سے ہو کر گزرتی ہے ، وہ یہ ہیں :

۱- اقبال سے وقارعظیم صاحب کے ابتدائی تعارف کے پچیس سال ۱۹۲۵ء-۱۹۴۹ء

۲- شہر اقبال ، جامعہ پنجاب اور وقارعظیم صاحب ۱۹۵۰ء-۱۹۷۰ء

۳- ''اقبال—شاعر اور فلسفی'' از : سید وقارعظیم ۱۹۶۸ء

۴- ''اقبال—معاصرین کی نظر میں'' از : سید وقارعظیم ۱۹۷۳ء

۵- پیہم مصروفیات میں اقبال پر مضامین نو کی فکر ۱۹۷۱ء-۱۹۷۶ء

۶- کچھ ''اقبالیات کا مطالعہ'' کے بارے میں ۱۹۷۷ء

اگلے صفحات میں یہ روداد سلسلے وار درج کی جا رہی ہے :

(۱)

یکم اپریل ۱۹۷۳ء کو رفیع الدین ہاشمی نے لاہور میں بطور خاص صرف اقبال ہی کے موضوع پر وقارعظیم صاحب سے گفتگو کی - آن کے بعض استفسارات کے جواب میں سید وقارعظیم صاحب نے بیان کیا کہ :

"یہ ۱۹۲۵ء ، ۱۹۲۶ء کا زمانہ تھا - میں اسکول میں پڑھتا تھا - ہمارے نصاب کی کتاب میں اقبال کا منتخب کلام شامل تھا - یہ انتخاب چند نظموں : بچے کی دعا ، ترانۂ ہندی ، نیا شوالہ ، جگنو ، ہمالہ ، اور ایک آرزو پر مشتمل تھا - یہیں سے اقبال کے ساتھ میری دل چسپی کا آغاز ہوا -

کلام اقبال سے میری دل چسپی کا دوسرا سبب یہ ہوا کہ اس زمانے میں طغروں وغیرہ سے گھروں کی آرائش کا بہت شوق ہوا کرتا تھا - ہمارے گھر کے مختلف کمرے ، تاج کمپنی کے رنگین مطبوعہ قطعات سے مزین تھے - بعض کتبوں پر قرآن کی آیات، کچھ کتبوں پر سعدی کے اور بعض پر اقبال کے اشعار درج تھے - چنانچہ مجھے اقبال کے وہ سارے اشعار جو کتبوں پر لکھے تھے ، زبانی یاد ہوگئے اور میں انھیں بڑے شوق کے ساتھ پڑھا کرتا -

اسکول کے زمانے میں کلام اقبال سے جو تعارف اور تعلق پیدا ہوا ، آگے چل کر یہ تعلق نہ صرف بدستور قائم رہا بلکہ اس میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا - ہوا یوں کہ جب میں نے ایف - اے میں داخلہ لیا تو افسر میرٹھی ہمارے استاد تھے - وہ شعر و ادب کا

نہایت اچھا ذوق رکھتے تھے - خود بھی شعر کہتے تھے__ افسانے سے بھی انہیں خاص دل چسپی تھی - اُن کی کلاس میں ہم بیس پچیس لڑکے تھے - وہ ہمیشہ سبق پڑھاتے ہوئے ہمیں بچوں کی نظمیں بھی سناتے تھے - یہ نظمیں اسماعیل میرٹھی اور اقبال اور خود اُن کی اپنی ہوتیں - اس طرح اقبال کی مزید نظمیں سننے اور پڑھنے کا موقع ملا - پھر ہمارے اُردو کے نصاب میں اقبال کی بعض نظمیں مثلاً ''خضر راہ'' اور ''والدہ مرحومہ کی یاد میں'' کے کچھ حصے اور کچھ غزلیں شامل تھیں - افسر میرٹھی صاحب کی عادت تھی کہ جس شاعر کا کلام پڑھاتے اس پر زبانی گفتگو کرتے - ان شاعروں کے مجموعہ ہائے کلام لا کر ہمیں دکھاتے - اس طرح نئی نئی کتابوں کو دیکھ کر ہمیں بھی وہ کتابیں پڑھنے کا شوق پیدا ہوتا - جن لڑکوں کو پڑھنے کا شوق ہوتا ، انہیں وہ کتابیں دے بھی دیتے تھے - چونکہ افسر صاحب اور ہم ایک ہی محلے میں رہتے تھے اس لیے آنا جانا تھا اور ہم کتابیں اُن سے لے کر پڑھتے تھے -

بی - اے میں ہمارے استاد مولوی محمد حسین اور سید مسعود حسن رضوی ادیب تھے - مولوی صاحب اشعار پڑھاتے ہوئے مختلف شعراء اور ان کے کلام کا باہمی موازنہ کرتے جاتے تھے - چنانچہ اُس زمانے میں شاعری کے بارے میں بعض ایسی باتیں ذہن میں آئیں اور معلوم ہوئیں جو اس تسلسل کے ساتھ اس سے پہلے کبھی ذہن میں نہیں آئی تھیں - مولوی محمد حسین صاحب شاعری پڑھاتے ہوئے انیس ، چکبست اور اقبال کا خصوصی ذکر کرتے ، اُن کے کلام کا آپس میں مقابلہ کرتے اور انیس اور چکبست__ اور چکبست اور اقبال کے بعض بند تقابلی حیثیت سے پڑھ کر سناتے -

ہمارے زمانے میں ، ایم - اے میں اقبالیات کا الگ پرچہ تو

نصاب میں شامل نہیں تھا ، البتہ ایم - اے (پریوس) میں ایک پورا پرچہ جدید شاعری کا تھا - اس میں عزیز لکھنوی کی 'گلکدہ' چکبست کی ''صبح وطن'' ، اقبال کی ''بانگ درا'' اور اکبر کی کلیات کے تیسرے حصے کا مطالعہ شاملِ نصاب تھا - چنانچہ ان شعراء کے مطالعے کے سلسلے میں پوری قومی شاعری کا مطالعہ کیا -

اُس زمانے میں الہ آباد یونیورسٹی میں یہ قاعدہ تھا کہ جو طالب علم ایم - اے میں فرسٹ آتا تھا ، اُسے دو سال تک وظیفہ ملتا تھا تاکہ وہ کوئی تحقیقی مقالہ لکھ سکے- تو مجھے بھی وظیفہ ملا تھا اور میں ابھی مقالے کی ترتیب و تسوید سے فارغ نہیں ہوا تھا کہ الٰہ آباد یونیورسٹی میں چھ ماہ کے لیے ایک اُستاد کی جگہ خالی ہوئی اور اُس پر میرا تقرر ہوگیا - یہ چھ ماہ ختم ہوئے تو خواجہ غلام السیدین کے مشورے سے میں نے علی گڑھ میں بی ٹی کلاس میں داخلہ لے لیا - سیدین صاحب اس زمانے میں ٹریننگ کالج علی گڑھ کے پرنسپل تھے اور پرنسپلز آف ایجوکیشن کا پرچہ پڑھاتے تھے جس میں دنیا بھر کے نظام ہائے تعلیم اور ان کے ارتقا پر بحث ہوتی - سیدین صاحب کو اقبال سے بطور خاص دل چسپی تھی - وہ اپنے اسباق میں اقبال کا بہت ذکر کرتے تھے -[1] اُن کا لیکچر انگریزی میں ہوتا تھا مگر وہ اقبال کے اقتباسات سناتے - ایک بار

---

۱ - خواجہ غلام السیدین صاحب کی بڑی مشہور کتاب ہے : ''Iqbal's Educational Philosophy طبع اول ۱۹۳۸ء ، طبع دوم : ۱۹۴۵ء
اقبال کے بارے میں سیدین صاحب کی بعض دوسری انگریزی اور اردو تحریروں کے لیے دیکھیے :
A Bibliography of Iqbal by : K. A. Waheed, 1965 pp. 55,167

انھوں نے اپنے لیکچر میں اقبال کی نظم ''عہد حاضر کا انسان'' پڑھ کر سنائی -

ہمارے ایک اور آستاد تھے حفیظ سید ، وہ مجھ سے بہت محبت اور شفقت سے پیش آتے تھے- ''ضرب کلیم'' چھپ کر آئی تو انھوں نے اس کے دو نسخے خریدے ، ایک اپنے لیے رکھا اور دوسرا اپنے دستخطوں سے مجھے دیا کہ تمھارے شوق کے پیش نظر دیتا ہوں - ''ضرب کلیم'' کے پہلے ایڈیشن کا یہ نسخہ اب بھی میرے پاس محفوظ ہے--تو اس زمانے میں خواجہ غلام السیدین صاحب کی وجہ سے اقبال سے شغف اور بھی بڑھتا گیا - پھر خواجہ منظور حسین ، رشید احمد صدیقی ، آل احمد سرور ، معین احسن جذبی اور اختر انصاری وغیرہ سے ملاقاتیں ہوتی رہیں - یہ سب کبھی سیدین صاحب کے ہاں اور کبھی خواجہ صاحب کے ہاں جمع ہوتے - ان محفلوں میں اقبال کا ذکر آتا - ہر ایک کو اقبال سے دلچسپی تھی ، خصوصاً رشید صاحب ، سرور صاحب اور سیدین صاحب کو تو بہت ہی دلچسپی تھی -

۱۹۳۸ء کے آخر میں میں جامعہ ملیہ ، دہلی میں اردو کے آستاد کی حیثیت سے چلاگیا اور چار سال جامعہ میں گزارے - جامعہ میں قیام کے دوران میں اقبال سے وابستگی اور گہری ہوگئی - اس کی ایک وجہ جامعہ میں ڈاکٹر ذاکر حسین اور ڈاکٹر عابد حسین کی موجودگی بھی تھی - میں نے اسی زمانے میں اقبال کے سب مجموعے اکھٹے کیے اور انھیں پڑھا -

جامعہ سے میں پالی ٹیکنیک (دہلی)میں چلاگیا - حمید احمد خان صاحب بھی وہاں آ گئے ، بعض لوگ ریڈیو میں تھے مثلاً حامد علی خاں، پطرس بخاری، فیض اور چراغ حسن حسرت وغیرہ--دلی

میں عبدالواحد ایک صاحب تھے - ہر ماہ ایک بار اُن کے گھر ایک ادبی نشست ہوتی جس میں کوئی ادبی مضمون پڑھا جاتا - مجھے ان نشستوں میں شامل ہونے کا موقع ملا - تین چار سال تک یہ محفلیں ہوتی رہیں - نئے ادیب بیشتر دلی میں جمع تھے - ان نشستوں اور ادبی محفلوں میں ضرور اقبال کا ذکر ہوتا ، یوں اقبال سے دلچسپی میں برابر اضافہ ہوتا چلا گیا -[۲]

"کلام اقبال کے ساتھ میری یادوں کا رشتہ (۵۰-۱۹۵۱) سال پرانا ہے - اس رشتے کا آغاز بچے کی دعا ، ترانۂ ہندی ، جگنو ، نیا شوالہ اور ایک آرزو کے مطالعے سے ہوا - درسی کتابوں میں پڑھی ہوئی ان نظموں کے ایک ایک شعر نے مجھے کیوں اپنا گرویدہ بنایا ، اس کا تجزیہ میرے لیے ممکن نہیں، البتہ اتنا یاد ہے کہ میر کی ایک غزل ، غالب کی دو غزلیں اور اقبال کی یہ چند نظمیں بار بار پڑھتا اور ان میں ایک نا معلوم سی لذت محسوس کرتا تھا - آگے چل کر یہ لذت میری جذباتی زندگی اور فکری زندگی کا عزیز سرمایہ بنتی گئی - زندگی کے مختلف مرحلوں میں یہ سرمایہ عزیز سے عزیز تر ہوتا رہا اور بالآخر اقبال کا کلام میرے مادی اور روحانی وجود پر چھا گیا - اس نے بہت سے نازک مرحلوں پر مجھے روشنی دکھائی"[۳]

"یہ میری ایک محرومی ہے کہ اقبال سے کبھی ملاقات نہیں ہو سکی - میرا طالب علمی کا سارا زمانہ یو - پی میں گزرا ، کیونکہ میرے والد وہیں ملازم تھے - اقبال اس زمانے میں

---

۲ - رفیع الدین ہاشمی سے وقار عظیم صاحب کی گفتگو ، بمقام لاہور ، یکم اپریل ۱۹۷۳ء -

۳ - اقبال ، شاعر اور فلسفی ، ۱۹۶۸ء ، پیش لفظ -

اس علاقے میں نہیں گئے اور مجھے ادھر آنے کا موقع نہ ملا۔ ویسے تو میں نے اُس زمانے کا ہر بڑا مشاعرہ سنا اور تقریباً تمام قابلِ ذکر شعراء کو دیکھا مگر اقبال مشاعروں میں نہیں جاتے تھے، اس لیے اُن کی زیارت نہ ہو سکی۔ بعد میں جب ہوش آیا اور اقبال کی قدر ہوئی تو وہ دور گزر چکا تھا اور اقبال فوت ہو چکے تھے۔"[۴]

(۲)

وقار عظیم صاحب نے پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج (لاہور) کے شعبۂ اُردو میں فروری ۱۹۵۰ء سے ستمبر ۱۹۷۰ء تک قریب اکیس برس افسانوی ادب اور اقبالیات کا درس دیا اور بیسیوں نوخیز اور ذہین متعلمین کو مطالعۂ اقبال کی راہ پر لگایا اور انھیں اقبال پر تحقیقی اور تنقیدی کاموں کی راہیں سجھائیں اور اس طرح نژادِ نو میں اقبال سے دل بستگی کی ایک ایسی لہر بہر پیدا کی جس کی کوئی دوسری مثال پیش نہیں کی جا سکتی۔

شہرِ اقبال میں وقار عظیم صاحب کی آمد، جامعہ پنجاب سے اُن کی وابستگی، اس وابستگی کی اہمیت اور اس کے اثراتِ مابعد کا کچھ اندازہ خود وقار عظیم صاحب کے ایک بیان سے بھی لگایا جا سکتا ہے۔ ایک موقع پر اُنھوں نے لکھا ہے کہ:

"۱۹۵۰ء کے شروع میں جب مجھے (پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج) کے شعبۂ اُردو سے وابستہ ہونے کا شرف حاصل ہوا تو اسے میں نے زندگی کا ایک اہم واقعہ سمجھا اور بلاشبہ یہ واقعہ آگے چل کر کئی حیثیتوں سے اہم ثابت

۴۔ رفیع الدین ہاشمی سے وقار عظیم صاحب کی گفتگو، بمقام لاہور، یکم اپریل ۱۹۷۳ء۔

ہوا—فروری ۱۹۵۰ء سے اپنی سبکدوشی کے وقت (ستمبر ۱۹۷۰ء) تک کی تقریباً اکیس سال کی مدت میرے لیے اس لحاظ سے بڑی اہم ہے کہ اس مدت کا ایک ایک لمحہ کاموں میں مصروف رہنے اور دوسروں کو کاموں میں مصروف رکھنے کی مسرت و سرخوشی میں بسر ہوا۔

میں نے جب ۴ - فروری کو کالج میں قدم رکھا تو میرے حصے کا کام میرا منتظر تھا - اسی دن پتہ چل گیا کہ ایم - اے کی جماعتوں میں افسانوی ادب اور اقبال کے پرچوں کی تدریس میرے ذمے ہے - جماعتوں سے ابتدائی تعارف کا مرحلہ بڑی تیزی سے طے ہوا اور میں نے پہلے ہی دن طلباء اور طالبات سے ابتدائی گفتگو کی اور کل سے جو کام کرنا تھا ، طلباء کے مشورے سے اس کا ابتدائی خاکہ مرتب کیا - کام شروع ہوا تو ایم - اے کی تدریس کے مختلف رخ سامنے آئے - ایم - اے کے طلباء کو سات پرچوں میں امتحان دینا ہوتا تھا ، ان میں سے آخری پرچہ مضمون نگاری کا تھا - طلباء کو اختیار تھا کہ اس پرچے کے بجائے وہ کسی منظور شدہ موضوع پر مقالہ (تھیسس) لکھیں ، چنانچہ اس سال یعنی ۱۹۵۰ء میں ، جن طلباء اور طالبات کو ایم - اے کے امتحان میں شریک ہونا تھا ، ان میں سے تقریباً آدھے مقالہ لکھ رہے تھے - بعض مقالات کی نگرانی میرے سپرد ہوئی - مقالات کے خاکے اور طلباء کی کارکردگی دیکھ کر اندازہ ہوا کہ انھیں کام کا شوق تو ہے لیکن مقالے کی ترتیب ، تدوین اور تسوید کے مختلف مراحل جس توجہ ، انہماک ، تن دہی اور دماغ سوزی کی طلب اور تقاضا کرتے ہیں ، اس کا احساس انھیں ابھی نہیں - ایم - اے کے طلباء (کی یہ

جماعت پنجاب یونیورسٹی سے) پہلی مرتبہ ایم - اے اردو کے امتحان میں بیٹھ رہی تھی ، اس لیے مقالہ نگاری کا تجربہ آن کی زندگی کا پہلا تجربہ تھا اور عام مضمون نگاری اور مقالہ نگاری میں جو فرق ہے ، آس سے اب تک وہ واقف نہیں تھے -

یہ بات پہلے سال کی ہے ، اس کے بعد آنے والے ہر دور میں سال بہ سال جو مقالات لکھے گئے ، آن کی ترتیب و تحریر کے معیار میں بتدریج ترقی ہوئی اور بالآخر یہ صورت پیدا ہوئی کہ ایم - اے کے امتحان کے لیے لکھے ہوئے مقالوں میں سے بعض ایسے ہوتے تھے کہ بڑی آسانی سے انھیں پی ایچ - ڈی کے مقالوں کے مقابلے میں رکھا جا سکتا تھا -"[۵]

"اقبال کے مختلف پہلوؤں پر پنجاب یونیورسٹی میں ایم - اے کے اسی پچاسی سے آوپر مقالات (تھیسس) لکھے گئے - اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ تعلیم یافتہ نوجوانوں کو اقبال سے کتنی دل چسپی ہے - ظاہر ہے کہ یہ کام شوق اور وابستگی کے بغیر نہ ہو سکتا ہے ، نہ کرایا جا سکتا ہے -"[۶]

پنجاب یونیورسٹی میں آردو ، فلسفہ ، سیاسیات ، اسلامیات ، فارسی ، تاریخ اور معاشیات کے شعبوں میں اقبال سے متعلق موضوعات پر ایم - اے کے مقالات کے علاوہ یونیورسٹی کے ادارۂ تعلیم و تحقیق میں اقبال پر ایم - ایڈ کے مقالات بھی تحریر کیے گئے

---

۵ - اورینٹل کالج میگزین ، لاہور ، جلد ۵۰ ، عدد ۱-۳ ، ۱۹۷۴ء ، صفحہ ۱۲۱-۱۲۲ -

۶ - رفیع الدین ہاشمی سے وقار عظیم صاحب کی گفتگو ، بمقام لاہور ، یکم اپریل ۱۹۷۳ء -

ہیں ۔[۷] یونیورسٹی اورینٹل کالج ، لاہور کے شعبۂ اردو میں ، وقار عظیم صاحب جس کے سربراہ رہے ہیں ، اقبال کے بارے میں سب سے زیادہ کام ہوا ہے - یہاں ایم - اے کی سطح پرخود پروفیسر سید وقار عظیم صاحب کے بقول :

''اقبال کے فکر و فن کے مختلف پہلوؤں اور ان کے کلام کے مختلف مجموعوں پر (چار) درجن کے قریب (مقالات) لکھے گئے۔''[۸]

ان ''چار درجن'' کے قریب مقالات میں سے پروفیسر سید وقار عظیم صاحب کی زیرِ نگرانی جو مقالات لکھے گئے ، ان کی تفصیل یہ ہے :

۱ - علامہ اقبال کے کلام میں حکمرانوں کا تذکرہ	منظور الحق صدیقی	۱۹۵۳ء	صفحات ۲۹۰
۲ - اردو ترجمہ ''اقبال لاہوری'' (مجتبیٰ مینوی)	محمد صدیق	۱۹۵۳ء	۶۲
۳ - اقبال کا فلسفۂ حیات	مبارک علی مرزا	۱۹۵۴ء	۱۳۶
۴ - اردو شاعری پر اقبال کے اثرات	مہر افروز درانی	۱۹۵۶ء	۲۹۰
۵ - اقبال کی اردو غزل	حمیدہ ملک	۱۹۶۱ء	۱۶۸
۶ - اقبال کی ملی شاعری	نیر جہاں نامی	۱۹۶۲ء	۱۵۲
۷ - اقبال کا ذہنی ارتقاء	فریدہ مفتی	۱۹۶۲ء	۲۷۱

---

۷ - تفصیلات کے لیے رجوع کیجیے : ''جامعات میں اقبال کا تنقیدی اور تحقیقی مطالعہ — ایک جائزہ'' از : ڈاکٹر سید معین الرحمٰن طبع : ۱۹۷۷ء -

۸ - اورینٹل کالج میگزین ، ایضاً ، ۱۹۷۴ء ، صفحہ ۱۲۲ -

۸ - ''بانگ درا'' کا تنقیدی تجزیہ	شکیلہ نور جہاں	۱۹۶۳ء	۲۶۷
۹ - اقبال کی طویل نظموں کا تجزیہ	یاسمین سلطانہ	۱۹۶۳ء	۲۶۷
۱۰ - ''بال جبریل'' کا تنقیدی جائزہ	محمد صدیق جاوید	۱۹۶۵ء	۲۱۲
۱۱ - اقبال کی شاعری کا فنی پہلو	خدیجہ	۱۹۶۶ء	۱۹۸
۱۲ - اقبال کے سیاسی نظریات	عذرا سلطانہ	۱۹۶۶ء	۳۲۳
۱۳ - اقبال کی امیجری	حریت ناصر	۱۹۶۸ء	۱۰۶
۱۴ - مکالماتِ اقبال کا تجزیہ	سیدہ سلطانہ اختر	۱۹۷۰ء	۲۴۶
۱۵ - اقبال کی قومی شاعری	شمیم ملک	۱۹۷۰ء	۱۹۴
۱۶ - کلامِ اقبال میں تاریخی شخصیتیں	ریحانہ دارا	۱۹۷۱ء	۶۵۳

اقبال پر ان سولہ تحقیقی اور تنقیدی مقالات سے قطع نظر جو اول تا آخر پروفیسر سید وقار عظیم کی نگرانی میں تیار کیے گئے، وقار عظیم صاحب نے اقبال پر متعدد دوسرے مقالات کی ترتیب و تسوید میں بھی، جو براہِ راست آن کی نگرانی میں نہیں لکھے گئے، یونیورسٹی کے بہت سے متعلمین کی رہنمائی کی - ایسے بعض مقالات کے کوائف یہ ہیں :

۱ - مکاتیبِ اقبال کا فکری و فنی پہلو	صفورا سلطانہ[۹]	۱۹۶۱ء	صفحات ۱۳۸
۲ - اقبال اور مناظرِ فطرت	زرینہ احمد علی[۱۰]	۱۹۶۳ء	۱۸۹
۳ - ''ضربِ کلیم'' اور ''ارمغانِ حجاز'' کے موضوعات کا تنقیدی تجزیہ	بلقیس جمال افسرہ[۱۱]	۱۹۶۵ء	۱۴۸
۴ - ''اقبال ریویو'' کی وضاحتی فہرست (جنوری ۱۹۶۰ء -- اپریل ۱۹۶۷ء)	ناہید طلعت[۱۲]	۱۹۶۷ء	۱۳۰

۹ - مقالے میں اگر کچھ ''سکت'' ہے تو وہ: ''ڈاکٹر سید عبداللہ کی انتہائی مشفقانہ رہنمائی اور پروفیسر سید وقار عظیم صاحب کے مفید مشوروں کی مرہونِ منت ہے۔''
(صفورا سلطانہ، دیباچہ: مکاتیبِ اقبال کا فکری و فنی پہلو)

۱۰ - ''میں پروفیسر سید وقار عظیم صاحب کی تہہ دل سے مشکور ہوں جنھوں نے مجھے اپنے مفید مشوروں سے مستفید کرنے کے علاوہ، کتب کی فراہمی میں بھی میری امداد کی۔''
(زرینہ احمد علی، پیش لفظ: اقبال اور مناظرِ فطرت)

۱۱ - ''استاد مکرم محترم سید وقار عظیم صاحب کی میں تہہِ دل سے ممنون ہوں جنھوں نے مختلف مرحلوں پر (اقبال کے بارے میں لکھی جانے والی کتابوں اور مقالوں کی نشاندہی میں) میری مدد فرمائی اور اپنے قیمتی ذخیرۂ کتب سے مستفید ہونے کا موقع دیا۔''
(بلقیس جمال افسرہ، دیباچہ: ضربِ کلیم اور ارمغانِ حجاز کے موضوعات کا تنقیدی تجزیہ)

۱۲ - ''ڈاکٹر عبادت بریلوی، پروفیسر سید وقار عظیم اور سید معین الرحمٰن صاحب وہ ہستیاں ہیں جن کے عالمانہ مشورے اور پرخلوص حوصلہ افزائیاں ناقابلِ فراموش ہیں۔ ان سب اساتذہ کی تہہِ دل سے شکر گزار ہوں۔''
(ناہید طلعت، پیش لفظ: ''اقبال ریویو'' کی وضاحتی فہرست)

۵ - سہ ماہی ''اقبال'' کی وضاحتی فہرست (جولائی ۱۹۵۲ء - اکتوبر ۱۹۵۹ء)	زاہدہ نزہت[۱۳]	۱۹۶۷ء	۸۱
۶ - سہ ماہی ''اقبال'' کی وضاحتی فہرست (جنوری ۱۹۶۰ء - اپریل ۱۹۶۷ء)	زرین اختر زیدی[۱۴]	۱۹۶۷ء	۹۷
۷ - اقبال کے معاشی تصورات	منظور الاسلام[۱۵]	۱۹۷۱ء	۲۰۱

ان کوائف اور حقائق کی روشنی میں یہ اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں رہ جاتا کہ پنجاب کی نئی نسل میں اقبالیات کا ذوق

۱۳ - ''محترم پروفیسر سید وقار عظیم اور سید معین الرحمٰن صاحب کی بے حد ممنون ہوں کہ جنھوں نے طرح طرح سے میری مدد فرما کر مجھے کوفت سے بچایا۔''

(زاہدہ نزہت ، دیباچہ : ''اقبال'' کی وضاحتی فہرست)

۱۴ - ''میں اساتذۂ کرام خصوصاً اُستادِ محترم جناب سید وقار عظیم صاحب جنھوں نے رسائل کی فراہمی کے سلسلے میں میری راہنمائی فرمائی اور اپنے استاد محترم جناب سید معین الرحمٰن صاحب کی بے حد ممنون ہوں کہ انھوں نے ہر کام میں میری راہنمائی کی اور اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود میری ہر مشکل کو حل کرنے کی سعی فرمائی۔''

(زرین اختر زیدی ، حرفے چند ''اقبال'' کی وضاحتی فہرست)

۱۵ - ''ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی صاحب نے سید وقار عظیم صاحب کے مشورے سے میرے لیے ''اقبال کے معاشی تصورات'' جیسا اہم عنوان تجویز کیا۔''

(منظور الاسلام ، دیباچہ : اقبال کے معاشی تصورات)

پیدا کرنے اور اقبال شناسی کی فضا پیدا کر دینے میں پروفیسر سید وقار عظیم کا کتنا قابلِ فخر حصہ اور قابلِ رشک دخل رہا ہے---ستمبر ۱۹۷۱ء میں وقار عظیم صاحب یونیورسٹی سے قریب اکیس برس کی منصبی وابستگی کے بعد پہلے "غالب پروفیسر" کی حیثیت سے سبکدوش ہوئے - آن کے حینِ حیات پاکستان اور ہندوستان کی کسی بھی یونیورسٹی کے کسی بھی آستاد نے اقبال پر وقار عظیم صاحب سے زیادہ ، تحقیقی کام کی نگرانی اور رہنمائی کی خدمت انجام نہیں دی -

(۳)

پروفیسر سید وقار عظیم نے اکیس برس شعبۂ اردو پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج ، لاہور میں اقبالیات کا درس دیا ، اور اس طرح درس دیا کہ اس کا حق ادا کر دیا :

"پڑھانے کے لیے مجھے اقبال اور اقبالیات کا مزید مطالعہ کرنا پڑا - یہ مطالعہ اور غور و فکر میں نے برابر جاری رکھا - تدریس کے دوران میں اگر کسی طالب علم نے کوئی ایسی بات پوچھی جس کا فوری طور پر جواب دینے میں اطمینان نہ ہوا ، تو میں نے کبھی تکلف سے کام نہیں لیا ، طلباء سے صاف کہہ دیا کہ مزید غور و فکر کر کے بتاؤں گا - جب تک طبیعت کا اطمینان نہیں ہوا ، طلباء کو سرسری جواب نہیں دیا -"[۱۶]

اس غور و فکر اور مطالعے کا نتیجہ وہ بہت سے مضامین ہیں جو ۱۹۵۰ء اور اس کے بعد سے وقتاً فوقتاً اقبال کے فکر و فن کے

---

۱۶ - رفیع الدین ہاشمی سے وقار عظیم صاحب کی گفتگو ، بمقام لاہور ، یکم اپریل ۱۹۷۳ء -

بارے میں وقار عظیم صاحب کے قلم سے نکلے اور جن میں سے درج ذیل سترہ مضامین دیگر احباب اور عزیزوں کے منجملہ میری پیہم فرمائش اور بار بار کی گزارش[۱۷] پر وقار عظیم صاحب نے ۱۹۶۸ء میں ''اقبال۔۔۔شاعر اور فلسفی'' کے نام سے کتابی صورت میں شائع کیے :

۱ - اقبال کی شاعری کا پہلا دور — ادبِ لطیف ، لاہور ، مئی ۱۹۵۰ء

۲ - اقبال کا نظریۂ فن — ماہِ نو ، کراچی ، اپریل ۱۹۵۲ء

۳ - اقبال کی نظموں میں رنگ تغزل اقبال ، لاہور ، اپریل ۱۹۵۳ء

۴ - اقبال کی شاعری کا ایک کردار ماہِ نو ، کراچی ،جون ۱۹۵۳ء

۵ - اقبال کی بعض نظموں کا لہجہ بیانیوں ، لاہور ، اپریل ۱۹۵۴ء

۶ - اقبال کا مردِ مومن — استقلال لاہور ۱۵ اپریل ۱۹۵۹ء

۷ - اقبال کی اردو غزل — ادبی دنیا ، لاہور دور پنجم ، شمارہ اول ، ۱۹۵۹ء ۱۹۶۰ء

۸ - اقبال کی دو نظمیں اور عظمتِ آدم امروز ، لاہور ۲۳ مارچ ۱۹۶۰ء

۹ - اقبال اور آزادی فکر و عمل — استقلال ، لاہور ، جون ۱۹۶۱ء

۱۰ - اقبال کی شاعری میں ڈرامائی عناصر — لیل و نہار ، لاہور ، ۲۲ اپریل ۱۹۶۲ء

---

۱۷ - ''ان مضامین کو یک جا کرنا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ حبیبی ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی ، عزیزی سید معین الرحمٰن اور اختر وقار سلمہ کی پیہم مساعی نے میری اس کوتاہی کی تلافی کی اور بکھرے ہوئے مضامین کو جمع کر کے اس قابل بنایا کہ وہ کتابی صورت اختیار کر سکیں۔''

(سید وقار عظیم ، اقبال—شاعر اور فلسفی پیش لفظ : ۲)

۱۱ - اقبال---شاعر یا فلسفی استقلال ، لاہور ، جون ۱۹۶۳ء

۱۲ - اقبال کی نظم ''تسخیرِ فطرت'' استقلال ، لاہور ، اگست ۱۹۶۳ء

۱۳ - اقبال---حضورِ باری میں اقبال ریویو ، کراچی ، جنوری مارچ ۱۹۶۴ء

۱۴ - اقبال کی پسندیدہ بحریں سالنامہ ادبِ لطیف ، لاہور ، اگست ۱۹۶۴ء

۱۵ - ''خودی'' تشبیہوں کے آئینے میں اقبال، لاہور ، اکتوبر ۱۹۶۸ء

۱۶ - غمِ فرہاد و عشرتِ پرویز فنون ، لاہور ، جولائی ، اگست ۱۹۶۶ء

۱۷ - اقبال کا ایک مرثیہ تحریر ۱۹۵۵ء نظرثانی ۱۹۶۸ء

''اس مجموعے کے مضامین، میں میں نے جو کچھ کہا ہے ، اس کی تحریک کا سبب میرے وہ صدہا شاگرد ہیں جنھیں میں آنیس سال سے اقبال پڑھا رہا ہوں - میں ان سب کا ممنون ہوں کہ انھوں نے اپنے استفسارات سے مجھے سوچ کی راہیں دکھائیں -''[۱۸]

''اب جب کہ میں اقبال کے فکر اور شعر پر لکھے ہوئے مختلف مضامین کو یک جا کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں ، مجھے صرف ایک بات عرض کرنی ہے - اقبال کو ساری دنیا فلسفی زیادہ سمجھتی ہے اور شاعر کم---لیکن میرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ گو اقبال کی حکیمانہ حیثیت بہر حال مسلم ہے ، لیکن حکیمِ فرزانہ کی حکمت کو دل نشیں اور

---

۱۸ - سید وقار عظیم ، اقبال--- شاعر اور فلسفی ، پیش لفظ : ۲ -

دل آویز ، اقبال کے مزاج کی رچی ہوئی شاعرانہ کیفیت نے بنایا ہے - اقبال کی حکمت اور اقبال کے شعر کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا - اس مجموعے کے تمام مضامین کی اساس یہی احساس ہے۔''[۱۹]

''اقبال معاصرین کی نظر میں''[۲۰] کے نام سے ڈاکٹر ایس - ایم اکرام کے ایمائے خاص پر ۱۹۷۳ء میں وقار عظیم صاحب نے دو برس کی تلاش اور جستجو کے بعد ایک ضخیم مجموعۂ مضامین میں ایسی تحریروں کو منتخب اور مرتب کیا جو علامہ اقبال کی زندگی میں لکھی گئیں اور اغلب ہے کہ آن کی نظر سے گزریں - اس کتاب کے ، کہ جسے ''مطالعۂ اقبال در حیاتِ اقبال'' کہنا چاہیے ، مندرجات و مشمولات کی تفصیل یہ ہے :

مقدمہ : پروفیسر سید وقار عظیم صفحہ ۱۱-۲۲

۱ - اقبال ، ایک پیغمبر کی حیثیت سے ، ممتاز حسن ، ہمایوں ، لاہور ، اکتوبر ۱۹۳۱ء

۲ - اقبال اور سیاستِ عالیہ ، سید زبیر ،
نیرنگِ خیال ، لاہور ، ستمبر ، اکتوبر ۱۹۳۲ء

۳ - پیامِ اقبال ، قاضی عبدالغفار
نیرنگِ خیال ، لاہور ، ستمبر ، اکتوبر ۱۹۳۲ء

۴ - اقبال پر ایک محققانہ نظر اور آن کی نفسیاتی تشریح ، راغب احسن
نیرنگِ خیال ، لاہور ، ستمبر اکتوبر ۱۹۳۲ء

---

۱۹ - سید وقار عظیم ، اقبال—شاعر اور فلسفی ، پیش لفظ : ۱ -

۲۰ - ''اقبال—معاصرین کی نظر میں'' مرتبہ : پروفیسر سید وقار عظیم
مطبوعہ : مجلسِ ترقی ادب ، لاہور ، دسمبر ۱۹۷۳ء -
سائز : ۱۸ × ۸/۲۲ صفحات : ۵۴۳ -

۵ - اقبال پر قیامِ یورپ کا اثر ، ممتاز حسن
نیرنگِ خیال ، لاہور ، ستمبر ، اکتوبر ۱۹۳۲ء

۶ - اقبال اور سیاسیات ، ڈاکٹر سید عبداللہ
ہمایوں ، لاہور ، مئی ۱۹۳۲ء

۷ - پیامِ اقبال ، رشید احمد صدیقی ، سہیل ، علی گڑھ ، جنوری ، اپریل ۱۹۲۶ء

۸ - علامہ اقبال اور فلسفۂ تصوف ، ادیب - اے آبادی ، نیرنگِ خیال ، لاہور ، ستمبر ، اکتوبر ۱۹۳۲ء

۹ - فلسفۂ اقبال ، اکرام الحق سلیم ، معارف ، اعظم گڑھ ، جنوری ۱۹۲۶ء

۱۰ - متفاول اقبال ، غلام احمد پرویز
نیرنگِ خیال ، لاہور ، ستمبر ، اکتوبر ۱۹۳۲ء

۱۱ - علامہ اقبال کی شاعری ، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم
نیرنگِ خیال ، لاہور ، ستمبر ، اکتوبر ۱۹۳۲ء

۱۲ - اقبال کی شاعری ، ڈاکٹر ملک راج آنند
نیرنگِ خیال ، لاہور ، ستمبر ، اکتوبر ۱۹۳۲ء

۱۳ - کلامِ اقبال کی ادبی خوبیاں ، محمد اکبر خاں
نیرنگِ خیال ، لاہور ، ستمبر ، اکتوبر ۱۹۳۲ء

۱۴ - ڈاکٹر اقبال کی اردو ، محمد محمود زمان خاں
معارف ، اعظم گڑھ ۱۹۲۸ء

۱۵ - مثنوی ''اسرارِ خودی'' ، اسلم جیراج پوری
الناظر ، لکھنؤ ، فروری ۱۹۱۹ء

۱۶ - ''رموزِ بے خودی'' ، سید سلیمان ندوی
معارف ، اعظم گڑھ ، اپریل ۱۹۱۸ء

۱۷ - ''رموزِ بے خودی'' ، شیخ عبدالقادر
مخزن ، لاہور ، ستمبر ۱۹۱۸ء

۱۸ - اقبال کی مثنویاں ، ڈاکٹر عبد الرحمن بجنوری مترجم :
شیخ محمد اکرام ، ہمایوں ، لاہور ، نومبر ۱۹۳۰ء

۱۹ - ''پیامِ مشرق'' ، اسلم جیراج پوری
نوشتہ ۱۹۲۳ء ، مشمولہ ''نوادرات''

۲۰ - ''جاوید نامہ'' ، اسلم جیراج پوری
نوشتہ ۱۹۳۲ء ، مشمولہ ''نوادرات''

۲۱ - ''ضربِ کلیم'' ، اسلم جیراج پوری
نوشتہ ۱۹۳۷ء ، مشمولہ ''نوادرات''

حواشی : پروفیسر سید وقار عظیم صفحہ ۴۳۳-۵۰۳

اشاریہ : ڈاکٹر سید معین الرحمٰن صفحہ ۵۰۵-۵۳۳

''یہ کتاب اقبال کے فکر و فن اور بعض صورتوں میں اقبال کی شخصیت سے متعلق ایسے مضامین کا مجموعہ ہے جو معاصرینِ اقبال نے اُن کی زندگی میں لکھے - ایسے قرائن موجود ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ ان مضامین میں سے اکثر اقبال کے مطالعے میں آئے اور ان میں سے بعض کے متعلق انھوں نے اپنے خیالات بھی ظاہر کیے ، کبھی تحسین و تشکر کی صورت میں اور کبھی تردید و توضیح کے انداز میں - اقبال نے دوسروں کی کہی ہوئی باتوں کی تردید اور

توضیح میں جو مضامین اور جو خطوط لکھے ، وہ آن کے فکر و فن کے طالب علم کے لیے ایک بیش بہا خزانے کی حیثیت رکھتے ہیں ۔"[۲۱]

کتاب کے آخر میں موجود اپنے قیمتی حواشی میں وقار عظیم صاحب نے منجملہ اُمور و مطالبِ دیگر ، اس "بیش بہا خزانے" سے بھرپور فائدہ آٹھایا ہے ۔ یہ "حواشی" اقبالیات پر وقار عظیم صاحب کی گہری اور غائر نظر کا انعام اور حاصل ہیں ۔ وقار عظیم صاحب کے ان توضیحی حواشی کی روشنی میں ، ان مضامین سے استفادے کا دائرہ بہت بڑھ جاتا ہے اور ان سے اقبال کے متعلق بہت سی باتوں کے سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے ۔ یہ "حواشی" بجائے خود ایک عینی معیار ہیں کہ اقبال اور متعلقات اقبال کی توضیحات کی سطح کیا ہونی چاہیے اور اقبال سے متعلق کتابوں کو کس طرح مرتب کیا جانا چاہیے ۔

بحیثیتِ مجموعی پروفیسر سید وقار عظیم کے مرتبہ "امن مجموعے کے مضامین کے مطالعے سے وہ سب تنقیدی رویے ہمارے سامنے آتے ہیں جو اقبال کے معاصرین نے فکرِ اقبال اور شعر اقبال کے متعلق اختیار کیے تھے اور جن کی بنا پر ایک خاص طرح کی تنقید وجود میں آئی تھی ۔"[۲۲]

"اقبال کے پیغام کو مشرق کے گوشے گوشے اور دنیائے اسلام کے قریے قریے میں عام کر کے انسان کے خوف ، نا اُمیدی اور بے یقینی کو دور کرنے اور اُس کی خود اعتمادی کو بحال کرنے میں جو مدد ملے گی ، اُس کی طرف اس

---

۲۱ ۔ سید وقار عظیم ، اقبال—معاصرین کی نظر میں ، مقدمہ : ۱۱ ۔

۲۲ ۔ سید وقار عظیم : اقبال ، معاصرین کی نظر میں ، ۱۹۷۳ء ، مقدمہ : ۲۳ ۔

مجموعے کے مضامین میں بڑے واضح اشارے موجود ہیں۔"[۲۳]
وقار عظیم صاحب نے بالکل ٹھیک کہا ہے کہ :

"میرے نزدیک ان مضامین کو مرتب کر کے منظرِ عام پر لانے کا یہی جواز کافی ہے۔"[۲۴]

(۵)

رفیع الدین ہاشمی کے ایک سوال کے جواب میں یکم اپریل ۱۹۷۳ء کو وقار عظیم صاحب نے اس عزم کا اظہار کیا تھا کہ :

"میرے ذہن میں اقبال کے بعض ایسے موضوعات ہیں جن پر کچھ لکھنے کو جی چاہتا ہے - میں اس انداز میں لکھنا چاہتا ہوں کہ بات طلباء کی سمجھ میں بھی آ جائے ، کیونکہ اپنے تدریسی تجربے کی بنا پر میرا احساس یہ ہے کہ بعض مقامات ایسے ہیں جہاں اقبال کے طلباء کو اُلجھن ہوتی ہے - میں یہ چاہتا ہوں کہ طلباء کی ایسی اُلجھنیں دور کرنے کے لیے کچھ لکھ سکوں تو یہ بڑا مفید کام ہوگا - مگر ابھی فرصت میسر نہیں آ رہی ، ذرا یکسوئی نصیب ہو تو اس طرح کے کم از کم چار پانچ مضمون لکھوں گا۔"[۲۵]

دوسری علمی اور تصنیفی و تہذیبی مصروفیات کے بشمول ۱۹۷۳ء کا سارا سال "اقبال—معاصرین کی نظر میں" کی ترتیب و تدوین کی نذر ہوا -

۲۰ جنوری ۱۹۷۵ء کو سینٹرل پروڈکشن یونٹ ، ریڈیو

---

۲۳ - سید وقار عظیم ، ایضاً : ۲۳ -
۲۴ - ایضاً ، ۲۴ -
۲۵ - سید وقار عظیم سے ایک انٹرویو ، لاہور ، یکم اپریل ۱۹۷۳ء -

پاکستان لاہور کے لیے ایک ''لائف انٹرویو''[۲۶] میں میرے اس استفسار کے جواب میں کہ ''اقبال---شاعر اور فلسفی'' کے بعد اقبال پر کچھ مزید کی توقع بھی آپ سے رہتی ہے ، اقبال پر آپ کی کسی نئی کتاب کے سامنے آنے کا کیا امکان ہے؟ وقار عظیم صاحب نے فرمایا تھا کہ :

''اقبال---شاعر اور فلسفی'' بھی جیسا کہ آپ نے دیکھا مضامین کا مجموعہ ہے - اس کتاب کے چھپنے (۱۹۶۸ء) کے بعد بھی میں نے اقبال پر دو تین مضمون لکھے اور وہ رسالہ ''اقبال'' میں چھپے - یہ خاصے طویل ہیں - بعض موضوعات ہیں ، جو اب بھی میرے ذہن میں ہیں اور جن کاموں کی تکمیل کا گویا ارادہ رکھتا ہوں ، آن میں سے ایک یہ ہے کہ ان موضوعات پر میں مضمون لکھوں اور وہ مجھے یقین ہے کہ مقدار میں اتنے ہو جائیں گے کہ پھر شاید ایک کتاب مرتب ہو جائے۔''[۲۷]

لیکن اقبال پر یہ مضامین لکھنے کی فرصت اور مہلت آنھیں میسر نہیں آسکی -

اقبال اکیڈمی (کراچی) سے وقار عظیم صاحب کی وابستگی بڑی قدیم تھی - ۱۹۶۵ء سے وہ بزمِ اقبال (لاہور) کی مجلسِ عاملہ کے رکن بھی چلے آ رہے تھے ، ۱۹۷۴ء میں وہ اقبال اکیڈمی (کراچی) کے خازن مقرر کر دیے گئے - اکیڈمی کی کراچی سے لاہور منتقلی کی بہت سی اُلجھنوں نے بھی آن کا بڑا وقت لیا---پھر

---

۲۶ - دو گھنٹے کی بات چیت پر مشتمل اس انٹرویو کا ٹیپ ریکارڈ میرے ذاتی ذخیرۂ نوادر میں محفوظ ہے (م-ا-ر) -

۲۷ - نقوش ، لاہور ، سالنامہ جنوری ۱۹۷۷ء صفحہ ۶۱۰

حکومتِ پاکستان نے علامہ اقبال کے صد سالہ جشنِ ولادت کی تقریبات کو شایان شان طور پر منانے کے لیے وفاقی سطح پر جو نیشنل کمیٹی تشکیل دی تھی وقار عظیم صاحب اُس کی مجلس منتظمہ کے بھی رکن تھے۔ مرکزی اور صوبائی حکومت کے بہت سے علمی و ادبی اداروں اور متعدد غیر سرکاری و نیم سرکاری اداروں اور کمیٹیوں کی رکنیت اور ان کے مسائل و معاملات کی دیکھ ریکھ، مشورت، انتظامات اور اہتمامات کی ذمہداریاں، اس کے علاوہ سلسلۂ اقبال کی تقریری اور تقریباتی مصروفیات اس پر مستزاد۔غرض ایک جانِ ناتواں اور سو طلب گار!

مشتے نمونہ از خروارے، صرف آخری تین برسوں ۱۹۷۴ء---۱۹۷۶ء کی محض اقبال ہی سے متعلق وقار عظیم صاحب کی خطابی اور تقریباتی مصروفیات کی تفصیل یہاں بے محل نہیں ہوگی:

۱۹۷۴ء

۱ - میٹنگ بسلسلہ تعین تاریخِ ولادت علامہ اقبال، پاکستان کونسل، لاہور، ۱۹ جنوری ۱۹۷۴ء

۲ - میٹنگ بسلسلہ تعین تاریخِ ولادت علامہ اقبال، بزم اقبال، لاہور، ۲۵ جنوری ۱۹۷۴ء

۳ - میٹنگ بسلسلہ تعین تاریخِ ولادت علامہ اقبال، کمیٹی روم پلاننگ اینڈ ڈیولپمنٹ، پنجاب سول سیکریٹریٹ، لاہور، یکم فروری ۱۹۷۴ء

۴ - یوم اقبال، گورنمنٹ سائنس کالج، لاہور ۱۰ اپریل ۱۹۷۴ء

۵ - اقبال کی شاعری، ٹی - وی ریکارڈنگ، لاہور ۱۹ اپریل ۱۹۷۴ء

۶ - کلامِ اقبال کے ترجمے ، ریڈیو ریکارڈنگ ، لاہور ۲۲ اپریل ۱۹۷۴ء

۷ - خودی ــ بحر بے کنار! ، ریڈیو ریکارڈنگ ، لاہور ۲۳ اپریل ۱۹۷۴ء

۸ - اقبال اور انسانِ کامل ، ٹی - وی ریکارڈنگ ، لاہور ۸ نومبر ۱۹۷۴ء

۹ - یومِ اقبال ، گورنمنٹ سائنس کالج ، لاہور ۱۴ نومبر ۱۹۷۴ء

۱۰ - اقبال لیکچر ، ہوم اکنامکس کالج ، لاہور ، ۱۵ نومبر ۱۹۷۴ء

۱۹۷۵ء

۱ - ''اقبال کی شخصیت اور شاعری'' کی تعارفی تقریب کا اہتمام اور خطاب ، سینٹ ہال ، لاہور ۱۱ فروری ۱۹۷۵ء

۲ - مجلس منتظمہ ، اقبال اکادمی ، کراچی ۲۰ فروری ۱۹۷۵ء

۳ - اقبال اور عشقِ رسول ، ٹی وی ریکارڈنگ ، لاہور ۲۶ مارچ ۱۹۷۵ء

۴ - اقبال اور عورت ، ریڈیو ریکارڈنگ ، لاہور ۱۸ اپریل ۱۹۷۵ء

۵ - بچوں کے اقبال ، ریڈیو ریکارڈنگ ، لاہور ۱۹ اپریل ۱۹۷۵ء

۶ - مقالہ یومِ اقبال ، اقبال اکادمی ، کراچی ۲۱ اپریل ۱۹۷۵ء

۷ - مجلسِ منتظمہ ، اقبال اکادمی ، کراچی ۲۲ اپریل ۱۹۷۵ء

۸ - یومِ اقبال پاکستان نیشنل سینٹر ، لاہور ۱۹ اپریل ۱۹۷۵ء

۹ - صدارتی خطبہ ''اقبال اور عصرِ جدید'' بزمِ ادب دیال سنگھ کالج ، لاہور ۲۹ مئی ۱۹۷۵ء

۱۰ - ''اقبال کی شخصیت اور شاعری'' ٹی وی ریکارڈنگ ۱۷ جون ۱۹۷۵ء

۱۱ - مجلسِ منتظمہ ، اقبال اکادمی ، کراچی ، ۵ جولائی ۱۹۷۵ء

۱۲ - مجلسِ منتظمہ ، صد سالہ جشنِ اقبال ، اسلام آباد ۱۴ جولائی ۱۹۷۵ء

۱۹۷۶ء

۱ - مجلسِ مشاورت ، اقبال اکادمی ، لاہور ، ۲۶ جنوری ۱۹۷۶ء

۲ - قائد اعظم اور اقبال ، تقریب اقبال اکادمی ، لاہور ، ۲۸ فروری ۱۹۷۶ء

۳ - چائے ، اقبال اکادمی ، لاہور ، ۵ مارچ ۱۹۷۶ء

۴ - استقبال ایرانی وفد ، مزارِ اقبال ، لاہور ، ۲۹ مارچ ۱۹۷۶ء

۵ - مجلس منتظمہ صد سالہ جشنِ اقبال ، اسلام آباد ، ۲۶ اپریل ۱۹۷۶ء

۶ - یومِ اقبال ، گورنمنٹ کالج ، باغبانپورہ ، لاہور ، ۲۱ اپریل ۱۹۷۶ء

۷ - مجلسِ مشاورت ، اقبال اکادمی ، لاہور ، ۱۹ مئی ۱۹۷۶ء

۸ - مجلسِ مشاورت ، اقبال اکادمی ، لاہور ، ۲۴ مئی ۱۹۷۶ء

۹ - مجلسِ منتظمہ ، اقبال اکادمی ، لاہور ، ۲۹ مئی ۱۹۷۶ء

۱۰ - مجلسِ مشاورت ، اقبال اکادمی ، لاہور ۱۸ ستمبر ۱۹۷۶ء

۱۱ - ''قائد اعظم اور علامہ اقبال کے سیاسی نظریات''

(ا) ٹی وی ریکارڈنگ ، لاہور ۶ اکتوبر ۱۹۷۶ء

(ب) ٹی وی ریکارڈنگ ، لاہور ۲۷ اکتوبر ۱۹۷۶ء

۱۲ - تعارفی تقریب ''اقبال اور انجمن حمایتِ اسلام'' آڈی ٹوریم ، لاہور ۷ نومبر ۱۹۷۶ء

۱۳ - خطبہ استقبالیہ[۲۸]، یومِ اقبال ، اقبال اکادمی ، لاہور ۹ نومبر ۱۹۷۶ء -

اپنی ان نوع بہ نوع مصروفیات کے باعث ، اقبال پر جن نئے مضامین کا خاکہ وقار عظیم صاحب کے ذہن میں تھا اور جو بالیقین اقبال کے متعلمین کی بہت سی اُلجھنوں کو رفع کرنے کا باعث ہوتے ، منصۂ شہود پر نہ آ سکے - یہاں تک کہ سالِ گذشتہ ۱۷ نومبر ۱۹۷۶ء کو وہ ناگہاں اللہ کو پیارے ہوگئے—اس عقب میں اب زیرِ نظر کتاب ''اقبالیات کا مطالعہ'' تلاش و ترتیب اور تدوین و طباعت کے مراحل سے گزر کر اہلِ شوق کے ہاتھوں میں ہے -

(٦)

اقبال پر وقار عظیم صاحب کا یہ مجموعۂ مضامین خود اُن کے ہاتھوں یا اُن کی رہنمائی میں ترتیب و تشکیل پاتا تو اس کی صورت یقین ہے کہ بہت مختلف اور بہتر ہوتی—بصورتِ موجودہ میں ''اقبالیات کا مطالعہ'' کے نام سے وقار عظیم صاحب کی غیر مرتب اور غیر مطبوعہ تحریروں پر مشتمل جو مجموعہ پیش کرنے کی عزت اور سعادت حاصل کر رہا ہوں اس کے مندرجات کی تفصیل اور ترتیب یہ ہے :

---

۲۸ - گورنر پنجاب اس تقریب کے مہمانِ خصوصی تھے ، وقار عظیم کو خیر مقدمی خطاب کرنا تھا ، لیکن وہ اپنی علالت کے باعث اس تقریب میں شریک نہیں ہو سکے اور ایک ہفتے کے بعد خالقِ حقیقی سے جا ملے -

مقالات

۱ - اقبال اور نژادِ نو، سہ ماہی اقبال، لاہور، اکتوبر ۱۹۷۱ء

۲ - تلاشِ عزلت اور احساس تنہائی، سہ ماہی اقبال، لاہور، اپریل ۱۹۷۲ء

۳ - طلسمِ گنجینۂ معنی، سہ ماہی اقبال ریویو، کراچی، جولائی ۱۹۷۵ء

جائزے

۱ - اقبالیات کے پانچ سال : ۱۹۳۷ء—۱۹۴۱ء غیر مطبوعہ ریڈیائی تبصرہ، دہلی ۲ نومبر ۱۹۴۱ء

۲ - اقبال کی شاعری کے ادوار، غیر مطبوعہ : تحریر، اکتوبر نومبر ۱۹۷۶ء

۳ - اقبال کی اردو اور فارسی غزل، غیر مطبوعہ : تحریر، اکتوبر نومبر ۱۹۷۶ء

۴ - اقبال کی فطرت نگاری اور ان کا فلسفۂ جمال، غیر مطبوعہ : تحریر، اکتوبر نومبر ۱۹۷۶ء

۵ - پیغامِ اقبال کی آفاقیت، غیر مطبوعہ : تحریر، اکتوبر نومبر ۱۹۷۶ء

۶ - اقبال کا نظریۂ وطنیت، غیر مطبوعہ : تحریر، اکتوبر نومبر ۱۹۷۶ء

۷ - اقبال اور اشتراکیت، غیر مطبوعہ : تحریر، اکتوبر نومبر ۱۹۷۶ء

متفرقات

۱ - اقبال ، خطوں کی روشنی میں ریڈیائی تبصرہ ، مطبوعہ اوراق ، لاہور ، جنوری ۱۹۶۷ء

۲ - خودی ــ بحرِ بے کنار ، ریڈیائی فیچر ، غیر مطبوعہ ، ۲۳ اپریل ۱۹۷۴ء

۳ - اقبال ــ حقیقت شناس ، ریڈیائی فیچر ، غیر مطبوعہ

۴ - اقبال اور عشقِ رسول ، ٹی وی فیچر ، ۲۶ مارچ ۱۹۷۵ء

۵ - غزل گو اقبال ، ٹی وی فیچر : ۱۲ نومبر ۱۹۷۵ء ۹ نومبر ۱۹۷۶ء

اضافات

۱ - ''اقبال کی شخصیت اور شاعری'' پر ایک نظر تقریر : ۱۱ فروری ۱۹۷۵ء

۲ - اقبال اور سوزِ غمِ ملت ، امروز ، لاہور فروری ۱۹۷۴ء

۳ - انیس اور اقبال ، ماہِ نو ، کراچی ، انیس نمبر ۱۹۷۲ء

۴ - شذرات : متعلق بہ اقبال ، ۱۹۵۰ء—۱۹۷۶ء

۵ - المعارف ، لاہور ، اپریل ۱۹۷۰ء

۶ - IQBAL : Poet and Philosopher سول اینڈ ملٹری گزٹ ، لاہور ۲۷ مئی ۱۹۶۲ء

ابتداً کتاب کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا - کتاب کا بیشتر حصہ چھپ چکا تھا کہ اقبال سے متعلق وقار عظیم صاحب کی بعض اور نگارشات دسترس میں آئیں - انھیں کتاب کے متعلقہ حصوں میں کھپانے کا وقت نکل چکا تھا ، اس لیے ''اضافات'' کا

عنوان قائم کر کے انھیں آخرِ کتاب میں یک جا کر دیا گیا ہے۔

بصورتِ موجودہ کتاب کا حصۂ اول تین سیرِ حاصل اور جامع ''مقالات'' پر مبنی ہے۔ یہ وہ مقالات ہیں جو ''اقبال۔شاعر اور فلسفی'' کی اشاعت (۱۹۶۸ء) کے بعد وقار عظیم صاحب نے جم کر لکھے اور کتاب خود وقار عظیم صاحب کے ہاتھوں مرتب ہوتی تو بھی یہی اس کی بنیاد بنتے :

''اقبال۔۔شاعر اور فلسفی''۔ . . کے چھپنے کے بعد. . . . میں نے اقبال پر دو تین مضمون لکھے . . . یہ خاصے طویل ہیں۔ بعض موضوعات اب بھی ذہن میں ہیں . . پھر شائد (اقبال پر میرے مضامین کی ایک نئی) کتاب مرتب ہو جائے۔''[۲۹]

کتاب کے دوسرے حصے ''جائزے'' کے تحت سات مضامین ہیں اور یہ سب کے سب غیر مطبوعہ ہیں اور پہلی بار سامنے آ رہے ہیں۔ پہلا مضمون آل انڈیا ریڈیو، دہلی کا ایک نشریہ ہے۔ ۲ نومبر ۱۹۴۱ء کی یہ نگارش اقبال کے بارے میں وقار عظیم صاحب کی قدیم ترین دستیاب تحریر ہے۔ اس حصۂ کتاب کے باقی چھ جائزے وقار عظیم صاحب کے آخری ایام کی یادگار ہیں اور ان کا باعثِ تحریر کچھ تفصیل چاہتا ہے۔

۱۹۵۵ء میں قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی کی کتاب ''اقبالیات کا تنقیدی جائزہ'' شائع ہوئی۔[۳۰] مطالعۂ اقبال کے لیے سہولت بہم پہنچانے کے لیے یہ اپنی نوع کی پہلی کوشش تھی، لیکن یہ جائزہ کسی باقاعدہ منصوبے یا خاکے کے بغیر، قلم برداشتہ گھسیٹ دیا گیا تھا :

---

۲۹ - سید وقار عظیم، نقوش، لاہور، سالنامہ جنوری ۱۹۷۷ء، صفحہ ۶۱۰۔

۳۰ - طبع اول : اقبال اکادمی، کراچی، ۱۹۵۵ء۔

''یہ مقالہ لکھنا شروع کیا تو خیال تھا کہ بیس پچیس صفحوں میں ختم ہو جائے گا ، مگر جوں جوں آگے بڑھتا گیا ، یہ بجائے سمٹنے کے اور پھیلتا چلا گیا ۔ یہاں تک کہ کتابی صورت میں اس کو ترتیب دینا پڑا ۔''[۳۱]

یہ جائزہ مرتب کرتے ہوئے قاضی صاحب کو بے خلل فرصت ، یکسوئی اور توجہ کے لمحات بھی میسر نہیں تھے :

''کثرتِ اشغال اور انتہائی مصروفیات میں اس کام کا آغاز ہوا اور آخر وقت تک انہی مصروفیتوں میں، یہ انجام کو پہنچا ۔''[۳۲]

بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی---پیہم مصروفیت اور بڑی عجلت میں لکھے گئے اس جائزے کی اشاعت بھی بے حد تعجیل میں ہوئی :

''اس مقالے کی طباعت صرف چند دنوں اور راتوں کی محنتِ شاقہ کا نتیجہ ہے ۔ ۔ ۔ صرف چار دن کے اندر دو سو صفحوں کی کتاب کا تمام مراحل طے کر کے پریس سے نکل آنا ایک اعجاز سے کم نہیں ۔''[۳۳]

اس رواروی کا جو قدرتی نتیجہ ہونا چاہیے تھا ، قاضی صاحب کو خود اس کا احساس تھا :

(۱) تنگی وقت کے سبب اس مقالے کو حسبِ منشا ترتیب نہ دے سکا ۔

---

۳۱ ۔ قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی ؛ اقبالیات کا تنقیدی جائزہ ، گزارش : ز ۔

۳۲ ۔ ایضاً ۔

۳۳ ۔ ایضاً گزارش : ہ ۔

(ب) طباعت عجلت میں ہوئی ہے ، اس وجہ سے کافی غلطیاں رہ گئی ہیں ۔[۳۴]

افسوس کہ قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی کو اس کتاب پر نظرِ ثانی کا موقع نہ ملا اور ۱۹۵۵ء ہی میں وہ انتقال فرما گئے۔

حکومتِ پاکستان نے علامہ اقبال کے صد سالہ جشن کا اہتمام و انصرام کرنے کے لیے وفاقی سطح پر جو نیشنل کمیٹی تشکیل دی تھی اس کی مجلس منتظمہ کے پہلے اجلاس منعقدہ اسلام آباد میں وفاقی وزیر برائے مذہبی امور مولانا کوثر نیازی کے زیرِ صدارت ۱۴ جولائی ۱۹۷۵ء کو یہ فیصلہ کیا گیا کہ قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی مرحوم کی کتاب ''اقبالیات کا تنقیدی جائزہ'' کا اضافہ و ترمیم شدہ ایڈیشن مرتب کرنے کے لیے پروفیسر سید وقار عظیم صاحب سے درخواست کی جائے ۔

۱۱ ستمبر ۱۹۷۵ء کے ایک مراسلے کے ذریعے وقار عظیم صاحب نے علمی خیراندیشی کے طور پر اس تفویض کردہ خدمت کو بسر و چشم قبول کرنے پر آمادگی ظاہر کی ۔ اس منصوبے پر کام شروع کر دینے کے بعد انھیں احساس ہوا کہ اس موضوع پر خود اپنے تیار کردہ خاکے کے مطابق آزادانہ کام کرنا زیادہ سہل اور مفید ہوتا ، لیکن کہ وہ اس کام کو انجام دینے کی ذمہ داری قبول کر چکے تھے ، انھوں نے قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی کے ہی چھیڑے اور چھوڑے ہوئے تشنہ مباحث پر تازہ تحقیقات اور تنقیدات کی روشنی میں ترمیم و اضافے کا عمل شروع کر دیا ۔

زیرِ نظر کتاب کے دوسرے حصے میں ''جائزے'' کے تحت شامل آخری چھ نگارشات اسی سلسلے کی ایک کڑی ہیں ۔

---

۳۴ ۔ ایضاً ۔

قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی کی کتاب کے ترمیم و اضافہ شدہ ایڈیشن کے لیے وقار عظیم صاحب نے انھیں اکتوبر نومبر ۱۹۷۶ء میں تحریر کیا ۔ وہ اس کتاب کے سلسلے کا ایک دفتر کا دفتر اپنی آخری علالت کے ایام میں تکمیل کی غرض سے اپنے ہمراہ ہسپتال بھی لیتے گئے تھے ، لیکن اے بسا آرزو کہ خاک شدہ! اس کی تکمیل شائد خدا کو منظور نہ تھی—اُن کی ناگہاں علالت اور رحلت کے باعث یہ کارِ ضروری ناتمام رہ گیا ۔

''متفرقات'' کے تحت پیشِ نظر کتاب کے تیسرے حصے میں سلسلۂ اقبال کے تین بصری اور تین صوتی فیچرز محفوظ کیے جا رہے ہیں ۔ یہ تحریریں اس پر دال ہیں کہ وقار عظیم صاحب ریڈیو اور ٹی وی کی مخصوص تکنیکی ضرورتوں کے کیسے صحیح اندازہ شناس تھے ۔

کتاب کے آخری حصے ''اضافات'' کی پہلی تحریر دراصل پروفیسر حمید احمد خاں کی کتاب ''اقبال کی شخصیت اور شاعری''[۳۵] پر وقار عظیم صاحب کا ایک مختصر تأثر ہے جس کا اظہار اُنھوں نے کتاب کی تعارفی تقریب کے موقع پر کیا ۔ یہ تقریب پنجاب کے وزیر اعلیٰ (محمد حنیف رامے) کے زیرِ صدارت ۱۱ فروری ۱۹۷۵ء کو سینٹ ہال (پنجاب یونیورسٹی) لاہور میں منعقد ہوئی ۔ اس تقریر کا ٹیپ سعید احمد خاں صاحب کے ذخیرے سے میسر آیا اور کاغذ پر اس کی منتقلی کا مشکل مرحلہ عزیزی اظہر وقار کی توجہ سے آسان ہوا ۔

''اقبال کی شخصیت اور شاعری'' پر ایک نظر—کو ابتدائی منصوبے کے مطابق کتاب کے دوسرے حصے میں جانا چاہیے تھا ۔

---

۳۵ - مطبوعہ : بزمِ اقبال ، لاہور ، ۱۹۷۴ء ۔

''اقبال اور سوزِ غمِ ملت'' نیز ''انیس اور اقبال'' اور ''عقل و دل__ اقبال کی نظر میں'' کو مقالات کے تحت رکھا جا سکتا تھا ۔ ''شذرات__ متعلق بہ اقبال'' اور ایک مختصر سا انگریزی مضمون ، ''متفرقات'' کے تحت آ سکتا تھا ، لیکن کہ یہ مواد دیر گئے فراہم ہوا ، اسے ایک اضافی حصے کے طور پر کتاب کے آخر میں پیش کیا جا رہا ہے ۔

''شذرات__متعلق بہ اقبال'' کے بارے میں یہاں کچھ کہنا شاید بے محل نہ ہو ۔ یہ اقبال پر وقار عظیم صاحب کی کوئی مستقل تحریر نہیں اقبال یا اقبالیات کے بارے میں بعض استفسارات کا جواب دیتے ہوئے یا اقبال سے قطع نظر ، اپنے دوسرے ادبی اور تنقیدی مقالات میں ضمناً وقار عظیم صاحب نے اقبال کے بارے میں اگر کہیں اظہارِ خیال کیا ہے تو اسے بقیدِ حوالہ اقتباس کر لیا گیا ہے ۔ اس کام کی بجا آوری میں وقار عظیم صاحب کی ساری تحریریں لازماً پیشِ نظر نہیں رہیں ، اس لیے ان متفرق تراشوں میں اضافے کی گنجائش سے انکار نہیں کیا جا سکتا ۔

اقبال یا اقبالیات کے سلسلے میں یہ آراء اگرچہ ضمناً ظاہر کی گئی ہیں لیکن ان پر وقار عظیم صاحب کی مانوس خوش بیانی اور منطقی خوش استدلالی کی مخصوص چھاپ ہر جگہ صاف دکھائی دیتی ہے ، بعض صورتوں میں ان ''شذرات'' سے اقبال اور اقبالیات سے متعلق وقار عظیم صاحب کے نقطۂ نظر پر روشنی پڑتی ہے یا اس کے آئینے میں اقبال پر کام کرنے کی نئی راہیں مستنیر ہوتی ہیں ، اس بنا پر یقین ہے کہ ان کا مطالعہ فائدے سے خالی نہیں ہوگا اور اس کوشش کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا ۔

''اقبالیات کا مطالعہ'' میں جسے غالب کی زبان میں میوۂ چیدہ در سبد ، یا بچا کھچا ٹوکری بھر پھل کہنا چاہیے جو

فصل ختم ہونے پر درختوں پر رہ جاتا ہے ، بیشتر وہ چیزیں شامل ہیں جو اقبال پر وقار عظیم صاحب کے پہلے مجموعہ' مضامین ''اقبال۔ شاعر اور فلسفی'' کے بعد لکھی گئیں اور یا ایک آدھ ایسی تحریر بھی جو اگرچہ پہلے کی ہے لیکن پہلے مجموعے سے خارج تھی -

وقار عظیم صاحب اب ہمارے درمیان موجود نہیں ، لیکن اُن کی تحریروں کی مہک اور اُن کا حسن اور فیضان دائمی ہے جسے زوال نہیں - اسی احساس کے ساتھ اُن کی پہلی برسی (۱۷ نومبر ۱۹۷۷ء) اور ولادتِ اقبال کی صد سالہ تقریب (۹ نومبر ۱۹۷۷ء) کی مناسبت سے وقار عظیم صاحب کی نگارشات کا یہ مجموعہ بصد خلوص مرتب کیا گیا ہے ، اور اس تحفہ' بے بہا کو اُن کے قدر شناسوں کی خدمت میں بہ صد ہزار محبت پیش کیا جا رہا ہے -

اقبال ہال ،
شعبہ' اردو ، گورنمنٹ کالج ،
فیصل آباد

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن
۹ ستمبر ۱۹۷۷ء

مقالات

۱ - اقبال اور نژادِ نو

۲ - تلاشِ عزلت اور احساسِ تنہائی

۳ - طلسمِ گنجینۂ معنی

اقبال اور نژادِ نو

عہد حاضر کے حوالے سے اقبال کی شاعری پر نظر ڈالنے والے جانتے ہیں کہ انھوں نے اپنے عہد کے سیاسی و معاشرتی رجحانات اور فکری و جذباتی میلانات کا مشاہدہ اور مطالعہ بڑی غائر نظر سے کیا اور ان رجحانات و میلانات کا تجزیہ کرتے ہوئے ایک طرف تو ماضی کی تاریخی روایت پر نظر رکھی ، جس کا انعکاس لازماً حال کی زندگی میں بھی ہوتا ہے اور دوسری طرف عہد حاضر کے انسان پر جس کے مزاج کی تشکیل و تعمیر انھیں رجحانات و میلانات کے زیر سایہ ہوئی ہے - اس ہمہ گیر اور ہمہ جہت مشاہدے ، مطالعے اور تجزیے نے زوال آدم کا جو نقشہ آنکھوں کو دکھایا وہ حد درجہ تشویش‌ناک اور اضطراب انگیز تھا - اسی تشویش و اضطراب کا نتیجہ آن کا وہ حکیمانہ پیغام ہے جسے ہم اقبال کا فلسفۂ خودی کہتے ہیں - یہ فلسفہ انسان کے لیے انکشافِ ذات کا فلسفہ ہے کہ جس نے ایک بار پھر اسے خود جوئی اور خود نگری کی لذت سے آشنا کیا اور ایک بار پھر وہ خود آگہی اور خود شناسی کے اسرار و رموز کا ادراک کرنے کے قابل ہو سکا - اس فلسفے نے انسان کے قلب و نگاہ پر پڑے ہوئے وہ سب پردے ایک ایک کر کے اٹھائے جنھوں نے انسان کو خود اس کی نظروں سے پوشیدہ کر دیا تھا - اس کی ذات خود اپنے لیے معما بن کر رہ گئی تھی اور اس کا اپنا وجود اپنے وجود کی نفی کر رہا تھا - اقبال کی حکیمانہ تشخیص نے انسان کی اس سلبی و منفی کیفیت کو نفیٔ خودی

کا مرض کہا اور اس کے اسباب و عوامل کا تجزیہ کر کے اس کے علاج تجویز کیے ۔

اقبال کی پوری شاعری یا شاید یہ کہنا زیادہ صحیح ہو گا کہ اس کی یورپ سے واپسی کے بعد کی شاعری ایک طرف تو انسان کے امراض ، ان امراض کی علامات اور ان کے اسباب کی نشان دہی کا فریضہ انجام دیتی ہے اور دوسری طرف ان امراض کا استیصال کرنے اور ان سے محفوظ رہنے کی تدابیر تجویز کرتی ہے ۔ اقبال نے ان دونوں منصبوں کی ادائیگی میں جن وسیلوں سے مدد لی ہے وہ بہ یک وقت فلسفی کے وسیلے بھی ہیں اور شاعر کے بھی ۔ ان ملے جلے حکیمانہ اور شاعرانہ وسیلوں کی مدد سے اقبال نے اپنا پیغام حیات جن گروہوں تک پہنچایا ہے ان میں اس عہد کا نوجوان طبقہ جسے اقبال نے ایک خاص سیاق میں ''نژاد نو'' کہا ہے ، بطور خاص اس کا مخاطب ہے ۔

''بانگ درا'' کی نظم ''خطاب بہ جوانان اسلام'' پہلی نظم ہے جس میں اقبال نے مسلمان نوجوان کو براہ راست مخاطب کر کے اس سے اپنے دل کی بات کہی ہے ۔ نظم اس شعر سے شروع ہوتی ہے :

کبھی اے نوجواں مسلم! تدبر بھی کیا تو نے ؟
وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا ؟

''وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا'' کی تشریح و تفسیر اس کے فوراً بعد آنے والے شعروں میں ملتی ہے ، جن میں اقبال مسلمانوں کے ماضی کا ذکر ، تاریخ ، تمدن ، تہذیب اور

اخلاق کی دنیا میں اُن کی فتوحات اور کارناموں کے حوالے سے کرتے ہیں - وہ مسلمان جنھوں نے تاج سر دارا کو اپنے پاؤں میں کچل ڈالا ، وہ مسلمان جن کی شان امارت میں ''الفقر فخری'' کا سماں تھا ، جو گدائی میں بھی اتنے غیور تھے کہ منعم کو اُن کے سامنے دست کرم دراز کرنے کا یارا نہ تھا ؛ جہاں گیری ، جہاں داری ، جہاں بانی اور جہاں آرائی اُن کے حسن عمل کے ادنٰی کرشمے تھے ؛ وہی تھے کہ جنھوں نے آئین جہاں‌داری کی تخلیق کی اور وہی تھے کہ اُن کی آغوش آداب تمدن کی پرورش کا گہوارہ بنی - یہ سب کچھ کہہ کر اقبال نوجوان سے مخاطب ہوتے اور اُس پر ماضی و حال کا فرق یوں واضح کرتے ہیں :

تجھے آبا سے اپنے کوئی نسبت ہو نہیں سکتی
کہ تو گفتار ، وہ کردار ؛ تو ثابت ، وہ سیارہ

گنوا دی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی
ثریّا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا

حکومت کا تو کیا رونا کہ وہ اک عارضی شے تھی
نہیں دنیا کے آئینِ مسلم سے کوئی چارہ

مگر وہ علم کے موتی ، کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں اُن کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارہ

اپنے عہد کے نوجوان مسلمانوں میں اقبال کو جو خامیاں نظر آئی ہیں اُن میں دو سب سے نمایاں ہیں : ایک یہ کہ وہ اس

ذوق عمل سے بے بہرہ ہیں جو اُن کے اسلاف کی زندگی کی روحِ رواں تھا ، اور دوسرے اُن کے سینے علم کے اُس نور سے خالی ہیں جس سے اُن کے آبا کے دل روشن و منور تھے ۔

''کبھی اے نوجواں مسلم'' میں اقبال کا انداز تخاطب کچھ اُسی طرح کا ہے جیسا ''نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو!'' میں ۔ یہ للکار شاعر سے زیادہ واعظ اور خطیب کی للکار ہے اور بات کہنے کا اسلوب بھی شاعر کا کم اور مصلح کا زیادہ ہے ۔ یہ بات ''بانگ درا'' کی دوسری نظموں میں اپنا انداز بدلتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے اپنے منصب کی نزاکتیں محسوس کر کے اپنا پیغام نوجوانوں تک پہنچانے کے لیے شاعرانہ ، ایمائی اور تخئیلی انداز اختیار کرنا ضروری سمجھا ہے اس لیے کہ بات یوں دلکش بھی بنتی ہے اور دل نشین بھی ۔ ایک نظم کا عنوان ہے : ''فردوس میں مکالمہ'' اس سے قطعِ نظر کہ اس نظم کا مکالماتی انداز اقبال کے ایک محبوب طریق اظہار و ابلاغ کا مظہر ہے ، یعنی اقبال نے نظم میں اُسی طرح کی ایک مجلس ترتیب دی ہے جس کے زیادہ حسین و جمیل اور تخیل و تفکر کے اعتبار سے زیادہ وقیع ، مؤثر اور پر معنی مرقعے ''پیام مشرق''، ''جاوید نامہ''، ''بال جبریل'' اور ''ارمغان حجاز'' میں ملتے ہیں ۔ اس نظم میں ہماری تہذیبی روایت کی دو عظیم اور درد مند شخصیتیں ایک دوسرے سے ہمکلام ہیں اور اُن کا موضوع سخن مسلم ہندی ہے ۔ سعدی کا ذوق تجسس ان دو شعروں کا پیکر اختیار کرتا ہے :

کچھ کیفیتِ مسلمِ ہندی تو بیاں کر
واماندۂ منزل ہے کہ مصروفِ تگ و تاز ؟

مذہب کی حرارت بھی ہے کچھ اُس کی رگوں میں
تھی جس کی فلک سوز کبھی گرمیِ آواز ؟

صرف دو سوال کیے گئے ہیں : مسلم ہندی مصروفِ تگ و تاز ہے یا نہیں ؟ اور اُس کی رگوں میں مذہب کی حرارت ہے یا نہیں ؟ سعدی کے ان سوالوں نے حالی کے دل درد مند پر چوٹ لگائی اور انھوں نے رو رو کر ہندی مسلمان کی حالت ، جو حقیقت میں ہندی نوجوان کی حالت ہے ، ان الفاظ میں بیان کی :

جب پیرِ فلک نے ورق ایام کا اُلٹا
آئی یہ صدا پاؤ گے تعلیم سے اعزاز
آیا ہے مگر اُس سے عقیدوں میں تزلزل
دنیا تو ملی ، طائرِ دیں کر گیا پرواز

دیں ہو تو مقاصد میں بھی پیدا ہو بلندی
فطرت ہے جوانوں کی زمیں گیر ، زمیں تاز

جواب یہاں ختم ہو جاتا ہے ، لیکن اقبال کے مزاج شاعرانہ و حکیمانہ کی تشفی ابھی نہیں ہوئی اس لیے وہ بات سے کچھ حکیمانہ نتیجے نکالتے اور انھیں شاعرانہ انداز میں بیان کرتے ہیں :

مذہب سے ہم آہنگیِ افراد ہے باقی
دیں زخمہ ہے ، جمعیتِ ملت ہے اگر ساز

بنیاد لرز جائے جو دیوارِ چمن کی
ظاہر ہے کہ انجامِ گلستاں کا ہے آغاز

پانی نہ ملا زمزمِ ملت سے جو اس کو
پیدا ہیں نئی پود میں الحاد کے انداز

اقبال کے نزدیک نئی پود میں لادینی اور الحاد کے میلانات مذہب سے اُن کی بے تعلقی کا نتیجہ ہیں اور یہ میلان ایسا ہے جس سے ملت کی جمعیت میں خلل پڑنے کا اندیشہ ہے - شاعرانہ اسلوب کے نقطۂ نظر سے ایک اور قابل توجہ بات یہ ہے کہ اقبال نے اس اصلاحی نظم کی ساری تخئیلی اور فکری بنیاد سعدی کے اس شعر پر رکھی ہے :

خرما نتوان یافت ازان خار کہ کشتیم
دیبا نتوان بافت ازان پشم کہ رشتیم

نظم اسی شعر پر ختم ہوتی ہے - ۱۳ شعروں کی اس نظم کے ابتدائی شعر ایک لحاظ سے سعدی کے اس ایمائی شعر کی تمہید اور تضمین کی صورت اختیار کر لیتے ہیں اور یہ شعر بہ یک وقت اس ہلکے سے ڈرامائی تصور کا وہ منتہا (Climax) اور انجام بن جاتا ہے جس نے اس نظم کا پیکر اختیار کیا ہے -

مسلمانوں کی موجودہ نسل کے متعلق اقبال نے اپنی شاعری کے ہر دور میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے مذکورہ بالا دو نظموں میں ان سے صرف چند باتوں کی طرف اشارے ملتے ہیں - پہلی نظم میں گیا ہے کہ موجودہ دور کا مسلمان نوجوان صرف گفتار کا

غازی ہے اور اُس کا دل علم کی لگن سے خالی ہے ، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اُسے سیاست اور تمدن کی دنیا میں وہ مقام حاصل نہیں جس تک اس کے آبا نے رسائی حاصل کی تھی - دوسری نظم بھی نئی نسل کو واماندۂ منزل کہہ کر اُس کی بےعملی کی طرف اشارہ کر رہی ہے ، البتہ یہاں بعض اور باتیں بھی کہی گئی ہیں - موجودہ نسل کا مسلمان لادینی و الحاد کی طرف مائل ہے ، اُس کی فطرت زمیں گیر اور زمیں تاز ہے ، اُس کا ذہن مقاصد کی بلندی کے تصورات سے قطعاً نا آشنا اور خالی ہے اور یہ کہ یہ سب خرابیاں جدید تعلیم کے مضر اثرات کا نتیجہ ہیں - ''بانگ درا'' کی بعض اور نظموں میں یہی خیالات زیادہ واضح صورت اختیار کر کے ہمارے سامنے آتے ہیں ، گو اس میں شبہ نہیں کہ اُن کے اسلوب اظہار کا رنگ واعظانہ ، خطیبانہ اور مصلحانہ ہونے کے بجائے شاعرانہ اور حکیمانہ ہے - جن نظموں کا حوالہ مقصود ہے اُن میں سے ایک کا عنوان ''مذہب''[1] ہے ، دوسری کا ''تہذیب حاضر''[2] اور تیسری کا ''مسلمان اور تعلیم جدید''[3]- ان تینوں نظموں کی ایک مشترک خصوصیت یہ ہے کہ اُن میں فارسی کے کسی نہ کسی شعر کی تضمین کی گئی ہے - پہلی نظم ''مذہب'' مرزا بیدل کے اس شعر کی تضمین ہے :

با ہر کمال اندکے آشفتگی خوش است
ہر چند عقل کل شدہ‌ای بے جنون مباش[4]

---

۱ - ''بانگ درا'' طبع بست و ہفتم ، لاہور ، ۱۹۷۰ع ، ص ۲۷۷ -
۲ - ایضاً ، ص ۲۵۱ -
۳ - ایضاً ، ص ۲۷۳ -
۴ - ایضاً ، ص ۲۷۸ -

''تہذیب حاضر'' میں فیضی کے اس شعر کی تضمین ہے :

تو اے پروانہ! این گرمی ز شمعِ محفلے داری
چو من در آتشِ خود سوز اگر سوزِ دلے داری[۵]

اور ''مسلمان اور تعلیم جدید'' میں تضمین کی بنیاد ملک قمی کا یہ شعر ہے :

رفتم کہ خار از پا کشم ، محمل نہان شد از نظر
یک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ راہم دور شد[۶]

اب ذرا ان تینوں نظموں کے مطالب پر نظر ڈالیے - پہلے وہ نظم سنیے جس کا عنوان ''مذہب'' ہے :

تعلیم پیرِ فلسفۂ مغربی ہے یہ
ناداں ہیں جن کو ہستیِ غائب کی ہے تلاش

پیکر اگر نظر سے نہ ہو آشنا تو کیا
ہے شیخ بھی مثالِ برہمن صنم‌تراش

محسوس پر بنا ہے علومِ جدید کی
اس دور میں ہے شیشہ عقائد کا پاش پاش

---

۵ - ایضاً ، ص ۲۵۲ -
۶ - ایضاً ، ص ۲۷۴ -

مذہب ہے جس کا نام وہ ہے اک جنونِ خام
ہے جس سے آدمی کے تخیل کو انتعاش

کہتا مگر ہے فلسفۂ زندگی کچھ اور
مجھ پر کیا یہ مرشدِ کامل نے راز فاش

با ہر کمال اندکے آشفتگی خوش است
ہر چند عقلِ کل شدہ‌ای بےجنون مباش

اقبال نے علوم جدید اور مذہب کے باہمی تصادم کے مسئلے کو بڑے لطیف اور محتاط انداز میں ایک مؤثر شاعرانہ اکائی کی صورت دی ہے ۔ خیالات کو عقلی حیثیت سے قابل قبول بنانے کے لیے جس حد تک فکر اور منطق کا سہارا ضروری ہے اقبال نے اس حد تک اسے اپنے شاعرانہ استدلال کی بنیاد بنایا ہے لیکن فکر ، منطق اور استدلال کی ملی جلی لہریں صرف اسی حد تک حرکت میں آتی ہیں جس حد تک وہ شاعرانہ آہنگ اور اس کے زیر و بم میں خلل انداز نہ ہوں اور جس حد تک وہ اقبال کے اس بنیادی عقیدے کو تقویت پہنچاتی رہیں کہ علم کی عظمت تسلیم کرتے ہوئے بھی ہم اسے روحانیت کی فنا کا سبب نہ بننے دیں ۔ ''تہذیب حاضر'' میں تغیر کی اس کیفیت اور نئی نسل پر اس کیفیت کے اثرات کا ذکر اور زیادہ کھل کر کیا گیا ہے اور چشم بینا نے اثر کے اس دائرے کو زیادہ رخوں میں فریب کے طلسموں کو عام کرتے دیکھا ہے ۔ لیکن تہذیب حاضر کے فریبوں کا طلسم توڑنے کے لیے بات کہنے کا جو پیرایہ اختیار کیا گیا ہے اس میں ہر جگہ طنز کا ایک لطیف رنگ شامل ہے ۔ طنز کے اس لطیف رنگ کی حیثیت

ایک طرح کی ہجو ملیح کی ہے اور یہ پیرایہ تہذیب حاضر کے مزاج سے پوری مطابقت رکھتا ہے ، اس اعتبار سے کہ تہذیب حاضر اپنے چہرے پر جو طرح طرح کے پردے ڈال کر ہمیں فریب میں مبتلا رکھتی ہے اُن کی نقاب کشائی کے لیے بیان کا ایسا ہی اُسلوب ضروری ہے جو طنز و تشنیع اور ہجو و تضحیک کا منصب ادا کرنے کے باوجود اپنے دامن کو شدت و تلخی سے آلودہ نہ ہونے دے ۔ اقبال نے تہذیب حاضر کے رخ زیبا پر پڑی ہوئی اس پر فریب نقاب کو اُلٹنے کا کام کس سادگی اور پر کاری سے پورا کیا ہے اس کا اندازہ یہ مختصر لیکن جامع اور بلیغ نظم پڑھ کر کیجیے :

حرارت ہے بلا کی بادۂ تہذیبِ حاضر میں
بھڑک اُٹھا بھبوکا بن کے مسلم کا تن خاکی

کیا ذرے کو جگنو ، دے کے تابِ مستعار اس نے
کوئی دیکھے تو شوخی آفتابِ جلوہ فرما کی

نئے انداز پائے نوجوانوں کی طبیعت نے
یہ رعنائی ، یہ بیداری ، یہ آزادی ، یہ بے باکی

تغیر آگیا ایسا تدبر میں ، تخیل میں
ہنسی سمجھی گئی گلشن میں غنچوں کی جگر چاکی

کیا گم تازہ پروازوں نے اپنا آشیاں لیکن
مناظر دلکشا دکھلا گئی ساحر کی چالاکی

حیاتِ تازہ اپنے ساتھ لائی لذتیں کیا کیا
رقابت ، خودفروشی ، ناشکیبائی ، ہوسناکی

فروغِ شمعِ نو سے بزمِ مسلم جگمگا اٹھی
مگر کہتی ہے پروانوں سے میری کہنہ ادراکی

تو اے پروانہ! این گرمی ز شمعِ محفلے داری
چو من در آتشِ خود سوز اگر سوزِ دلے داری[۷]

اقبال نے تہذیب حاضر میں آفتاب جلوہ فرما کی شوخی ، اس کی پروازوں میں مناظر کی دلکشائی ، اس کی حیات تازہ میں لذتوں کی فراوانی اور اس کی شمع نو میں فروغ نور کی ارزانی کے جو جلوے دیکھے ہیں انھیں شاعر کی نظر کی سادگی و پرکاری کا کرشمہ سمجھنا چاہیے اس لیے کہ اس نے بظاہر تہذیب حاضر کی ثناخوانی کرنے کے باوجود اس کے فریبوں کی پوری پردہ دری کی ہے اور نوجوانوں کی طبیعت نے اس سے جو مضر اثر قبول کیے ہیں چن چن کر ان کی نشان دہی کی ہے۔ اس کے ''فیضان'' سے نوجوانوں کے دلوں میں آزادی اور بےباکی کی اٹھتی اور بڑھتی ہوئی لہریں ، ان کے حسن تدبر اور حسن تخیل کی زبوں حالی ، ان کے مزاجوں پر رقابت ، خود فروشی ، ناصبوری اور ہوسناکی کے اوصاف قبیحہ کا غلبہ اور ان سب سے بڑھ کر ان کی خانہ ویرانی ، تہذیب حاضر کے لائے ہوئے فتنے ہیں اور ان فتنوں کا اکیلا توڑ اور ان فتنوں کے پیدا کیے ہوئے مرض کا واحد مداوا سوز دروں ہے جس کی

---

۷ - ایضاً ، ص ص ۲۵۱-۲۵۲ -

گرمی تن خاکی کی جملہ آلائشوں کو جلا کر خاکستر کر دیتی ہے اور پروانہ گرمیِ شمع محفل کی منت کشی سے آزاد ہو جاتا ہے۔

جدید تعلیم کے ساتھ ساتھ جدید تہذیب نے نئی نسل کے آگے فریب کے جو دام بچھائے ہیں اقبال کی یہ مختصر لیکن معنی خیز نظم ملے جلے حکیمانہ اور شاعرانہ انداز میں نوجوانوں کو اُن سے آگاہ کرتی ہے اور اُن کے لیے تفکر و تدبر کی راہیں ہموار کرتی ہے تاکہ وہ مصلح اور واعظ کے سہارے کے بغیر اپنی منزل مقصود کا تعین کر سکیں۔

تیسری نظم ''مسلمان اور تعلیم جدید'' نئی تعلیم کے اثرات میں سے ایک اور مہلک اثر کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ نظم کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے:

مرشد کی یہ تعلیم تھی، اے مسلمِ شوریدہ سر
لازم ہے رہرو کے لیے دنیا میں سامانِ سفر

اس آپ بیتی کی روداد کئی مرحلوں سے گزر کر یہاں تک پہنچتی ہے کہ مرشد کے ارشاد کے مطابق سر میں تعلیم کا سودا پیدا ہوتا ہے۔ سودا کیوں پیدا ہوتا ہے اور اس کا انجام کیا ہوتا ہے یہ خود سودائی کی زبان سے سن لیجیے:

رہبر کے ایما سے ہوا تعلیم کا سودا مجھے
واجب ہے صحرا گرد پر تعمیلِ فرمانِ خضر

لیکن نگاہِ نکتہ بیں دیکھے زبوں بختی مری
''رفتم کہ خار از پا کشم، محمل نہان شد از نظر
یک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ راہم دور شد''

اقبال کے نزدیک تعلیم جدید کے فسادوں میں سے ایک بڑا فساد یہ ہے کہ وہ ہمارے ولولہانگیز ماضی سے ہمارا رشتہ بالکل منقطع کر دیتی ہے اور یوں جب ماضی کی طرف سے ہماری آنکھیں بند ہو جاتی ہیں تو ہم ہدایت و رہبری کے اُس سرچشمے سے محروم ہو جاتے ہیں جس سے ہمارے حال اور مستقبل کی سیرابی ہوتی ہے۔ آنکھوں میں ماضی کی تجلیوں کا نور باقی نہ رہے تو گم کردہ راہوں کے لیے حال اور مستقبل کے سفر کی راہوں میں بھی اندھیرا چھا جاتا ہے۔ یہ بات اقبال نے عہد حاضر کے انسان یا نئی نسل کے فرزندوں کو بار بار بتائی ہے۔ ''بانگ درا'' کی ایک چھوٹی سی نظم ''کفر و اسلام''[۸] میں اقبال نے یہی بات بڑے واشگاف انداز میں ''صاحب سینا'' کی زبان سے نصیحت کے پیرائے میں ادا کروائی ہے۔ نصیحت کا خلاصہ یہ ہے کہ :

چھوڑ کر غائب کو تو حاضر کا شیدائی نہ بن

لیکن یہ نصیحت بڑے لطیف تجزیاتی انداز میں مرحلہ بہ مرحلہ یوں آگے بڑھتی ہے :

ذوقِ حاضر ہے تو پھر لازم ہے ایمانِ خلیلؑ
ورنہ خاکستر ہے تیری زندگی کا پیرہن

ہے اگر دیوانۂ غائب تو کچھ پروا نہ کر
منتظر رہ وادیِ فاراں میں ہو کر خیمہ زن

---

۸ - ایضاً ، ۲۷۱ -

عارضی ہے شانِ حاضر ، سطوتِ غائب مدام
اس صداقت کو محبت سے ہے ربطِ جان و تن

ماضی ، حال اور مستقبل کے باہمی تعلق اور رشتے کی بات جس طرح اقبال نے بار بار اپنے کلام نظم میں دہرائی ہے اسی طرح جب موقع ملا ہے اپنے خطبات ، پیغامات اور مکتوبات میں بھی اس خیال کا اعادہ کرتے رہے ہیں اس لیے کہ یوں خیال ذہن نشین بھی بنتا ہے اور دل نشین بھی - ۲۹ نومبر ۱۹۲۹ع کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین کے سپاسنامے کے جواب میں اقبال نے منجملہ اور باتوں کے یہ بات بھی کہی ہے :

''ایک دوسری بات جس پر میں زور دینا چاہتا ہوں وہ ہمارا انکشاف ماضی ہے - میں ان لوگوں میں نہیں جو صرف ماضی سے محبت کرتے ہیں ؛ میں تو مستقبل کا معتقد ہوں ، مگر ماضی کی ضرورت مجھے اس لیے ہے کہ میں حال کو سمجھوں - اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ سرچشمۂ تہذیب و شائستگی کو سمجھا جائے - میں چاہتا ہوں کہ آپ ان گم گشتہ رشتوں پر نظر ڈالیں جن کے ذریعے سے ہم ماضی و مستقبل سے وابستہ ہیں -[۹]

اوپر کی نظموں میں تعلیم جدید اور تہذیب نو کے جن زہریلے اثرات اور نتائج کی طرف بار بار اشارہ ہوا ، ماضی کی عظیم و درخشاں روایت سے نئی نسل کی بیگانگی ان میں سے صرف ایک ہے - یہ زہر ایسا ہے جو ہلکے ہلکے سرایت کرتا اور بالآخر پوری طرح رگ و پے میں سما جاتا ہے - اس کے اثرات کا سراغ اس وقت لگتا ہے

---

۹ - محمد رفیق افضل ، ''گفتار اقبال'' ، ص ۱۰۴ -

جب زہر پوری طرح اپنا کام کر چکتا ہے، لیکن بعض زہر ایسے ہیں کہ ان کی سمیت زندگی کی خارجی سطح پر بھی نمایاں ہوتی ہے اور انسان کا چھوٹے سے چھوٹا عمل بھی اس زہر اور اس کے اثر کے وجود کی غمازی کرتا ہے - نئی نسلوں کے عمل اور رد عمل میں واضح طور پر ظاہر ہونے والا یہ زہر دہریت اور مادیت کا زہر ہے -

اقبال جب ۱۹۳۱ع میں انگلستان گئے تو آنھوں نے کئی موقعوں پر موجودہ نسل کی زندگیوں میں پھیلتی ہوئی دہریت اور مادیت کے خطروں کی طرف اشارہ کر کے اس سے محفوظ رہنے کی تلقین کی - نوجوانوں کے ایک مجمع سے خطاب کرتے ہوئے آنھوں نے کہا کہ :

''میں نوجوانوں کو نصیحت کرتا ہوں کہ وہ دہریت اور مادیت سے محفوظ رہیں'' -۱۰

اور انھیں دنوں لائسیم کلب (لندن) کی خواتین کو یہ پیغام دیا کہ:

''انگلستان کی عورتوں کا فرض ہے کہ آئندہ نسل کو دہریت اور مادیت کے چنگل سے بچائیں -''۱۱

انھیں خیالات کی گونج ''بانگ درا'' کے ان اشعار میں سنائی دیتی ہے :

خوش تو ہیں ہم بھی جوانوں کی ترقی سے مگر
لبِ خنداں سے نکل جاتی ہے فریاد بھی ساتھ

---

۱۰ - ایضاً ، ص ۲۵۴ -
۱۱ - ایضاً ، ص ۲۵۲ -

ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم
کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ

گھر میں پرویز کے شیریں تو ہوئی جلوہ نما
لے کے آئی ہے مگر تیشۂ فرہاد بھی ساتھ[۱۲]

''بال جبریل'' میں مرید ہندی نے پیر رومی سے علم حاضر کے سامنے دین کی زبوں حالی کا ذکر بڑے درد و کرب کے ساتھ کیا ہے :

چشمِ بینا سے ہے جاری جوئے خوں
علمِ حاضر سے ہے دیں زار و زبوں[۱۳]

پیر رومی اس درد بھری فریاد کے جواب میں بڑی نکتے کی بات کہتے ہیں :

علم را بر تن زنی مارے بود[۱۴]
علم را بر دل زنی یارے بود

شعر کا پہلا مصرعہ اقبال کے اس مشاہدے کی تائید ہے کہ تہذیب حاضر نے ، جو حقیقت میں علم حاضر ہی کا پرتو ہے ، عہد حاضر کے انسان کے جسم کو بھڑکا دیا اور دور حاضر کے مکتب کا

---

۱۲ - ''بانگ درا'' ص ۲۳۳ -
۱۳ - ''بال جبریل'' طبع ہفت دہم ، لاہور ، ۱۹۷۰ع ، ص ۱۸۰ -
۱۴ - ایضاً -

جوان گرم خون ساحرِ افرنگ کا صید زبوں بن گیا[۱۵] لیکن اس کے جسم خاکی کی اس شعلہ سامانی اور خونِ جوان کی گرمی میں وہ سوز ناپید ہے جس سے دلوں میں گداز پیدا ہوتا ہے اور جس کے فیض سے قلب نور سے معمور ہوتے ہیں - ''ارمغان حجاز'' کے ان شعروں میں عہد حاضر کی اس بد آموزی کی طرف بڑے بلیغ انداز میں اشارہ کیا گیا ہے :

جوانان را بد آموز است این عصر
شبِ ابلیس را روز است این عصر

بدامانش مثالِ شعلہ پیچم
کہ بے نور است و بے سوز است این عصر[۱۶]

اقبال نے دل کے اس نور کو جان کی بیداری اور خود نگہ داری کا نام دیا ہے اور اس مکتب سے دامن کشی کی تلقین کی ہے جس کی آغوش جانِ بیدار اور نظرِ خود نگہ دار رکھنے والے جوانوں سے خالی ہے :

بہ آن مومن خدا کارے ندارد
کہ در تن جانِ بیدارے ندارد

ازان از مکتبِ یاران گریزم
جوانے خود نگہدارے ندارد[۱۷]

---

۱۵ - ایضاً ، ص ۱۸۲ -

۱۶ - ''ارمغان حجاز'' طبع اول ، لاہور ، ۱۹۳۸ع ، ص ۱۳۵ -

۱۷ - ایضاً ، ص ۱۳۹ -

عہدِ حاضر کی کتابیں اور ان کتابوں کا درس دینے والے مکتب دل کی بیداری اور خود نگہ داری کا سبق دینے سے قاصر ہیں - آن کی حیثیت محض افسون و افسانے کی ہے کہ ان کی حقیقت عارضی اور فانی ہے - آن کے دامن آس تب و تاب سے خالی ہیں جو ہمیشہ زندہ رہنے والی اور زندگی کو مسلسل آمادۂ سفر رکھنے والی ہے - اقبال اپنے نوجوانوں کے سینے میں اسی تب و تابِ جاودانہ کی شمع فروزاں دیکھنے کے آرزو مند ہیں :

تب و تابے کہ باشد جاودانہ
سمندِ زندگی را تازیانہ

بہ فرزندان بیاموز این تب و تاب
کتاب و مکتب افسون و فسانہ[۱۸]

''بانگ درا'' میں نظموں کے عنوان قائم کر کے اقبال نے ''مذہب''، ''تعلیم''، ''تہذیب حاضر''، ''مسلمان اور تعلیم جدید''، ''علم حاضر''، ''کفر و اسلام'' اور ''تعلیم اور اس کے نتائج'' پر نئی نسل کے حوالے سے بڑے واضح خیالات کا اظہار کیا ہے - یہ خیالات صرف کبھی کبھی ایسے انداز میں نظم کیے گئے ہیں جسے مصلحانہ، ناصحانہ یا خطیبانہ کہا جائے، لیکن اکثر و بیشتر ایسے اسلوب میں حکمت و شعر کا دلکش امتزاج ہے، گو یہ دلکشی امتزاج کی وہ لطیف اور مؤثر دلکشی نہیں جو اردو میں ''بال جبریل'' کی نظموں میں اور فارسی میں انہیں موضوعات پر لکھے ہوئے

---

۱۸ - ایضاً، ص ۱۳۸ -

''اسرار و رموز'' ، ''پس چہ باید کرد'' اور ''جاوید نامہ'' کے اشعار میں ہے - ''بال جبریل'' اور ''ضرب کلیم'' میں جو چند نظمیں ہیں ان میں اقبال نے براہ راست نوجوان کو اور اپنے فرزند عزیز جاوید کو جو آن کے نزدیک پوری نوجوان نسل کی علامت ہیں ، اپنا مخاطب بنایا ہے - ان نظموں میں اقبال نے بعض باتیں ایسی کہی ہیں جن کا تعلق براہ راست یا تو عملی زندگی سے ہے یا آس مخصوص ذہنی روئے سے جس کے زیر اثر انسان اپنے عمل کی راہیں متعین کرتا ہے - باقی باتیں وہ ہیں جن کا مفہوم اور مقصد اقبال کے آس نصب العینی تصور یا فلسفۂ حیات کے رشتے سے واضح ہوتا ہے جس کے مبلغ، مفسر اور پیغامبر اقبال ہیں - ''بال جبریل'' اور ''ضرب کلیم'' کی جن نظموں کی طرف اشارہ مقصود ہے آن کے عنوان ہیں : ''ایک نوجوان کے نام''[۱۹] ''جاوید کے نام''[۲۰] اور ''جاوید سے''[۲۱] - ان نظموں کے جن شعروں کو میں نے دور حاضر کے نوجوانوں کی عملی زندگی سے براہ راست متعلق کہا ہے وہ اس طرح کے شعر ہیں :

ترے صوفے ہیں افرنگی ، ترے قالیں ہیں ایرانی
لہو مجھ کو رلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی[۲۲]

حیا نہیں ہے زمانے کی آنکھ میں باقی
خدا کرے کہ جوانی تری رہے بے داغ[۲۳]

---

۱۹ - ''بال جبریل'' ، ص ۱۶۲ -
۲۰ - ایضاً ، ص ۱۵۷ -
۲۱ - ''ضرب کلیم'' طبع پانزدہم ، لاہور ، ۱۹۷۰ء ، ص ۸۶ -
۲۲ - ''بال جبریل'' ، ص ۱۶۲ -
۲۳ - ایضاً ص ۱۵۷ -

غارت گرِ دیں ہے یہ زمانہ
ہے اس کی نہاد کافرانہ[۲۴]

محولہ بالا نظموں میں گنتی کے شعر ایسے ہیں جن میں بات اشاروں کنایوں کی مدد اور سہارے کے بغیر کہی گئی ہے - باقی شعروں میں ایسی علامتوں اور اشاروں کو اظہار کا وسیلہ بنایا گیا ہے جنھیں یا تو خود اقبال نے ایک مخصوص مفہوم میں استعمال کیا ہے یا ان کے اشاری اور معنوی مفہوم میں روایتی مفہوم کے مقابلے میں معنی کی زیادہ جہتیں اور زیادہ وسعتیں ہیں - ان علامتوں اور اشاروں میں بعض اسما اور اعلام بھی شامل ہیں جنھیں روایتی مفہوم کا پابند رکھنے کے بجائے اقبال نے اپنے نظام فکر میں ایک وسیع تر معنویت کا علمبردار بنایا ہے - اقبال کے نظام فکر میں اور اس نظام فکر کی ترجمانی ، تفسیر اور تعبیر کرنے والے مخصوص اسلوب اظہار میں استغنا ، فقر ، شاہین ، تدرو ، زاغ ، کنجشک ، حمام ، امیری ، فقیری ، غیرت ، نگاہ ، خرد اور خودی کے الفاظ اور خسرو ، حیدر ، سلمان ، محمود ، ایاز ، بو علی اور رازی کے اسما اور اعلام شکوہ ، قوت ، استغنا ، خدمت گزاری اور شعور خرد مندی کی زندۂ جاوید علامتیں ہیں اور اقبال کے اشعار میں ایک مخصوص سیاق میں ایک مخصوص مفہوم اور معنی کی تفسیر و تعبیر بن کر آتی ہیں - ان تینوں نظموں میں اقبال نے ان اشاروں ، علامتوں اور تلمیحی ناموں کے ذریعے ایسے خیالات و تصورات کے اظہار و ابلاغ میں مدد لی ہے جو ان کے فلسفۂ حیات کے تشکیلی اجزا اور عناصر ہیں - ان علامتوں اور اشاروں کی مدد سے اقبال نے اپنے تصورات کا

---

۲۴ - ''ضرب کلیم'' ، ص ۸۶ -

اظہار شعروں میں اس طرح کیا ہے کہ وہ دور حاضر میں اردو کے قاری کا وظیفہ بن گئے ہیں ۔ انھوں نے ہمارے نظام فکر و احساس میں کلیوں کی صورت اختیار کر لی ہے اور یہ کلیے قدم قدم پر دلوں میں ولولہ اور جوش اور روحوں میں بیداری پیدا کر کے اپنے عہد کے تقاضوں کو سمجھنے اور ان سے مطابقت پیدا کرنے میں ہماری رہبری کرتے ہیں ۔ اس طرح کے چند شعر یہ ہیں :

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے ان کو اپنی منزل آسمانوں میں

نہ ہو نومید ، نومیدی زوالِ علم و عرفاں ہے
اُمیدِ مردِ مومن ہے خدا کے رازدانوں میں

نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں[۲۵]

خودی کے ساز میں ہے عمرِ جاوداں کا سراغ
خودی کے سوز سے روشن ہیں اُمتوں کے چراغ[۲۶]

وہ بحر ہے آدمی کہ جس کا
ہر قطرہ ہے بحرِ بیکرانہ

دہقاں اگر نہ ہو تن آساں
ہر دانہ ہے صد ہزار دانہ[۲۷]

---

۲۵ - "بال جبریل" ، ص ۱۶۲ -
۲۶ ایضاً ص ۱۵۷ -
۲۷ - "ضرب کلیم" ، ص ۸۶ -

سینے میں اگر نہ ہو دلِ گرم
رہ جاتی ہے زندگی میں خامی

اللہ کی دین ہے جسے دے
میراث نہیں بلندنامی[۲۸]

''ضرب کلیم'' میں بعض چھوٹی چھوٹی نظمیں ایسی بھی ہیں جن میں اقبال نے کبھی نوجوانوں سے مخاطب ہو کر اور کبھی بغیر کسی تخاطب کے بیانیہ انداز میں نئی تعلیم کے زہریلے اثرات کی طرف اشارے کیے ہیں - ان اشاروں میں بھی حکمت اور شاعری اور ان دونوں کے مخصوص تقاضے دست بدست چلتے ہیں - ان نظموں کے جستہ جستہ شعر سنیے -

''ایک فلسفہ زدہ سید زادے کے نام''[۲۹] اپنے پیغام میں اقبال پہلے تو یہ کہتے ہیں کہ :

تو اپنی خودی اگر نہ کھوتا
زناریِ برگساں نہ ہوتا

ہیگل کا صدف گہر سے خالی
ہے اس کا طلسم سب خیالی

اور پھر چند اور حکیمانہ باتیں کہہ کر اس فلسفہ زدہ سید زادے سے یوں مخاطب ہوتے ہیں :

شعلہ ہے ترے جنوں کا بے سوز
سن مجھ سے یہ نکتۂ دل افروز

---

۲۸ - ایضاً ، ص ۸۷ -
۹ - ایضاً ، ص ۱۰ -

انجامِ خرد ہے بےحضوری
ہے فلسفہ زندگی سے دوری
افکار کے نغمہ ہائے بےصوت
ہیں ذوقِ عمل کے واسطے موت

دیں مسلکِ زندگی کی تقویم
دیں سرِ محمد و براہیم[۳]

دل در سخن محمدیؐ بند
اے پور علیؓ ز بوعلی چند[۳۰]

اللہ نے اقبال کو حکمت و فلسفہ کے اسرار کا رمز شناس بنا کر بھی یہ توفیق عطا کی تھی کہ وہ دین کی نزاکتوں اور لطافتوں کے مفسر بننے کی سعادت حاصل کر سکیں اور خرد کی بے حضوری کا پردہ فاش کر کے جنوں کی دل افروزی کے مبلغ بن کر دلوں کو حقیقت کے نور سے معمور کریں۔

ایک اور نظم ''افرنگ زدہ''[۳۱] میں مغرب زدہ نوجوان کو مخاطب کر کے پہلے تو اس سے یہ کہتے ہیں کہ تیرا وجود سر تا سر تجلی افرنگ ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ تیرا پیکرِ خاکی خودی سے خالی رہ کر اس زرنگار نیام کا نمونہ بن گیا ہے جو شمشیر سے خالی ہے۔ لیکن جس بات پر اقبال کا دل مضطرب ہو جاتا ہے وہ یہ ہے کہ معلم افرنگ کی خیرہ کن تعلیم جس نے ہمیں خودی کی دولت سے محروم کیا اس نے افرنگ زدہ نوجوان کو خدا کے

۳۰۔ ایضاً، ص ص ۱۰ و ۱۱۔
۳۱۔ ایضاً، ص ۲۸۔

وجود سے بھی منکر کر دیا ۔ اس احساس سے ان کے دل میں غصے کی جو لہر اٹھتی ہے وہ انھیں شاعر اور حکیم کا لہجہ ترک کر کے ایسے لہجے میں گفتگو کرنے پر آمادہ کرتی ہے جس کے حرف حرف میں آتش انتقام کے شعلے بھڑک رہے ہیں :

تری نگاہ میں ثابت نہیں خدا کا وجود
مری نگاہ میں ثابت نہیں وجود ترا[۳۲]

''ہندی مکتب''[۳۳] میں مرگ خودی والی بات ایک دوسرے سیاق میں آزادی و محکومی کے ماحول اور نتائج کے پس منظر میں غصے کے بجائے طنز کے لطیف لیکن چبھتے ہوئے پیرائے میں کہی گئی ہے۔ آزاد اور محکوم کی کیفیات اور واردات کا فرق بیان کرتے ہوئے اقبال کہتے ہیں کہ آزاد کی ایک آن محکوم کے ایک سال کے برابر ہے ۔ آرزو کا ہر لحظہ ابدیت کا پیامی ہے اور محکوم کا ہر لحظہ مرگِ مفاجات ۔ آزاد کا اندیشہ حقیقت سے منور ہے اور محکوم کا اندیشہ گرفتار خرافات ہے ۔ محکوم پیروں کی کرامات کا سودائی ہے جب کہ بندۂ آزاد کی ذات بجائے خود ایک زندہ کرامات ہے۔ لیکن ایمائی تصورات کے آگے پیچھے جو بات کہی گئی ہے اس میں طنز کے ہزاروں نشتر چھپے ہوئے ہیں ۔ آزاد اور محکوم کے باہمی فرق کی وضاحت کا سلسلہ شروع ہونے سے پہلے یہ شعر آتا ہے :

بہتر ہے کہ بیچارے ممولوں کی نظر سے
پوشیدہ رہیں باز کے احوال و مقامات[۳۴]

---

۳۲ ۔ ایضاً ۔
۳۳ ۔ ایضاً ، ص ۷۷ ۔
۳۴ ۔ ایضاً ۔

اور خیالات کے تلازم کا سلسلہ ختم ہوتے ہی یہ شعر آتا ہے :

محکوم کے حق میں ہے یہی تربیت اچھی
موسیقی و صورت گری و علم نباتات[۳۵]

نظم اسی پر ختم ہو جاتی ہے لیکن پہلے شعر میں ''بہتر ہے کہ'' اور ''یہی تربیت اچھی'' کے ٹکڑوں میں احساس کی جو تیزی اور شدت ہے وہ پڑھنے والے کے دل پر ایک دیرپا اثر ثبت کر جاتی ہے ۔

اب ایک اور نظم ''مدرسہ''[۳۶] کی طرف اشارہ کر کے اپنی بات کا یہ سلسلہ ختم کرنے کی اجازت چاہوں گا ۔ نظم کا انداز تخاطبی ہے اور یہ انداز شروع ہی سے ایسا ہے کہ بات کہنے والے کے دل میں چھپے ہوئے غم و غصہ کی غمازی کر رہا ہے ، اس کے باوجود الفاظ میں بظاہر شکوہ و سطوت کی گونج ہے ۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ لفظوں کا شکوہ محض غم و غصہ کی کیفیت کو مخفی رکھنے کا ایک وسیلہ ہے ۔ نظم یہ ہے :

عصرِ حاضر ملک‌الموت ہے تیرا جس نے
قبض کی روح تری دے کے تجھے فکرِ معاش

دل لرزتا ہے حریفانہ کشاکش سے ترا
زندگی موت ہے کھو دیتی ہے جب ذوقِ خراش

---

۳۵ ۔ ایضاً ، ص ۷۸ ۔
۳۶ ۔ ایضاً ، ص ۸۲ ۔

آس جنوں سے تجھے تعلیم نے بیگانہ کیا
جو یہ کہتا تھا خرد سے کہ بہانے نہ تراش

فیضِ فطرت نے تجھے دیدۂ شاہیں بخشا
جس میں رکھ دی ہے غلامی نے نگاہِ خفاش

مدرسے نے تری آنکھوں سے چھپایا جن کو
خلوتِ کوہ و بیاباں میں وہ اسرار ہیں فاش

جیسا کہ ظاہر ہے شکوہ و سطوت کے اس آہنگ کو نمایاں کرنے میں محض مفرد لفظوں کے علاوہ دو اور چیزوں نے بھی نمایاں حصہ لیا ہے : ایک معاش ، خراش ، تراش ، فاش اور خفاش کے قافیوں نے جن کا مزاج روزمرہ کی زبان اور تخاطب کے لیے استعمال کی جانے والی ہلکی پھلکی زبان سے مختلف ہے اور دوسرے اشعار میں مسلسل تواتر سے آنے والے نئے اضافی، توصیفی اور تشبیہی مرکبات نے ۔ فکر معاش ، حریفانہ کشاکش ، ذوق خراش ، فیض فطرت ، دیدۂ شاہیں ، نگاہ خفاش اور خلوت کوہ و بیاباں کی خوش آہنگ ترکیبیں بھی شکوہ و سطوت کے اس تأثر کی تکمیل کا ذریعہ بنتی ہیں جو غم و غصہ کی شدت کو پس پردہ رکھنے کی غرض سے ارادتاً پیدا کیا گیا ہے ۔

اب تک میں نے ''بانگ درا'' ، ''بال جبریل'' ، ''ضرب کلیم'' اور ''ارمغان حجاز'' کی چھوٹی بڑی نظموں کے حوالے سے ان تأثرات کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی ہے جو عہد حاضر کی تہذیب اور تعلیم اور اس میں گھرے ہوئے نوجوان کی کیفیات اور واردات کے مشاہدے سے اقبال کے قلب و ذہن میں موجزن ہوئے ۔ اس تجزیے

سے یہ بات ظاہر ہے کہ اقبال نے اپنے عہد کے سیاسی ، تہذیبی ، معاشرتی ، علمی اور تعلیمی ماحول اور اس ماحول کے پیدا اور عام کیے ہوئے رجحانات اور میلانات کا بغور مطالعہ اور مشاہدہ کیا ۔ اس مطالعے اور مشاہدات کا ایک اہم نتیجہ یہ ہے کہ اقبال کو موجودہ نسل کا انسان ، جسے انھوں نے کبھی ''نوجوان'' کہا ہے اور کبھی بہ حیثیت مجموعی ''نژادِ نو'' ، ایسے فکری اور جذباتی رویے کے قید و بند میں پھنسا ہوا دکھائی دیا کہ انھیں انسانیت کا مستقبل تاریک اور بھیانک نظر آنے لگا اور انھوں نے شاعر اور مفکر کی حیثیت سے خود پر یہ فرض عائد کیا کہ وہ مستقبل کے مقدر اور مقسوم کی سربراہی اور قیادت کرنے والے انسان پر ان سب حقیقتوں کا انکشاف کریں جو ان کی چشم بینا نے دیکھیں اور قلبِ مضطر نے محسوس کی ہیں ۔ اقبال اپنے اس فریضے کی انجام دہی کی طرف سے نہ صرف یہ کہ اپنی زندگی کے کسی دور میں غافل نہیں ہوئے بلکہ ہر لمحہ اس کی طرف متوجہ رہے اور اسے کبھی مصلح کی طرح انجام دیا ، کبھی شاعر کی طرح اور کبھی فلسفی کی طرح اور ضرورت اور موقع کی مناسبت سے اپنے لہجے میں کبھی تلخی پیدا کی ، کبھی شفقت اور کبھی تدبر ۔ پھر فنی اعتبار سے ایک بات اور بھی ہوئی اور وہ یہ کہ اقبال کی نظر اور احساس نے اپنے گرد و پیش سے مشاہدے کی جن منفرد اور منتشر اکائیوں کو سمیٹ کر اکھٹا کیا تھا وہ ایک ایک کر کے اقبال کے فکری ، جذباتی ، حسیاتی اور تخئیلی تجربے کی صورت اختیار کرتی رہیں اور پھر بالآخر تجربے کی انھیں بے شمار اکائیوں کے اجتماع و امتزاج اور ترتیب و تنظیم سے ایک مرتب اور منظم تجربہ ظہور میں آیا جسے ہم اقبال کا فلسفۂ حیات یا نظریۂ حیات کہتے ہیں ۔ یہ فلسفۂ حیات یا نظریۂ حیات اقبال کی داخلی شخصیت کا

عکس ہے - اس نظریے نے اقبال کی شخصیت کی گہرائیوں میں پرورش پائی اور پوشیدہ داخلی عمل کے ذریعے وہ اس طرح اقبال کی ذات میں جذب اور حل ہوگیا کہ خود اقبال کے لیے بھی ان دونوں میں فرق کرنا اور ان دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کر کے دیکھنا ممکن نہیں رہا اور آخر صورت یہ ہوئی کہ کسی ہنگامی محرک کے زیر اثر اُن کی ذات میں جذب اور حل کی ہوئی تجربے کی یہ داخلی اکائیاں ، کبھی منفرد صورت میں اور کبھی دوسری اکائیوں کے ساتھ ، شعر کے خارجی پیکر میں ظاہر ہوتی رہیں اور اُن کے شعروں اور نظموں کے ذریعے اُس قاری کے ذہن تک پہنچتی اور اُسے متاثر کرتی رہیں جسے متاثر کرنے کے لیے انھوں نے شعر کی صورت اختیار کی تھی -

اسی غیر محسوس فنی عمل کا کرشمہ ہے کہ ہمیں وہ صدہا باتیں جو اقبال اپنے عہد کے نوجوان کے متعلق خود اُس سے یا دوسروں سے کہنا چاہتے ہیں ، ان کی شاعری کے مختلف ادوار میں اُن کے کلام میں بکھری اور پھیلی ہوئی نظر آتی ہیں - ان باتوں میں نہ باہم کوئی منطقی ربط ہے اور نہ تقدم و تاخر کا کوئی تعلق- اس کے باوجود کہ یہ سب خیالات داخلی طور پر ایک مضبوط منطقی اور فکری رشتے میں منسلک ہیں وہ جب شعر کی صورت اختیار کرتے ہیں تو ربط اور تعلق کے یہ رشتے قائم نہیں رہتے - ہر خیال خیالوں کی اُس زنجیر سے الگ ہو کر ، جس میں فکر اور جذبے کی داخلی سطح پر وہ حلقہ بند ہے ایک کڑی کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور شعر میں اپنے واضح وجود کا الگ اعلان کرتا ہے - اقبال کی جن نظموں کا اب تک تجزیہ کیا گیا ان میں بات تو کوئی بھی ایسی نہیں جو اقبال کے منظم فلسفۂ حیات کا جزو ، عنصر یا حصہ نہ ہو ، لیکن یہ سب باتیں اس منظم فلسفے کے منفرد اور

منتشر اجزا اور عناصر ہی کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتی ہیں۔ آن میں تقدم و تأخر اور سبب اور نتیجے کا منطقی تعلق خود ہمارا ذہن پیدا کرتا ہے۔ لیکن اقبال کی ایک نظم ایسی ہے جس میں اقبال نے خود نوجوان نسل کے متعلق اپنے خیالات کو ایک واضح ربط اور تسلسل کے ساتھ پیش کیا ہے اور یوں یہ نظم نوجوانوں کے متعلق اقبال کے جملہ تصورات کا ایسا مرقع بن گئی ہے جس میں فکر اور شعر دونوں کے رنگ پوری آب و تاب سے جلوہ گر ہیں اور آپس میں مل جل کر مرقعے کو ایسی صورت دیتے ہیں کہ اُن سے قلب و نظر دونوں کو زندگی ملتی ہے۔ اس نظم کا عنوان ہے : ''خطاب بہ جاوید'' یا ''سخنے بہ نژاد نو''۔ جاوید نامے کی اس نظم[۳۷] کے مطالعے اور تجزیے میں پڑھنے والا جن گوناگوں کیفیتوں سے دوچار ہوتا ہے آن کا ظہور صرف آس وقت ہوتا ہے جب فکر و فن کی سطح ایک ہو جائے اور دونوں اپنا سفر پوری طرح ہم آہنگ ہو کر طے کریں۔

اقبال نے اپنی ساری زندگی اپنی شاعری کے ذریعے نوجوانوں کی فکری رہنمائی کی جو خدمت انجام دی ''خطاب بہ جاوید'' کے تمہیدی اشعار میں آس کی طرف یوں اشارہ کرتے ہیں :

گرچہ من صد نکتہ گفتم بے حجاب
نکتۂ دارم کہ ناید در کتاب[۳۸]

اس نکتے کے متعلق اقبال کا خیال ہے کہ وہ اگر ''حرف و صوت'' کی مدد سے بیان کیا جائے تو آس کا مفہوم واضح ہونے کے بجائے

---

۳۷ - ''جاوید نامہ'' طبع دوم ، لاہور ، ۱۹۴۷ع ، ص ۲۳۳ تا ۲۴۷ -
۳۸ - ایضاً ، ص ۲۲۳ -

پوشیدہ ہو جائے گا - اس لیے اقبال کہتے ہیں کہ اس نکتے کا راز اگر تمھیں کہیں ملے گا تو میری نگاہ میں یا میری آہِ صبح گاہی میں۔[۳۹] اس سے اگلے بند میں یہ بتانے کے بعد کہ ''لا الٰہ'' کی دولت جاوید کا سرمایہ تو نے اپنی مادر مشفق کی آغوش میں رہ کر حاصل کیا ، کہتے ہیں کہ ''لا الٰہ'' کی آگ میں جلنے کا سبق تو مجھ سے سیکھ ، لیکن یہ سبق تیری سمجھ میں اس وقت آئے گا جب تو ذوقِ نگہ کی دولتِ بیدار مجھ سے حاصل کرے :

اے پسر! ذوقِ نگہ از من بگیر
سوختن در لا الٰہ از من بگیر

لا الٰہ گوئی ؟ بگو از روئے جان
تا زِ اندامِ تو آید بوئے جان[۴۰]

بند کے اگلے تین شعروں میں اقبال بڑے لطیف ایمائی انداز میں اپنے بیٹے کو یہ بتاتے ہیں کہ سوزِ ''لا الٰہ'' سے مہر و مہ گردش کرتے ہیں اور کوہ و ماہ میں اسی کے سوز کا عکس نظر آتا ہے -

---

۳۹ - اپنی نگاہ کے اس رمز اور اپنے جگر کے اس سوز کو نوجوانوں کی نظروں اور دلوں میں منتقل کرنے کی جو آرزو اقبال کو تڑپا رہی ہے اس کی طرف بڑا مؤثر اشارہ ''بال جبریل'' کے آن شعروں میں ملے گا جن کا ذکر آگے چل کر کیا جائے گا - یہ شعر ''ساقی نامہ'' میں اس طرح شروع ہوتے ہیں :

جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے
مرا عشق ، میری نظر بخش دے

۴۰ - ''جاوید نامہ'' ، ص ۲۳۴ -

اے پسر! ''لا الٰہ'' کے ان دو حرفوں کو محض گفتار مت سمجھ۔ ان دو حرفوں میں تیغ بے زنہار کی قوت ہے، ''لا الٰہ'' نہ صرف ضرب ہے بلکہ وہ ضربِ کاری ہے۔

اگلے بند میں جو بارہ شعروں کا ہے موجودہ دور کے مسلمان کی حالت کا نقشہ کھینچا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ اس کی نمازیں ''لا الٰہ'' کے سوز سے خالی ہیں اور اس کے نیاز میں ناز ناپید ہے۔ اُس کے صوم و صلوات میں نور کا اور اس کی کائنات میں جلوے کا ظہور موجود نہیں۔ وہ مسلمان کہ جس کے لیے صرف اللہ کا نام سرمایۂ حیات تھا، اب حبِ دولت اور خوف مرگ کے دام میں اسیر ہے۔ عصر حاضر کی صحبت اور دو پیغمبروں کی تربیت نے اُسے دین سے بیگانہ کر دیا۔ اُس کے لیے حج اور جہاد کی حیثیت واجباتِ دین کی نہ رہی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے صوم و صلوات کے پیکر قالبِ بے روح ہو کر رہ گئے اور صلوات و صیام سے روح رخصت ہوئی تو فرد کی زندگی میں ہمواری اور ملت کی زندگی میں نظم و ضبط باقی نہ رہا۔ اگلے بند میں مسلمانوں کے سجدے کی بے کیفی کا ذکر کرتے ہوئے اقبال سوال کرتے ہیں کہ ہمارے ربی الاعلیٰ کا شکوہ آخر کہاں گیا اور صاحبِ قرآن بے ذوقِ طلب کیوں رہ گیا؟

ان سوالوں کے بعد جو بند شروع ہوتا ہے[۴۱] اُس میں اقبال ایک بار پھر نوجوان سے مخاطب ہوتے اور اُس سے کہتے ہیں کہ اللہ تجھے صاحبِ نظر کرے، تو اس دنیا کی ایک جھلک یکھ جو اس وقت تیرے سامنے ہے: اس دنیا والوں کی عقلیں بے باک ہیں، اُن کے دل گداز سے خالی ہیں، اُن کی آنکھوں میں شرم باقی نہیں

---

۴۱ - نظم کا پانچواں بند، ص ۲۳۶ -

رہی اور وہ سر تاپا ''مجاز'' میں غرق ہیں - اس عہد میں علم و فن ، دین و سیاست اور عقل و دل سب طوافِ آب و گل میں مصروف ہیں - اگلا بند[۴۲] آن تصورات کی تمہید ہے جو اقبال ساتویں بند میں پیش کرتے ہیں - یہ بند ایک لحاظ سے پوری نظم کا قلب اور روح ہے - اس میں اقبال نے عہد حاضر کے نوجوان کی حالت کا نقشہ کھینچا ہے اور علم کے صحیح مفہوم کی وضاحت کی ہے - بند کے ابتدائی دو شعر یہ ہیں :

نوجوانان تشنہ لب ، خالی ایاغ
شستہ رو ، تاریک جان ، روشن دماغ

کم نگاہ و بے یقین و ناامید
چشم شان اندر جہان چیزے ندید[۴۳]

اس کے بعد اقبال نوجوانوں کی کم نگاہی ، بے یقینی اور نا اُمیدی کا ذمہ دار تعلیم کو ٹھہراتے ہوئے اپنی بات تمثیل اور کنایے کے پیرایے میں بیان کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آج کل کی تعلیم اپنے مقصود سے آگاہ نہیں اور اُس کی لے نے متعلم کے جذب اندروں تک رسائی حاصل نہیں کی - اس کی شاخوں میں گل رعنا آ گانے کی صلاحیت نہیں اور اس نے شاہین بچوں میں بطوں کی عادت پیدا کر دی[۴۴] ہے - علم جب تک زندگی سے سوز حاصل نہ کرے دل

---

۴۲ - ایضاً ، ص ۲۳۷ -
۴۳ - ایضاً -
۴۴ - یہی خیال ''ارمغان حجاز'' کے دو شعروں میں (ص ۱۴۴) بڑی

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

کو واردات (قلبی) میں کوئی لذت حاصل نہیں ہوتی - علم سوائے اِس کے اور کچھ نہیں کہ وہ تیرے مقام و مرتبے کی تشریح اور تیری آیات ذات کی تفسیر کرے - انسان کو پہلے احساس کی آگ میں جلنا ہوتا ہے جب وہ اس قابل بنتا ہے کہ اپنی ذات کے کھوٹے کھرے میں امتیاز کرسکے :

علم حق اول حواس آخر حضور
آخرِ او می نگنجد در شعور !۴۵

اس سے اگلا بند ساتویں بند کے خیالات کا تکملہ ہے اور اس کا ایک ایک شعر مفہوم اور مزاج کے اعتبار سے ایسا ہے کہ ضرب المثل بن کر زبان و قلب کا وظیفہ بنے - بند کے ابتدائی چار شعر یہ ہیں :

صد کتاب آموزی از اہلِ ہنر
خوشتر آن درسے کہ گیری از نظر

ہر کسے زان مے کہ ریزد از نظر
مست می‌گردد بانداز دگر

(پچھلے صفحے کا بقیہ حاشیہ)

خوبصورتی سے یوں ادا ہوا ہے :

جوانے خوش گلے ، رنگین کلاہے
نگاہِ او چو شیران بے پناہے

بہ مکتب علمِ میشی را بیاموخت
میسر نایدش برگِ گیاہے !

۴۵ - ''جاوید نامہ'' ، ص ۲۳۸ -

از دمِ بادِ سحر میرد چراغ
لالہ زاں بادِ سحر مے در ایاغ

کم خور و کم خواب و کم گفتار باش
گردِ خود گردندہ چون پرکار باش[۴۶]

ذات کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے اقبال اپنے اور ملا کے خیالات کا فرق یوں واضح کرتے ہیں :

منکرِ حق نزدِ ملا کافر است
منکرِ خود نزدِ من کافر تر است

---

۴۶ - جاوید نامے کا یہ شعر اقبال کو ایک خاص موقعے پر یاد آیا - وہ ۶ نومبر ۱۹۳۱ء کو لندن میں اقبال لٹریری ایسوسی ایشن کی ایک تقریب میں تقریر کر رہے تھے - آنھوں نے فرمایا کہ : "۱۹۰۵ء میں میں جب انگلستان آیا تھا تو میں محسوس کر چکا تھا کہ مغربی ادبیات اپنی ظاہری دلفریبیوں اور دلکشیوں کے باوجود اس روح سے خالی ہیں جو انسانوں کے لیے اُمید ، ہمت اور جرأت عمل کا پیغام ہوتی ہے اور جسے زندگی کے جوش اور ولولے سے تعبیر کرنا چاہیے"۔ (بہ رفیق افضل ، کتاب مذکور ، ص ۲۵۰) - آگے چل کر اقبال کہتے ہیں : "اگرچہ میرے ساتھ کوئی فوج نہیں ہے ، تاہم رفقا کی ایک کثیر جماعت میرے سامنے ہے - آپ اپنی تعداد کو بڑھائیے - میں آپ کو وہی نصیحت کرتا ہوں جو میں نے اپنے فرزند کو کی ہے ، یعنی

کم خور و کم خواب و کم گفتار باش
گردِ خود گردندہ چون پرکار باش"

آن بانکارِ وجود آمد ’عجول‘[۴۷]
این عجول و ہم ظلوم و ہم جہول[۴۸]

اس کے بعد چند اوصاف پیدا کرنے کی تلقین کی گئی ہے جو نوجوان میں تکمیلِ ذات کا وسیلہ بنتے ہیں :

شیوۂ اخلاص را محکم بگیر
پاک شو از خوفِ سلطان و امیر

عدل در قہر و رضا از کف مدہ
قصد[۴۹] در فقر و غنا از کف مدہ

حکم دشوار است ؟ تاویلے مجو
جز بقلبِ خویش قندیلے مجو

---

۴۷ - آیۃ شریفہ کی طرف اشارہ ہے : و یدع الانسان بالشر دعاءہ بالخیر وکان الانسان عجولا○ (سورۂ بنی اسرائیل ، آیت ۱۱) - اور انسان برائی (عذاب) کی ایسی درخواست کرتا ہے جس طرح بھلائی کی درخواست اور انسان (کچھ طبعاً ہی) جلد باز ہے (ترجمہ مولانا اشرف علی تھانوی) -

۴۸ - انا عرضنا الامانۃ علی السموات و الارض و الجبال فابین ان یحملنھا و اشفقن منھا و حملھا الانسان انہ کان ظلوما جھولا (سورۂ احزاب، آیت ۷۲) ہم نے یہ امانت (احکام) آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کی تھی سو انھوں نے اس کی ذمہ داری سے انکار کر دیا اور اس سے ڈر گئے اور انسان نے اس کو اپنے ذمہ لے لیا - وہ ظالم ہے ، جاہل ہے - (ترجمہ مولانا اشرف علی تھانوی) -

۴۹ - قصد بھی اعتدال اور میانہ روی ہے -

حفظ جان‌ہا ذکر و فکرِ بےحساب
حفظ تن‌ہا ضبطِ نفس اندر شباب

حاکمی در عالمِ بالا و پست
جز بحفظ جان و تن ناید بدست

لذتِ سیر است مقصودِ سفر
گر نگہ بر آشیان‌داری مپر

ماہ گردد تا شود صاحب مقام
سیرِ آدم را مقام آمد حرام

زندگی جز لذتِ پرواز نیست
آشیان با فطرتِ او ساز نیست

رزقِ زاغ و کرگس اندر خاکِ گور
رزقِ بازان در سوادِ ماہ و ہور[۵۰]

اس سے اگلے بند میں ''صدق مقال'' اور '' اکل حلال''[۵۱] کو اسرار دین بتایا گیا ہے اور پھر سلطان مظفر کے ایک با وفا ، بے عیب اور پاک نسب گھوڑے کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ ایک دن اس کے پیٹ میں درد اٹھا ، بیطار نے شراب سے اس کا علاج کیا اور وہ صحت یاب ہوگیا ، لیکن تقویٰ پسند سلطان نے

---

۵۰ - ''جاوید نامہ''، ص ۲۳۹ -
۵۱ - ایضاً ، ص ۲۴۰ -

اس کے بعد اس گھوڑے پر سواری نہیں کی - تقویٰ کو مردِ مومن کی خصوصیت بتاتے ہوئے اقبال نے اس بند کے ایک شعر میں یہ بات کہی ہے :

مردِ مومن را عزیز اے نکتہ رس
چیست جز قرآن و شمشیر و فرس ؟

یہ بند اس شعر پر ختم ہوتا ہے :

اے ترا بخشد خدا قلب و جگر
طاعتِ مردِ مسلمانے نگر ![۵۲]

اور پھر یہ شعر دین کے مفہوم کی وضاحت کی تمہید بن جاتا ہے :

دین سراپا سوختن اندر طلب
انتہایش عشق و آغازش ادب

آبروئے گل ز رنگ و بوئے اوست
بے ادب بے رنگ و بو ، بے آبروست

نوجوانے را چو بینم بےادب
روزِ من تاریک می گردد چو شب[۵۳]

---

۵۲ - ایضاً ، ص ۲۴۱ -
۵۳ - ایضاً - اس موقعے پر اقبال کے دو اور شعروں کی یاد تازہ ہوتی ہے
(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

''ادب'' کی اس اہمیت کی وضاحت کرنے کے بعد وہ خیال نظم کیا گیا ہے جس کی بدولت شعر واقعی ضرب المثل بن گیا ہے :

حرفِ بد را بر لب آوردن خطاست
کافر و مومن ہمہ خلقِ خدا ست

آدمیت احترامِ آدمی
باخبر شو از مقامِ آدمی[۵۴]

اس سے اگلے چار شعروں میں آدمی اور آدمی کے ربط و ضبط اور دوستی و شفقت کے متعلق جو باتیں کہی گئی ہیں وہ اس قابل ہیں کہ انھیں حرزِ جاں بنا کر قدم قدم پر ان سے رہنمائی حاصل کی جائے - اقبال کہتے ہیں کہ تو انسان ہے اس لیے ربط و ضبط کا آئین اختیار کرکے دوستی کے راستے پر چل - عشق کے بندے اللہ کے راستے پر چلتے اور اپنی شفقت و محبت میں کافر و مومن کو یکساں حصہ دار بناتے ہیں ، اس لیے اے فرزند ! کفر اور دین

(پچھلے صفحے کا بقیہ حاشیہ)

جن میں انھوں نے ادب کو انسان کے کردار کی زینت کہا ہے - شعر یہ ہیں :

ادب پیرایۂ نادان و دانا ست
خوش آن کو از ادب خود را بیاراست

ندارم آن مسلمان زادہ را دوست
کہ در دانش فزود و در ادب کاست

(''ارمغان حجاز'' ، ص ۱۴۱)

۵۴ - ''جاوید نامہ'' ، ص‌ص ۲۴۱-۲۴۲ -

دونوں کو اپنے قلب کشادہ میں جگہ دے ، اس لیے کہ اے جان پدر ! دل اگر دل سے بھاگے تو وہ ہر گز دل نہیں - یہ صحیح ہے کہ دل زندانیِ آب و گل ہے ، لیکن یہ بات بھی تو یاد رکھنے کی ہے کہ یہ سارا جہان دل کا جہان ہے -" اور دل کے جہان کی یہ دولت ان کی میراث بنتی ہے جو فقر کی راہ اختیار کرتے ہیں - نظم کے اگلے تین بندوں میں نوجوانوں کو فقر کے اسی مفہوم اور معنی سے آگاہ اور آشنا کیا گیا ہے اور وہ حقائق منکشف کیے گئے ہیں جن تک صرف اہل نظر اور اہل دل کی نگاہ کی رسائی ہے - ان حقائق کی طرف اقبال نے اپنے قاری کو بڑے حکمی انداز میں متوجہ کیا ہے اور یقین اور اعتماد کے لہجے میں انھیں بعض چیزوں کے ترک اور بعض کے اختیار کرنے کی تلقین کی ہے - ان تین بندوں میں کئی شعر ایسے ہیں جن میں تمثیل اور کنایے کا سہارا لیے بغیر، بات دو ٹوک انداز میں کہی گئی ہے - اس طرح کے جستہ جستہ شعر ملاحظہ کیجیے :

گرچہ باشی از خداوندانِ دہ
فقر را از کف مدہ ، از کف مدہ

سالہا اندر جہان گردیدہ‌ام
ہم بچشمِ سنعان کم دیدہ‌ام

من فدائے آنکہ درویشانہ زیست
وائے آن کو از خدا بیگانہ زیست

---

۵۵ - ایضاً ص ۲۴۲ -

در مسلمانان مجو آن ذوق و شوق
آن یقین، آن رنگ و بو، آن ذوق و شوق

خیر و خوبی بر خواص آمد حرام
دیده‌ام صدق و صفا را در عوام

کرگسان را رسم و آئین دیگر است
سطوتِ پروازِ شاہین دیگر است

مردِ حق از آسمان افتد چو برق
ہیزمِ او شہر و دشتِ غرب و شرق

او کلیم[۴] و او مسیح[۴] و او خلیل[۴]
او محمد[ص] ، او کتاب ، او جبرئیل

بند اور نظم کے آخری چند شعر پیر رومی کو رفیق راہ بنانے کی تلقین کرتے ہیں کہ سوز و گداز کی دولتِ بیدار صرف اسی طرح حاصل ہونی ممکن ہے - اقبال کو خداوندانِ مکتب اور اہل خانقاہ سے یہ شکایت ہے کہ انھوں نے حرف رومی کی تشریح تو کی لیکن اس کی روح تک نہیں پہنچے اور اس لیے حقیقی معنی ہم سے یوں دور بھاگ گئے جیسے تیزرو غزال - صوفیوں اور ملاؤں نے اس کے کلام سے رقص تن کا سبق تو اخذ کیا لیکن رقص جاں کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں ، حالانکہ رقص تن اور رقص جاں میں زمین و آسمان کا فرق ہے - ایک زمین کی گردش کا سبب بنتا ہے اور دوسرا دنیائے افلاک کو برہم کرتا ہے - رقص جاں کی بدولت علم و حکم

اور زمین و آسمان پر تصرف حاصل ہوتا ہے ، لیکن رقص جاں کا سیکھنا کوئی آسان کام نہیں ۔ آدمی جب تک اپنے جگر کو حرص و غم کی آگ سے خاکستر نہ کر دے ، جان رقص میں نہیں آتی اور اس لیے اے پسر! یاد رکھ کہ :

ضعفِ ایمان است و دلگیریست غم
نوجوانا ! 'نیمۂ' پیریست غم[۵۶]

می شناسی؟ حرص فقر حاضر است[۵۷]
من غلامِ آنکہ بر خود قاہر است

اے مرا تسکین جان نا شکیب
تو اگر از رقص جان گیری نصیب

سرِ دینِ مصطفٰی گویم ترا
ہم بقبر اندر دعا گویم ترا

رقص جاں طبیعت کا وہ اضطراب ہے جس کی طرف اقبال اپنے کلام نثر و نظم میں بار بار اشارے کرتے رہے ہیں ۔ موجودہ نسل کے نوجوانوں کو مستقبل کی زندگی کا امین اور پاسبان سمجھ کر وہ ساری زندگی یہ آرزو کرتے رہے ہیں کہ نوجوان کو آس مثالی

---

۵۶ - الھم نصف الھرم ۔ ''مختصر شرح الجامع الصغیر للمناوی'' ، قاہرہ ، ۱۹۵۴ع ، ج ۲ ، ص ۴۹۱ ۔

۵۷ - ایا کم و الطمع فانہ ھو الفقر الحاضر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (الطبرانی ''الاوسط'' بروایت حضرت جابرؓ) ۔

اور نصب العینی انسان کا نمونہ بنائیں جو مرکب ایام کی زمام اپنے ہاتھوں میں لے کر اس کا رخ اس بہتر زندگی کی طرف پھیر سکے جو خالق ازلی کا مقصود ہے - اقبال کے پاس بقول اُن کے ''صرف ایک بے چین اور مضطرب جان ہے''- اُن کی سب سے بڑی آرزو یہ ہے کہ وہ اپنا اضطراب کسی ایسے نوجوان کے دل میں منتقل کر دیں جو اس کا اہل ہو -[۵۸] اسی اضطراب کا نام ''جاوید نامہ'' کی مذکورہ بالا نظم میں ''رقص جاں'' ہے اور اسی کو ''ارمغان حجاز'' میں ''تب و تاب''[۵۹] کہا گیا ہے یہی رقص جاں ، یہی تب و تاب جاودانہ اور اضطراب جان ہے کہ اگر کسی نوجوان کے دل میں منتقل ہو جائے تو اقبال کے دل سے قبر میں بھی اس کے لیے دعائیں نکلیں گی - خود اقبال نے اپنی زندگی میں بھی اس آرزو کو مناجات اور دعا کی صورت دی ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ جہاں یہ دعا زبان پر آئی ہے اس میں آرزو کی دردمندی نے بڑا سوز و گداز اور بڑی تاثیر پیدا کی ہے - یہ آرزو ''ساقی نامہ'' میں بڑی دلسوزی کے

---

۵۸ - اکبر الہ آبادی کے نام ایک خط میں اقبال نے اس اضطراب کے کسی نوجوان کے دل میں منتقل کرنے کی آرزو ان لفظوں میں ظاہر کی ہے :
''صرف ایک بے چین ور مضطرب جان رکھتا ہوں - قوت عمل مفقود ہے - ہاں یہ آرزو رہتی ہے کہ کوئی قابل نوجوان ، جو ذوق خداداد کے ساتھ قوت عمل بھی رکھتا ہو، مل جائے ، جس کے دل میں اپنا اضطراب منتقل کر دوں -'' (خط محررہ ۲۵ اکتوبر ۱۹۱۵ع : ''اقبال نامہ'' ، حصہ دوم ، ص ۴۹) -

۵۹ - ملاحظہ ہو ''ارمغان حجاز'' ، ص ۱۳۸ :

تب و تابے کہ باشد جاودانہ
سمندِ زندگی را تازیانہ
بہ فرزندان بیاموز این تب و تاب
کتاب و مکتب افسون و فسانہ

ساتھ دعا کا پیکر اختیار کرتی ہے - شعر سب ایسے ہیں کہ اُن کی تکرار اور اعادے میں بھی ایک لذت ہے :

ترے آسمانوں کے تاروں کی خیر
زمینوں کے شب زندہ داروں کی خیر

جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے
مرا عشق ، میری نظر بخش دے

مرے دیدۂ تر کی بےخوابیاں
مرے دل کی پوشیدہ بیتابیاں

مرے نالۂ نیم شب کا نیاز
مری خلوت و انجمن کا گداز

اُمنگیں مری ، آرزوئیں مری
اُمیدیں مری ، جستجوئیں مری

مری فطرت آئینۂ روزگار
غزالانِ افکار کے مرغزار

مرا دل مری رزم گاہِ حیات
گمانوں کے لشکر یقیں کا ثبات

یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر
اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر

مرے قافلے میں لٹا دے اسے
لٹا دے ، ٹھکانے لگا دے اسے[۶۰]

اپنی زندگی کا سارا برگ و بار اقبال اُن اہل سفر کے قدموں پر نثار کرنے کے تمنائی ہیں جن کا قافلہ اُس منزل کی طرف رواں دواں ہے جو اُن کی امیدوں اور آرزوؤں کا آخری محور و مرکز ہے - متاع جاں کے سوا جسے ایک سیاق میں جسد خاکی کہا گیا ہے اور کوئی چیز اقبال کی اپنی ملکیت نہیں -[۶۱] انھوں نے اپنی روح نوجوانوں کی خدمت کے لیے وقف کر رکھی ہے - یہی روح جو ''ساقی نامہ'' کی دعائیہ مناجات میں سوز جگر ، بیتابیٔ دل ، عشق ، نظر ، آہنگ ، آرزو ، امید اور جستجو کا نام پاتی ہے ، اقبال کی ساری متاع اور اُن کی ساری کائنات ہے اور ان کے نزدیک اس متاع بے بہا کا صحیح مصرف یہ ہے کہ وہ جوانوں کے کام آئے -

حالی نے ''خاصۂ خاصان رسل ؐ'' کے حضور میں حاضر ہو کر بڑی دل سوزی اور دردمندی کے ساتھ امت مسلمہ کی روداد سنائی اور ان سے شفاعت کی التجا کی ہے - اقبال بھی آستانۂ رسول ؐ کو اپنا ملجا و ماویٰ جانتے ہیں اس لیے اپنے درد کے درماں کی آرزو لے کر

---

۶۰ - ''بال جبریل'' ، ص ۱۶۹ -

۶۱ - یہ بات اقبال نے ۲۹ نومبر ۱۹۲۹ء کو علی گڑھ یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین کے پیش کیے ہوئے سپاسنامے کا جواب دیتے ہوئے ان لفظوں میں کہی تھی : ''گذشتہ چند سال سے میں صرف جسد خاکی کا مالک ہوں - میری روح ہمیشہ آپ کی خدمت کے لیے حاضر رہی ہے اور جب تک میں زندہ ہوں وہ آپ کی خدمت کرتی رہے گی -''

(''گفتار اقبال'' ، ص ۱۰۵) -

حضور رسالت مآب ؐ میں حاضر ہوئے ہیں ۔[۶۲] دعا کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے :

اے تو ما بیچارگان را ساز و برگ
وارہان این قوم را از ترسِ مرگ

اس کے بعد اقبال مسلمانوں پر رسول کریم ؐ کے احسانات کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں :

این ہمہ از لطفِ بے پایانِ تست
فکر ما پروردۂ احسان تست

ذکرِ تو سرمایۂ ذوق و سرور
قوم را دارد بہ فقر اندر غیور

اے مقام و منزلِ ہر راہرو
جذبِ تو اندر دلِ ہر راہرو[۶۳]

---

۶۲ - اپنی نظم 'در حضور رسالت مآب ؐ' (''پس چہ باید کرد'' ، ص ۶۴) کی شان نزول اقبال نے یوں بیان کی ہے : ''شب سہ اپریل ۱۹۳۶ء کہ در دارالاقبال بھوپال بودم سید احمد خاں رحمۃ اللہ علیہ را در خواب دیدم ، فرمودند کہ از علالت خویش در حضور رسالت مآب ؐ عرض کن۔ ''

۶۳ - ''پس چہ باید کرد'' ، ص ۶۵ -

لیکن اب زمانے کی حالت یہ ہے کہ :

در عجم گردیدم و ہم در عرب
مصطفٰیؐ نایاب و ارزاں بولہب

اور اس کے فوراً بعد نئی نسل کی زبوں حالی کا تذکرہ شروع ہو جاتا ہے :

این مسلمان زادۂ روشن دماغ
ظلمت‌آبادِ ضمیرش بے چراغ

در جوانی نرم و نازک چون حریر
آرزو در سینۂ او زود میر

این غلام ابنِ غلام ابنِ غلام
حریت اندیشۂ او را حرام

مکتب از وے جذبۂ دین در ربود
از وجودش این قدر دانم کہ بود

این ز خود بیگانہ این مستِ فرنگ
نانِ جو می‌خواہد از دستِ فرنگ[۶۴]

---

۶۴ - ایضاً ، ص ۶۶ - یہی خیالات 'خلاصۂ مطالب مثنوی' ("اسرار و رموز" ، ص ۱۸۶) میں زیادہ وضاحت سے اور زیادہ دلکش شاعرانہ

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

نان خرید این فاقہ کش با جانِ پاک
داد ما را نالہہائے سوزناک

بہرِ یک نان نشترِ لا و نعم
منتِ صد کس برائے یک شکم

از فرنگی می‌خرد لات و منات
مومن و اندیشۂ او سومنات[۶۵]

ضمیر بے چراغ رکھنے والے روشن دماغ مسلمان زادہ کی حالت کا

(گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ)

انداز میں یوں بیان ہوئے ہیں :

علمِ غیر آموختی اندوختی
روئے خویش از غازہ اش افروختی

از نسیمش خاکِ تو خاموش گشت
و ز گل و ریحان تہی آغوش گشت

عقلِ تو زنجیریِ افکارِ غیر
در گلوئے تو نفس از تارِ غیر

بر زبانت گفتگوہا مستعار
در دلِ تو آرزوہا مستعار

قمریانت را نواہا خواستہ
سروہایت را قباہا خواستہ

بادہ می‌گیری بجام از دیگران
جام ہم گیری بوام از دیگران

۶۵ - ''پس چہ باید کرد''، ص ۶۶ -

بیان یہاں ختم ہو جاتا ہے - اس کے بعد دعا اور التجا کا شعر آتا ہے :

قم باذنی گوئے و او را زندہ کن
در دلش اللہ ہو را زندہ کن

اور چند شعروں کے بعد اس التجا میں وہی رقت آمیز دردمندی پیدا ہو جاتی ہے جس کے بغیر دعا کو شرف قبول و اجابت حاصل نہیں ہوتا :

گردِ تو گردد حریمِ کائنات
از تو خواہم یک نگاہِ التفات

ذکر و فکر و علم و عرفانم توئی
کشتی و دریا و طوفانم توئی

اے پناہِ من حریم کوئے تو
من بامیدے رسیدم سوئے تو

حریم کوئے محمد ؐ کو اپنی آرزوؤں کی پناہ گاہ ، اس کی نگاہ التفات کو سازِ حیات اور اس کی ناخدائی کو اپنی امیدوں کی کشتی کا سہارا سمجھنے والے اقبال نے جس تمنا کی بارآوری کے لیے اس بارگاہ لطف و کرم کا رخ کیا ہے وہ یہ ہے کہ اس کے نفس کو پھر وہ سوز اور اس کے نغمے کو پھر وہ گداز ملے جو سوئی ہوئی نئی نسل

کو جگانے اور اس عہد کے گم کردہ راہ نوجوانوں کو منزل کی طرف لانے کے لیے ضروری ہے اس لیے کہ نئی نسل کا یہی فرزند ہے جو خود نگری اور خود آگہی کے مرحلوں سے گزر کر آسمانوں پر کمند ڈالنے کی خدمت انجام دے گا۔

(سہ ماہی اقبال ، لاہور ، اکتوبر ۱۹۷۱ع)

اقبال : تلاش عزلت اور احساسِ تنہائی

اقبال کی پہلے دور کی نظموں میں 'ایک آرزو' ایسی نظم ہے جس کا مزاج اور جس کی افتادِ طبع بین طور پر اقبال کی اس شاعری کے مزاج اور آہنگ سے مختلف ہے جس نے انسان کو زندگی سے نبرد آزما ہونے اور اس کی آگ میں جل کر اپنی ذات کو کندن بنانے کا سبق سکھایا ہے - اس نظم میں ہم اقبال کو ایک ایسے افسردہ دل اور غمگین انسان کے روپ میں دیکھتے ہیں جس کے لیے محفل سازی اور انجمن آرائی میں ذرا بھی لطف اور کیف باقی نہیں ، شورشوں اور ہنگاموں سے بھاگ کر وہ سکوت اور خاموشی کی آغوش میں پناہ لینے کا آرزو مند ہے - اسے عزلت کے وہ شب و روز عزیز ہیں جن میں اس کا دل فکر و غم کے کانٹوں کی خلش سے محفوظ اور آزاد ہو - اقبال نے اپنی اس آرزو کا اظہار جس سادگی و دلسوزی سے کیا ہے اس کے ایک ایک لفظ میں درد کی کسک اور تڑپ ہے اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ بات دل کی گہرائیوں سے نکلی ہے :

دنیا کی محفلوں سے اکتا گیا ہوں یا رب !
کیا لطف انجمن کا جب دل ہی بجھ گیا ہو

شورش سے بھاگتا ہوں دل ڈھونڈتا ہے میرا
ایسا سکوت جس پر تقریر بھی فدا ہو

مرتا ہوں خامشی پر ، یہ آرزو ہے میری
دامن میں کوہ کے اک چھوٹا سا جھونپڑا ہو

آزاد فکر سے ہوں ، عزلت میں دن گزاروں
دنیا کے غم کا دل سے کانٹا نکل گیا ہو

دنیا کی محفلوں سے اکتا جانے اور انجمن کی جلوہ سامانیوں میں لطف باقی نہ رہنے کی وجہ چوتھے شعر میں بیان ہوگئی ہے - دل کی فکریں اور اس کے آلام ''عزلت گزینی'' کی آرزو کا سبب بنے ہیں - لیکن یہ عزلت ایک خاص طرح کی عزلت ہے - اس عزلت ، خلوت یا تنہائی کی کیفیت شاعر کے نزدیک یہ ہونی چاہیے : ع

شرمائے جس سے جلوت ، خلوت میں وہ ادا ہو

جلوت کو شرما دینے والی اس خلوت کے لیے اقبال کے شاعرانہ تخیل نے جو سامان فراہم کیا ہے اس میں انسان کی جملہ حسیات کے لیے لطف ، انبساط کی کیفیت موجود ہے - چڑیوں کے چہچہوں میں سرود کی لذت ، چشمے کی شورشوں میں بربط کا آہنگ، ندی کے صاف پانی میں صف بستہ بوٹوں کی کھنچتی ہوئی تصویریں، کہسار کے نظارے کی دلفریبی اور اس کے مشاہدے کے لیے موجوں کی بےتابی ، آغوش زمین میں سوئے ہوئے سبزے کا حسن سادہ اور جھاڑیوں کے پس پردہ بہتے ہوئے پانی کی چمک دمک ، عروسِ شاخ گل کا آئینۂ آب کے روبرو ہونا ، پرتو مہر سے عروس شام کی حنا بندی ، قبائے گل پر جدول طلائی کی حاشیہ آرائی ، غنچۂ گل کی چٹک میں کسمی کے پیغام کی نوا اور ساغر گل میں جہاں نمائی کی ادا اس کنج عزلت کی خصوصیتیں ہیں -

حسن و نظارگی کی اس فضا میں اقبال کے جذبۂ خدمت گزاری نے کوئل کی صداؤں میں ، جو شاعر کے نزدیک صبح کی مؤذن ہے ، ہم نوائی کی لذت پائی ہے - اس پرسکون فضا میں دیر و حرم کی منت کشی سے آزاد ہو کر اس نے اپنی جھونپڑی کے روزن کو آمد صبح کا پیامی بنایا ہے اور ہنگام صبح کہ جب شبنم پھولوں کو وضو کرانے کی خدمت انجام دیتی ہے ، اپنے رونے سے وضو اور نالے سے دعا کا کام لیا ہے، سکوت صبح میں ان نالوں کو قافلۂ نجوم کا جرس بنتے سنا ہے اور تصور و خیال کی اس دنیا میں اپنے گریۂ صبح گاہی کو دردمندوں کے لیے اشک افشانی کا محرک اور غفلت شعاروں کی بیداری کا وسیلہ بنایا ہے -

'ایک آرزو' کا مطالعہ ہمارے دل میں کئی سوال پیدا کرتا ہے - شاعر کے دل میں کس غم کے کانٹے کی کھٹک ہے جس نے اسے زندگی کی شورشوں سے بھاگ کر عزلت میں زندگی بسر کرنے پر مائل کیا ہے ؟ کیا زندگی سے فرار کی خواہش کسی شکست خوردگی کے احساس کا نتیجہ ہے ؟ کیا محفلوں اور انجمنوں سے اس کا اُکتا جانا آدم بیزاری کی بنا پر ہے ؟ اور سب سے آخر میں یہ کہ کیا دامن کوہ میں پناہ لینے کی خواہش میں محض تخیل کی پیدا کی ہوئی خود فریبی کے بجائے کسی ایسے ارادے کو بھی دخل ہے جو عمل کی صورت اختیار کرنا چاہتا ہے؟ دوسرے اور تیسرے سوال کا جواب خود نظم کے اندر موجود ہے - شکست خوردہ انسان کے دل میں اس جوش ، اس ولولے اور اس امنگ کا پیدا ہونا ممکن نہیں کہ وہ اپنے نالوں کو اتنا بلند ہوتا ہوا دیکھ سکے کہ ان کی صدا تاروں کے قافلے کے لیے صدائے درا بن جائے اور اس میں امید اور آرزو کی یہ چنگاری روشن ہو کہ اس کے نالوں میں سوتے

ہوؤں کو جگانے کی قوت پیدا ہو جائے ۔ انسان کی خدمت کی لگن کا عکس نظم کے دوسرے شعروں میں بھی جلوہ فگن ہے :

راتوں کو چلنے والے رہ جائیں تھک کے جس دم
امید ان کی میرا ٹوٹا ہوا دیا ہو

بجلی چمک کے ان کو کٹیا مری دکھادے
جب آسماں پہ ہر سو بادل گھرا ہوا ہو

پہلے سوال کے جواب کی جستجو کی جائے تو خود اس نظم میں اس کی طرف ایک ہلکا سا اشارہ ملتا ہے ۔ تمام انسانوں کے لیے جو درد مندی اور ان کے کام آنے کی جو خواہش شاعر کے دل میں ہے اس نے اضطراری طور پر نظم کے مختلف شعروں میں جگہ پائی ہے اور اس لیے یہ سوچنے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ وہ انسان کی صحبت سے گریزاں ہے ، لیکن ان انسانوں میں سے کچھ ضرور ایسے ہیں جن کے طرز عمل سے اسے دکھ پہنچا ہے اور اسی طرز عمل نے اسے ان سے ترک تعلق پر آمادہ اور مائل کیا ہے ۔ چونکہ معاشرتی زندگی میں رہ کر ان سے لا تعلق ہو جانا ممکن نہیں اس لیے تخیل نے اسے عزلت و خلوت کی راہ دکھائی ہے ، لیکن عزلت و خلوت کی اس زندگی میں بھی وہ دل کو اس تلخی کے اثر سے آزاد نہیں کر سکا جو انسانوں کے اس مخصوص گروہ کے رویے کی پیدا کی ہوئی ہے ۔ یہ تلخی خواہ کنایے کے انداز میں سہی اس مصرعے میں صاف جھلکتی نظر آتی ہے : ع

کانوں پہ ہو نہ میرے دیر و حرم کا احساں

یہاں دیر و حرم کے پردے میں شکایت شیخ و برہمن سے کی گئی ہے جنھوں نے دنیا کی محفلوں اور انجمنوں میں ، مہر و محبت کی وہ فضا قائم نہیں رہنے دی جس میں انسانیت پروان چڑھتی ہے - اس تاویل کی تائید اقبال کی اسی دور کی کہی ہوئی دوسری نظموں سے ہوتی ہے -

سب جانتے ہیں کہ اقبال کی شاعری کا وہ دور جس میں 'ایک آرزو' لکھی گئی وطن سے ان کے والہانہ تعلق ، ربط اور نسبت کا دور ہے - اس دور میں کہی ہوئی کئی معروف و مقبول نظمیں جذبۂ حب وطن کی سرشاری میں ڈوبی ہوئی ہیں - انھی نظموں میں بعض ایسی ہیں جن میں دیر و حرم کے پاسبانوں کے نفاق‌انگیز طرز عمل کی طرف اشارہ ہے اور ایک نظم میں تو بات پوری طرح کھول کر کہہ دی گئی ہے :

سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو برا نہ مانے
تیرے صنم کدوں کے بت ہو گئے پرانے

اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا
جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے

تنگ آکے میں نے آخر دیر و حرم کو چھوڑا
واعظ کا وعظ چھوڑا ، چھوڑے ترے فسانے[1]

اب ذرا ''کانوں پہ ہو نہ میرے دیر و حرم کا احساں'' اور ''تنگ آکے میں نے آخر دیر و حرم کو چھوڑا'' کو ملا کر پڑھیے اور

---

۱ - 'نیا شوالہ'، 'بانگ درا'، ص ۸۸ -

پھر دیکھیے کہ اس دور کی کسک اور کس کس نظم میں ملتی ہے ۔ ''بانگ درا'' کے اسی دور کی ایک چھوٹی سی نظم 'صدائے درد' ہے :[۲]

جل رہا ہوں کل نہیں پڑتی کسی پہلو مجھے
ہاں ڈبو دے اے محیطِ آبِ گنگا تو مجھے

سرزمیں اپنی قیامت کی نفاق انگیز ہے
وصل کیسا یاں تو اک قربِ فراق آمیز ہے

بدلے یکرنگی کے یہ نا آشنائی ہے غضب
ایک ہی خرمن کے دانوں میں جدائی ہے غضب

جس کے پھولوں میں اخوت کی ہوا آئی نہیں
اس چمن میں کوئی لطفِ نغمہ پیرائی نہیں

لذتِ قربِ حقیقی پر مٹا جاتا ہوں میں
اختلاطِ موجہ و ساحل سے گھبراتا ہوں میں

ع جل رہا ہوں کل نہیں پڑتی کسی پہلو مجھے
ع لذت قربِ حقیقی پر مٹا جاتا ہوں میں
ع اختلاطِ موجہ و ساحل سے گھبراتا ہوں میں

---

۲ - ایضاً ، ص ۲۹ -

'صدائے درد' کے یہ تینوں مصرعے اور 'ایک آرزو' کا پہلا شعر[۳] مجھے سبب اور نتیجے کے تعلق میں منسلک دکھائی دیتے ہیں - 'صدائے درد' کے دو اور مصرعے بھی قابل توجہ ہیں :

ع اس چمن میں کوئی لطفِ نغمہ پیرائی نہیں

اور ع ہاں ڈبو دے اے محیطِ آبِ گنگا تو مجھے

پہلے مصرعے میں اُسی ذہنی کیفیت کا عکس ہے جو 'ایک آرزو' کے اس مصرعے میں ہے ع

کیا لطف انجمن کا جب دل ہی بجھ گیا ہو

اور دوسرا مصرع اقبال کے اس فطری اور جذباتی میلان کا مظہر ہے کہ مظاہر فطرت کی آغوش اقبال کے دل افسردہ کی کسک کا مرہم و مداوا ہے ، یہ فرق البتہ ہے کہ محیط آب گنگا میں غرق ہو جانے کی خواہش کا محرک غم و غصہ کی تلخ کیفیت ہے اور دامن کوہ میں جھونپڑا بنا لینے کی آرزو ایک رومان انگیز تخیل کی تخلیق -

'ایک آرزو' میں خار غم کی کھٹک کی طرف جو اشارہ ہے وہ 'نیا شوالہ' اور 'صدائے درد' کے اشعار میں محض اشارہ نہیں رہا - ان دونوں نظموں کے اشعار 'ایک آرزو' کے مبہم اشارے کی توضیح اور تفسیر بن کر سامنے آتے ہیں - اسی دور کی ایک اور نظم

---

۳ - دنیا کی محفلوں سے اُکتا گیا ہوں یا رب
کیا لطف انجمن کا جب دل ہی بجھ گیا ہو

'خفتگانِ خاک سے استفسار'[۴] میں اس اشارے کی توجیہہ و تاویل کرنے والے کو ایک اور سہارا ملتا ہے جس میں چار ابتدائی اشعار کے بعد یہ دو شعر آتے ہیں :

دل کہ ہے بیتابیِ الفت میں دنیا سے نفور
کھینچ لایا ہے مجھے ہنگامۂ عالم سے دور

منظرِ حرماں نصیبی کا تماشائی ہوں میں
ہم نشینِ خفتگانِ کنجِ تنہائی ہوں میں

ان شعروں کو پڑھ کر ذہن 'ایک آرزو' کے ابتدائی دو شعروں کی طرف منتقل ہوتا ہے :

دنیا کی محفلوں سے اکتا گیا ہوں یا رب
کیا لطف انجمن کا جب دل ہی بجھ گیا ہو

شورش سے بھاگتا ہوں دل ڈھونڈتا ہے میرا
ایسا سکوت جس پر تقریر بھی فدا ہے

اس مرتبہ اقبال کو یہ سکوت ، دامن کوہ کی خاموشی کے بجائے گور غریباں کے کنج تنہائی میں ملا ہے ، البتہ ہنگامۂ عالم سے دور بھاگنے کی تڑپ اور خفتگانِ کنجِ تنہائی کی ہم نشینی میں سکون حاصل کرنے کی خواہش اسی 'بیتابیِ الفت' کی پیدا کی ہوئی ہے جو وطن اور اہل وطن کے لیے اس کے دل میں ہے - یہ 'بیتابیِ

---

۴ - 'بانگ درا'، ص ۲۴ -

الفت' یقیناً اس بیتابی سے مختلف ہے جس کا ذکر اقبال کی شاعری کے ایک جذباتی دور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کیا گیا ہے[۵] اس لیے کہ اقبال کی زندگی کے اس دور میں اس رومان انگیز بیتابی کا کوئی سراغ نہیں ملتا ۔

'خفتگان خاک سے استفسار' میں اقبال نے خفتگانِ کنجِ تنہائی سے کچھ سوال ایسے کیے ہیں جن کے جواب کی جستجو میں انسان صدہا برس سے سرگرداں ہے؛ کچھ سوال ایسے ہیں جو خود ہماری تہذیبی ، معاشرتی ، اخلاقی اور ادبی زندگی کے پیدا کیے ہوئے ہیں اور کچھ ایسے جن کا تعلق اقبال کے مخصوص فکری رجحانات سے ہے ۔ لیکن مابعد الطبیعیاتی اور حکیمانہ نوعیت کے عمیق اور سنجیدہ سوالوں کے درمیان میں دو ایک سوال ایسے بھی آ گئے ہیں جن کا تعلق اقبال کے قریبی ماحول سے ہے اور وہ سوال وہی ہیں جن کی طرف کہیں مبہم اور کہیں واضح اشارے ہمیں اس دور کی دوسری نظموں میں ملتے ہیں ۔ وہ سوال ان دو شعروں میں پوچھے گئے ہیں :

واں بھی انساں اپنی اصلیت سے بیگانے ہیں کیا ؟
امتیازِ ملت و آئیں کے دیوانے ہیں کیا ؟

آہ ! وہ کشور بھی تاریکی سے کیا معمور ہے ؟
یا محبت کی تجلی سے سراپا نور ہے ؟

'ایک آرزو' کے مطالعے کے بعد دل میں پیدا ہونے والے جن سوالوں کی طرف میں نے اشارہ کیا تھا ان میں سے ایک سوال کا

---

۵ ۔ 'حیات اقبال کا ایک جذباتی دور، مقالہ پروفیسر محمد عثمان ، مشمولہ کتاب 'حیات اقبال کا ایک جذباتی دور'، لاہور ، ۱۹۶۳ء ۔

جواب ابھی باقی ہے - یعنی یہ کہ دامن کوہ کے سکوت میں پناہ لینے کی خواہش محض ایک شاعرانہ ترنگ کا نتیجہ ہے یا اس میں ارادے کو عملی صورت دینے کی نیت کو بھی کوئی دخل ہے ؟ اس سوال کا جواب بھی ''بانگ درا'' کے دور اول کی نظموں کے جستہ جستہ شعروں میں مل جاتا ہے - یہ جستہ جستہ شعر کسی نہ کسی انداز میں چند حقیقتیں ہمارے سامنے لاتے ہیں - ایک تو یہ کہ شاعر کے موجودہ ماحول میں اس کے لیے گھبراہٹ ، پریشانی اور افسردگی کے مختلف اسباب موجود ہیں - یہ گھبراہٹ ، پریشانی اور افسردگی اس کے دل میں اس ماحول سے گریزاں ہونے کی خواہش کو جنم دیتی ہے اور گریزاں ہو کر اگر اسے کہیں سکون ملتا ہے تو آغوش فطرت میں - پہلے کچھ شعر 'رخصت اے بزم جہاں'[6] ، کے سنیے :

رخصت اے بزمِ جہاں ! سوئے وطن جاتا ہوں میں
آہ ! اس آباد ویرانے میں گھبراتا ہوں میں

بسکہ میں افسردہ دل ہوں درخورِ محفل نہیں
تو مرے قابل نہیں ہے ، میں ترے قابل نہیں

گو بڑی لذت تری ہنگامہ آرائی میں ہے
اجنبیت سی مگر تیری شناسائی میں ہے

گھر بنایا ہے سکوتِ دامنِ کہسار میں
آہ ! یہ لذت کہاں موسیقیِ گفتار میں

---

۶ - 'بانگ درا' ص ۵۶ -

ہم‌نشینِ نرگسِ شہلا ، رفیقِ گل ہوں میں
ہے چمن میرا وطن ، ہمسایۂ بلبل ہوں میں

شام کو آواز چشموں کی سلاتی ہے مجھے
صبح فرشِ سبز سے کوئل جگاتی ہے مجھے

بزمِ ہستی میں ہے سب کو محفل آرائی پسند
ہے دلِ شاعر کو لیکن کنجِ تنہائی پسند

طعنہ زن ہے تو کہ شیدا کنجِ عزلت کا ہوں میں
دیکھ اے غافل ! پیامی بزمِ قدرت کا ہوں میں

عاشقِ عزلت ہے دل ، نازاں ہوں اپنے گھر پہ میں
خندہ زن ہوں مسندِ دارا و اسکندر پہ میں

'رخصت اے بزم جہاں' کا تصور ایمرسن سے ماخوذ ہے ، لیکن اقبال کا اس تصور کو اپنانا اور اسے اپنے مخصوص شاعرانہ اسلوب کے سانچے میں ڈھالنا اس بات کا غماز ہے کہ انگریزی کی نظم میں انھیں اپنے احساس کا عکس نظر آیا اور اپنے دل کی دھڑکن سنائی دی ہے ۔ اس نظم کے جو جستہ جستہ شعر پیش کیے گئے ہیں ان میں سے زیادہ تر اسی کیفیت کے ترجمان ہیں جو 'ایک آرزو' کے پورے پیکر میں سمائی ہوئی ہے : دل کی افسردگی ، محفل‌سازی اور ہنگامہ آرائی سے طبیعت کا اجتناب ، سکوت دامن کہسار میں نرگس کی ہم نشینی اور گل کی رفاقتوں کی لذت ، چشموں کی آواز میں لوریوں کی گنگناہٹ اور نوائے بلبل میں ہم نوائی کی یگانگت ، وہی

سب چیزیں ہیں جن کی بدولت 'ایک آرزو' اقبال کے جذبات و احساسات کا آئینہ بنی ہے ، لیکن اس نظم میں اس کے علاوہ بھی ایک بات ہے اور اس ایک بات میں رمز کے دو ایک پہلو بھی ہیں۔ شاعر نے علی الاعلان یہ بات ہم تک پہنچا دی ہے کہ بزم ہستی میں سب کو تو محفل آرائی پسند ہے ، لیکن دل شاعر کنج تنہائی کا شیدائی ہے ۔ یوں گویا کنج تنہائی میں زندگی بسر کرنے کی آرزو بلاشرکت غیرے صرف شاعر کے دل کی آرزو ہے ۔ شاعر نے محفل آرائی کو ''سب'' کے لیے مخصوص کرکے کنج تنہائی کو اپنی ذاتی ملکیت بنا لیا ہے اور وہ بڑے فخریہ انداز میں یہ بات بیانگ دہل لوگوں سے کہہ رہا ہے کہ دیکھو تمھاری اور میری پسند میں کتنا فرق ہے ۔ تمھاری پسند تمھاری محرومی اور میری پسند میری خوش بختی ہے اور اس خوش بختی کا رمز اور راز یہ ہے کہ کنج عزلت کا عاشق و شیدائی بن کر مجھے بزم قدرت کی پیامبری کا شرف حاصل ہوا ہے ۔ رمز کا دوسرا پہلو جس کی طرف میں نے اشارہ کیا 'رخصت اے بزم جہاں' کے اس شعر میں ہے :

گو بڑی لذت تری ہنگامہ آرائی میں ہے
اجنبیت سی مگر تیری شناسائی میں ہے

بزم جہاں کے آباد ویرانے کی ہنگامہ آرائی سے دل لگا کر شاعر نے یہ نتیجہ نکالا کہ اس شناسائی میں ایک طرح کی اجنبیت ہے ۔ یوں گویا اس نے درپردہ اس بات کا اعتراف بھی کیا کہ جو دنیا اس نے سکوت دامن کہسار میں جا کر آباد کی ہے دوست داری اور یگانگت کی صحیح لذت اسی میں ہے اور یہاں کے مکینوں سے شاعر کا رشتہ ہمسائیگی کا بھی ہے اور ہم نشینی اور رفاقت کا بھی :

ہم‌نشینِ نرگسِ شہلا ، رفیقِ گل ہوں میں
ہے چمن میرا وطن ، ہمسایۂ بلبل ہوں میں

فطرت کے حسین و جمیل اور دلکش و دل‌نواز مظاہر و مناظر کے ساتھ اقبال کی رفاقت و آشنائی کے ایک رشتے میں نہ جانے کتنے رنگ و آہنگ ہیں ۔ اس رشتے کی نوعیت بہ یک وقت جمالیاتی اور روحانی بھی ہے اور جذباتی اور فکری بھی ۔ جمالیاتی ، روحانی ، جذباتی اور فکری قرب و یگانگت کے ان گوناگوں رشتوں کے رنگ و آہنگ 'ہمالیہ' کے اس شعر سے شروع ہوتے ہیں :

چھیڑتی جا اس عراقِ دل‌نشیں کے ساز کو
اے مسافر! دل سمجھتا ہے تری آواز کو[۷]

اور اُبھرنے اور نکھرنے کے بے شمار مرحلے طے کرتے ہوئے "بالِ جبریل" کے اس شعر تک پہنچتے ہیں :

عروسِ لالہ مناسب نہیں ہے مجھ سے حجاب
کہ میں نسیمِ سحر کے سوا کچھ اور نہیں

---

۷ ۔ یہ شعر جیسا کہ معلوم ہے نظم 'ہمالیہ' کے اس بند کی ٹیپ کا شعر ہے :

آتی ہے ندی فرازِ کوہ سے گاتی ہوئی
کوثر و تسنیم کی موجوں کو شرماتی ہوئی
آئنہ سا شاہدِ قدرت کو دکھلاتی ہوئی
سنگِ رہ سے گاہ بچتی گاہ ٹکراتی ہوئی
چھیڑتی جا اس عراقِ دل نشیں کے ساز کو
اے مسافر دل سمجھتا ہے تری آواز کو

''بانگ درا'' کی مختلف نظموں کے حوالے سے میں نے اقبال کی خلوت پسندی اور عزلت گزینی کی جس آرزو کا تجزیہ کیا اُس میں بہت سی چیزیں سامنے آئیں - خلوت پسندی اور عزلت گزینی کی مخصوص نوعیت ، اس آرزو کی تخلیق کے اسباب و عوامل ، ان اسباب و عوامل کے پیچھے چھپے ہوئے جمالیاتی ، جذباتی اور فکری عناصر اور ان عناصر کی تشکیل و تعمیر میں اقبال کے ذاتی رجحانات اور مناظرِ فطرت کی رنگینیوں کی باہمی رفاقت - لیکن یہ بات اس تجزیے میں جاری و ساری ہے کہ اقبال کی عزلت گزینی تنہائی کے احساس کی پروردہ ہرگز نہیں - عزلت پسندی کے اور خواہ کتنے ہی اسباب ہوں ، احساس تنہائی اس کا سبب نہیں ، اس لیے کہ مظاہرِ فطرت کے قرب نے غم ، افسردگی اور مایوسی کے عالم میں تنہائی کا احساس پیدا نہیں ہونے دیا اور ''بانگ درا'' کی نظموں سے الگ ہٹ کر ، خصوصاً فارسی کی نظموں میں ، اسی احساس کی خلش سب سے نمایاں ہے - اس نقطۂ نظر سے فارسی نظموں کا مطالعہ کیا جائے تو پڑھنے والے کے ذہن پر سحرزدگی اور طلسم کشائی کی کیفیت طاری ہوتی ہے ، لیکن اس کی ایک ہلکی سی جھلک ''بانگ درا'' کے دور اول کے بعض مصرعوں میں بھی نظر آ جاتی ہے - 'نالۂ فراق'[۸] کے دو شعر ہیں :

کشتۂ عزلت ہوں ، آبادی میں گھبراتا ہوں میں
شہر سے سودا کی شدت میں نکل جاتا ہوں میں

---

۸ - یہ نظم اقبال نے ۱۹۰۴ء میں اپنے شفیق استاد آرنلڈ کے انگلستان چلے جانے کے بعد اُن کی جدائی کے غم میں لکھی (بحوالہ ''ذکر اقبال'' از عبدالمجید سالک ، ص ۴۲) -

یادِ ایام سلف سے دل کو تڑپاتا ہوں میں
بہرِ تسکیں تیری جانب دوڑتا آتا ہوں میں[۹]

یہ پہلی نظم ہے جس میں اقبال نے کسی دوست کی جدائی کے غم میں آبادی کو چھوڑ کر تنہائی کی آغوش میں پناہ لی ہے ، یا یوں کہیے کہ آبادی میں رہتے ہوئے بھی خود کو تنہا محسوس کیا ہے - گو یہ بات صاف لفظوں میں نہیں کہی گئی ، لیکن اس نظم کے فوراً بعد ''بانگ درا'' میں ایک نظم ہے 'چاند'[۱۰]، جس میں بزم میں رہتے ہوئے بھی تنہا ہونے کے احساس والی بات زیادہ صاف لفظوں میں کہہ دی گئی ہے :

انجمن ہے ایک میری بھی جہاں رہتا ہوں میں
بزم میں اپنی اگر یکتا ہے تو ، تنہا ہوں میں

''بانگ درا'' کے دوسرے دور کی شاعری اقبال کے قیام یورپ کے زمانے اور اس قیام کے پیدا کیے ہوئے تأثرات کی شاعری ہے اور اس دور میں بھی شاعر نے مظاہر فطرت کے ساتھ ذہنی رفاقت کا رشتہ قائم رکھا ہے ، اس فرق کے ساتھ کہ اس دور کی نظموں میں غم کے ذکر میں اضطراب کی وہ خلش نہیں جو پہلے دور میں ہے - اس لیے یہاں غم کی صدا ، ایک صدائے خاموش ہے ، بالکل اسی طرح جیسے منظر کے حسن و جمال میں سے ابھرنے اور فضا پر چھا جانے والے نغموں کی سریلی لے دھیمی بھی ہے - شب غم کی تنہائی میں شاعر کو انجم کی ہم نشینی میسر ہے اور قدرت نے اس کے دل

---

۹ - 'نالۂ فراق'، ''بانگ درا''، ص ۷۴ -
۱۰ - ایضاً ، ص ۷۶ -

کے ساتھ ہم نفسی کا رشتہ استوار کیا ہے - اس احساس میں کتنا سکون ہے ، کتنی لذت ہے اور کتنا سرور و انبساط ، اس کا اندازہ اس دور کی دو چھوٹی چھوٹی نظمیں سن کر لگائیے - پہلی نظم کا عنوان ہے 'ایک شام" (دریائے نیکر کے کنارے)' :

خاموش ہے چاندنی قمر کی
شاخیں ہیں خموش ہر شجر کی

وادی کے نوافروش خاموش
کہسار کے سبز پوش خاموش

فطرت بےہوش ہو گئی ہے
آغوش میں شب کے سو گئی ہے

کچھ ایسا سکوت کا فسوں ہے
نیکر کا خرام بھی سکوں ہے

تاروں کا خموش کارواں ہے
یہ قافلہ بےدرا رواں ہے

خاموش ہیں کوہ دشت و دریا
قدرت ہے مراقبے میں گویا

اے دل! تو بھی خموش ہو جا
آغوش میں غم کو لے کے سو جا

---

١١ - ایضاً ، ص ١٣٦ -

دوسری نظم 'تنہائی'[12] میں سکوت کا یہ افسوں اور بھی زیادہ لوریوں کی آغوش میں سلا دینے والا ہے :

تنہائیِ شب میں ہے حزیں کیا ؟
انجم نہیں تیرے ہم‌نشیں کیا ؟

یہ رفعتِ آسمانِ خاموش
خوابیدہ زمیں ، جہانِ خاموش

یہ چاند ، یہ دشت و در ، یہ کہسار
فطرت ہے تمام نسترن‌زار

موتی ، خوش رنگ ، پیارے پیارے
یعنی ، ترے آنسوؤں کے تارے

کس شے کی تجھے ہوس ہے اے دل!
قدرت تری ہم‌نفس ہے اے دل !

اس دور کی ایک اور نظم کے دو شعروں کے بعد اس حکایت لطیف کا ایک حصہ ختم ہو گا ۔ 'فراق'[13] ایک اور مختصر سی نظم ہے ، اس کا ایک شعر عزلت ، خلوت اور تنہائی کی اس داستان کی زینت بن سکتا ہے ۔ نظم اس شعر سے شروع ہوتی ہے :

---

۱۲ - ایضاً ، ص ۱۳۷ -

۱۳ - ایضاً ، ص ۱۳۹ -

تلاشِ گوشۂ عزلت میں پھر رہا ہوں میں
یہاں پہاڑ کے دامن میں آ چھپا ہوں میں

لیکن جس شعر کی طرف میرا اشارہ ہے وہ یہ ہے :

سکوتِ شامِ جدائی ہوا بہانہ مجھے
کسی کی یاد نے سکھلادیا ترانہ مجھے

بات صرف یہ ذہن نشین کرنے کی ہے کہ یہاں سکوت شام جدائی ، اشک افشانی کا نہیں نغمہ سنجی کا محرک بنا ہے ۔

شراب علم کی لذت طلب نے اقبال کو وطن کے نگارخانے سے کھینچ کر[١٣] حیرت کدۂ مغرب میں پہنچا دیا اور وہاں کی علمی اور مجلسی زندگی میں اُن کے قلب و ذہن کے لیے شعور و احساس کے نئے نئے افق کھلے ۔ سیاسی ، معاشرتی ، تہذیبی اور علمی فضا کے مطالعے ، مشاہدے اور تجربے نے اُن کے فکر ، احساس اور جذبے کی دنیا میں ایک ہلچل مچا دی ۔ تجسس و تفحص کی جو چنگاری اُن کے سینے میں ہمیشہ سے روشن تھی وہ بھڑک کر شعلہ بنی اور اُس کی آتش سوزاں میں زندگی کے سارے بنے بنائے تصورات خاکستر ہو کر رہ گئے ۔ اپنے ملک میں رہ کر وطن پرستی کا جو جذبہ پروان چڑھ کر نس نس میں سما گیا تھا ، یورپ کے سیاسی ماحول میں طلسم و فریب نظر آنے لگا اور اس کی جگہ آہستہ آہستہ

---

١٣ - ''التجائے مسافر''، ''بانگ درا'' (ص ٩٧) کے اس شعر کی طرف اشارہ ہے :

چلی ہے لے کے وطن کے نگارخانے سے
شرابِ علم کی لذت کشاں کشاں مجھ کو

عالمگیر انسانی برادری کے تصور نے لے لی - تصوف اور اس کی تاریخ کے غائر مطالعے نے یہ راز منکشف کیا کہ جس تصوف کی آغوشِ تربیت میں انھوں نے آنکھیں کھولیں اور پرورش پائی ہے اس کا حقیقی اسلام سے دور کا بھی واسطہ نہیں - یہ تصوف افیون کے نشے کی طرح جسد اسلامی میں سرایت کرتا رہا اور بالآخر اس نے پوری ملت اسلامیہ کو سکر میں مبتلا کر دیا - مسلمانوں کے عملی قویٰ مضمحل ہوگئے اور قانون فطرت نے انھیں ذلت و خواری کے غار میں جا دھکیلا - مغربی سیاست کے استحصال نے ان کی معیشت کو مفلوج کیا اور مغربی تہذیب کی چمک دمک نے ان کی نظروں کو خیرہ کیا اور اس کی معاشرتی زندگی مغرب کے لائے ہوئے طلسموں میں گرفتار ہو گئی - فقر غیور کا جسم اطلس و کمخواب میں ملبوس ہو کر چنگ و رباب کی تال پر رقص کرنے کا عادی ہو گیا - مسلمان کی زندگی کی اس زبوں حالی نے اقبال کے احساس پر تازیانے کا کام کیا اور انھوں نے مسلمانوں کے لیے زندگی کا کوئی لائحۂ عمل مرتب کرنے کو اپنا فکری اور شاعرانہ منصب سمجھ کر فکر کی ایک نئی راہ پر گامزن ہونے کا تہیہ کر لیا -

اقبال فکر اور احساس کا یہ اضطراب لے کر تین سال بعد یورپ سے ہندوستان آئے ، لیکن یورپ کی مجلسی زندگی میں حسن و جمال کے قرب اور وہاں کے مناظر کی دلکشی نے اقبال کی جذباتی دنیا کو جس نئی لذت ، نئے کیف ، نئے خمار اور نئی سرخوشی سے دوچار کیا تھا اس کا ہیجان بھی فکر اور احساس کے اضطراب سے کسی طرح کم نہیں تھا اور جسم و جان پر چھا جانے اور رگوں میں مسلسل گردش کرنے والے اضطراب نے انھیں اتنا تڑپایا کہ آہ نیم شبی اور گریۂ سحرگاہی ان کا معمول بن گیا - یہ اضطراب جیسا کہ اقبال کی کہی ہوئی بعض باتوں سے ظاہر ہے تمناؤں کے

اس ہجوم کا نتیجہ ہے جس کا تجزیہ خود اقبال کے لیے بھی ممکن نہیں - اضطراب اور ذہنی بے بسی کے اسی عالم میں وہ ۹ نومبر ۱۹۱۱ع کے ایک خط[۱۵] میں لکھتے ہیں :

معلوم نہیں روح کیا چاہتی ہے اور آنکھوں کو کس نظارے کی ہوس ہے - میں ایک زبردست تمنا کا احساس اپنے دل میں کرتا ہوں ، گو اس تمنا کا موضوع مجھے اچھی طرح معلوم نہیں - ایسی حالت میں مجھے مسرت[۱۶] بھی ہو تو اس میں اضطراب کا عنصر غالب رہتا ہے -[۱۷]

اس خط سے تقریباً دو سال پہلے کے ایک خط[۱۸] میں اپنی ذہنی کیفیت کا حال بیان کرتے ہوئے اقبال نے لکھا تھا کہ :

بلا شبہ ہر شخص کے لیے زندگی موت کے انتظار کا نام ہے - میں بھی اگلے جہان کی سیر کا آرزومند ہوں - وہاں پہنچ کر چاہتا ہوں کہ اپنے خالق کی زیارت کروں اور اس سے خواہش کروں کہ میری ذہنی کیفیت کی عقلی وضاحت کی جائے اور یہ کوئی آسان کام نہ ہو گا - مجھ سے آپ کو شکایت نہ ہونی چاہیے - میں خود اپنے لیے بھی ایک معمہ ہوں -[۱۹]

یہی بات (یعنی اپنی ذات کے خود اپنی نظر میں معمہ ہونے والی

---

۱۵ - 'بنام اکبر الہ آبادی'، ''اقبال نامہ''، ص ص ۳۷ و ۳۸ -
۱۶ - یہاں جس مسرت کا ذکر ہے وہ ترکوں کی فتح کے مژدۂ جانفزا کی ہے (ایضاً ، ص ۳۷) -
۱۷ - عبارت 'خط بنام اکبر الہ آبادی' ایضاً ، ص ص ۳۷ و ۳۸ -
۱۸ - خط مورخہ ۱۷ جولائی ۱۹۰۹ع بنام عطیہ فیضی ، ایضاً ، ص ۱۲۳ -
۱۹ - عبارت 'خط بنام عطیہ فیضی'، ایضاً -

بات) اسی زمانے میں لکھے ہوئے ایک اور خط میں بھی کہی گئی ہے ۔[۲۰]

اضطراب اور بے چینی کی اس حالت میں کہ دل مضطرب کو اضطراب اور بے چینی کا تجزیہ کرنے اور اس کے اسباب تک رسائی حاصل کرنے میں بھی دشواری پیش آ رہی ہو ، انسان کسی رفیق کی جستجو کرتا ہے ، جو اس کی روح میں ڈوب کر اس کی بے چینیوں کا سراغ لگا سکے اور ان بے چینیوں میں شریک ہو کر روح کے بوجھ کو ہلکا کر سکے ۔ اقبال کو اسی رفیق اور دمساز کی تلاش ہے اور وہ انھیں نہیں ملتا ۔ کہیں دور سے کوئی ایسی آواز سنائی دے جاتی ہے جس سے ہم نوائی کی آرزو کی جا سکے تو اقبال اس کی طرف لپکتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اپنا دل اس کے سامنے چیر کر رکھ دیں کہ انھیں اس اضطراب کی اور اس بےتابی کی داد مل سکے جس سے ان کی روح تڑپ رہی ہے ۔ انھیں ہمدرد کی نہیں درد آشنا کی ضرورت ہے جو درد بانٹ کر نہیں ، صرف اس کے معنی سمجھ کر روح کا بار ہلکا کر سکے ۔ وہ یہ بات محسوس بھی کرتے ہیں اور اس کے اظہار کی جرأت بھی رکھتے ہیں ۔ ۹ اپریل ۱۹۰۹ع کے لکھے ہوئے خط میں ایک جگہ یہ الفاظ آئے ہیں :

''میں ہمدردی کا طالب نہیں ، میں تو اپنی روح سے وہ بار ہلکا کرنا چاہتا تھا جس کے نیچے وہ دبی چلی جا رہی ہے ۔''[۲۱]

---

۲۰ ۔ یہ خط بھی اقبال نے لاہور سے ۳۰ مارچ ۱۹۱۰ع کو عطیہ فیضی کو لکھا تھا ۔ خط کی متعلقہ عبارت یہ ہے : ''میں تو خود اپنے لیے بھی ایک معمہ ہوں لیکن

ع وہ راز ہوں کہ زمانے پہ آشکار ہوں میں''

۲۱ ۔ عبارت 'خط بنام عطیہ فیضی' محررہ ۹ اپریل ۱۹۰۹ع مشمولہ ''اقبال نامہ' ، حصہ دوم ، ص ۱۰۹ ۔

لیکن دور بیٹھ کر زبان قلم سے نکلے ہوئے درد و غم کی داستانیں سننے والے بھلا شرکت غم کا حق کہاں تک ادا کریں اور جب یہ حق ادا نہ ہو تو بھری دنیا میں رہتے ہوئے بھی تنہائی کے احساس سے دل کیوں خون نہ ہو ؟ اقبال کا غم اسی تنہائی اور اسی احساس تنہائی کی شدت کا پیدا کیا ہوا غم ہے - ٦ اکتوبر ۱۹۱۱ع کے لکھے ہوئے ایک خط[۲۲] میں تنہائی کے اس کرب کی حالت یوں بیان ہوئی ہے :

لاہور ایک بڑا شہر ہے ، لیکن میں اس ہجوم میں تنہا ہوں - ایک فرد بھی ایسا نہیں جس سے دل کھول کر اپنے جذبات کا اظہار کیا جا سکے :

طعنہ زن ہے ضبط اور لذت بڑی افشا میں ہے
ہے کوئی مشکل سی مشکل رازداں کے واسطے[۲۳]

اس خط میں جن جذبات کی طرف اشارہ ہے ، قیاس کہتا ہے کہ غم و اندوہ کے جذبات ہیں جن کا ذکر بڑے غم انگیز انداز میں ۱۷ اپریل ۱۹۰۹ع کے لکھے ہوئے ایک خط[۲۴] میں ہوا ہے :

میرا سینہ یاس‌انگیز اور غم‌انگیز خیالات کا خزینہ ہے - یہ خیالات میری روح کی تاریک بانبیوں میں سے سانپ کی طرح نکلے چلے آتے ہیں - میرا خیال ہے میں ایک دن سپیرا بن جاؤں گا ، گلیوں میں پھروں گا اور تماش بین لڑکوں کی ایک بھیڑ میرے پیچھے پیچھے ہو گی -[۲۵]

---

۲۲ - 'خط بنام اکبر الہ آبادی'، ایضاً ، ص ۳۵ -
۲۳ - عبارت خط محولہ بالا -
۲۴ - ''خط بنام عطیہ فیضی'' ایضاً ، ص ۱۳۱ -
۲۵ - عبارت خط محولہ بالا -

ان یاس انگیز خیالات کا ، ان خیالات سے پیدا ہونے والے روحانی اضطراب کا ، اس اضطراب کے پیچھے چھپی ہوئی تمناؤں کا تجزیہ اقبال کے اپنے الفاظ میں ، خود اُن کے لیے بھی دشوار ہے اور صاحب دل کا وجود نہیں جس سے خون تمنا کا قصاص ملنے کی امید ہو ، اس لیے دل خود اپنے آپ کو اپنا رفیق ، دمساز ، ہمراز اور ہمدرد سمجھ کر اپنے آپ سے باتیں کرتا ہے اور یوں باتوں باتوں میں ان آرزوؤں کا سراغ ملتا ہے جن کی تکمیل کا دوسرا نام زندگی ہے - اقبال کی اس دور کی نظموں میں 'شکوہ'، 'جواب شکوہ' اور 'شمع اور شاعر' اس دور کے اضطراب کے ایک رخ سے پردہ اٹھاتی ہیں - اضطراب کے دوسرے رخ کی جھلک شاید اقبال کی اُن نظموں میں نظر آ جاتی ہے جنھیں اقبال نے ''ایک دل خونچکاں کی نواہائے غم'' کہا ہے اور پرائیویٹ نوعیت کی حامل نظمیں قرار دے کر اُن کے ناقابل اشاعت ہونے کا فتویٰ صادر کیا ہے -[۲۶] لیکن جس چیز کو میں برابر اقبال کا احساس تنہائی کہتا چلا آیا ہوں اس کا بڑا دل آویز مرقع اقبال کی وہ دعا ہے[۲۷] ، جو بارگاہ رب العزت میں دل کی ویرانی و ناشادی کے عالم میں کی گئی ہے :

باز تسکینِ دلِ ناشاد شو
باز اندر سینہہا آباد شو[۲۸]

۱۵ شعروں کے تمہیدی بند کے بعد اقبال اپنی خدمات کی طرف شاعرانہ اشارے کرتے ہیں جن کی بجا آوری میں انھوں نے خود کو شمع کی

---

۲۶ - تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو عطیہ فیضی کے نام اقبال کا خط ، ایضاً ، ص ۱۴۸ -

۲۷ - ملاحظہ ہو : ''اسرار خودی''، ص ص ۸۶ تا ۹۰ -

۲۸ - ایضاً ، نظم 'دعا' کا تیسرا شعر ، ص ۸۶ -

طرح جلایا ہے - اپنے اشکوں سے گلشن کی آبیاری کر کے اسے گل بداماں بنایا ہے اور اپنے دیدۂ دل کی بصیرت و نظر افروزی سے ماضی اور مستقبل کے رشتے استوار کیے ہیں ، لیکن ان کی اپنی یہ حالت ہے کہ وہ زندگی کی انجمن میں تنہا رہ گئے ہیں :

درمیانِ انجمن تنہاستم[۲۹]

یوں کہنے کو ہر شخص بخیال خویش میرا دوست ہے ، لیکن دوستی کے ان دعویداروں میں ایسا کوئی بھی نہیں جس نے میرے اندر جھانک کر میرے دل میں چھپے ہوئے بھیدوں کا پتا چلانے کی کوشش کی ہو--اے اللہ! بتا کہ دنیا میں میرا ندیم کہاں ہے ؟ میں کہ نخل سینا ہوں ، میرا کلیم کون ہے ؟ میں ظالم ہوں اور میں نے خود پر ظلم کیے ہیں اور میں نے اپنے سینے میں ایک شعلے کی پرورش کی ہے ، ایسا شعلہ جس نے میرا سامان عیش لوٹ لیا اور ایسا شعلہ جس نے دامن ہوش میں آگ لگا دی - اے اللہ! یہی شعلہ ہے جس نے عقل کو دیوانگی کا سبق سکھایا اور یہی شعلہ ہے جس نے علم کو برگ و ساز ہستی سے بیگانہ کیا - آفتاب اسی شعلے کی گرمی سے گردوں مقام بنا اور بجلیاں اسی کی تابانی کی بدولت مسلسل گردش میں مبتلا ہیں - باری تعالیٰ! مجھے دیکھ کہ میں نے شبنم کی طرح اپنی ہستی کو مجسم دیدۂ گریاں بنا لیا کہ اندر کی چھپی ہوئی آگ کی امانت داری کا حق ادا ہو سکے - میں نے شمع کو سوز عیاں کی تعلیم دی ، لیکن دنیا کی نظر سے دور خود اندر ہی اندر جلتا رہا ، یہاں تک کہ میرے ہر بن مو سے شعلے لپکے اور میری رگ اندیشہ سے آگ خون کے ٹکڑوں کی طرح ٹپکی - میرے مولیٰ! میں کہ گلشن ہستی میں ایک بلبل کی طرح ہوں ،

---

۲۹ - ایضاً ، ص ۸۷ -

میں چنگاریوں کے دانے چنتا رہا کہ نغمۂ آتشیں کی تخلیق اور پرورش اسی طرح ہو سکتی تھی - لیکن بار الٰہا! میری ان ساری کوششوں کے باوجود عصر حاضر کا سینہ دل سے خالی ہے اور اب مجھ میں ضبط و تحمل کا چارہ نہیں ، (آخر کب تک ، اے میرے مولا ! کب تک ؛)[۳۰] شمع کے لیے یوں تنہا جلتے رہنا آسان نہیں کہ اُس کے پروانوں میں سے ایک بھی جلنے کا اہل نہیں ، (پھر تو ہی بتا میرے آقا!)[۳۱] میں کب تک اپنے غمگسار کا منتظر رہوں ؟ اور کب تک اپنے رازدار کی جستجو میں سرگردانی کروں ؟

شمع را تنہا تپیدن سہل نیست
آہ یک پروانۂ من اہل نیست

انتظارِ غمگسارے تا کجا ؟
جستجوئے رازدارے تا کجا ؟

اس لیے اے میرے مولیٰ کہ مہ و انجم تیری ذات کے پرتو سے روشن ہیں ، اپنی اس آگ کو جو تونے میری جان و روح میں جلائی ہے ، واپس لے لے - یا تو تو اپنی دی ہوئی امانت واپس لے یا مجھے میرے ہمدم دیرینہ کی دمسازی عطا کر - اے قادر مطلق ! (تونے اپنی ہر مخلوق کو ہمدم و ندیم کی رفاقت سے سرفراز کیا ہے، پھر مجھے ہمدم و ندیم کیوں عطا نہیں ہوتا؟)[۳۲] سمندر کی موج کو

---

۳۰ - یہ جملہ میں نے اس تأثر کے اظہار کے لیے بڑھایا ہے جو اقبال کی فریاد سن کر دل میں پیدا ہوتا ہے -
۳۱ - یہ اضافہ بھی میرا اپنا ہے -
۳۲ - یہ عبارت بھی میرا اپنا اضافہ ہے -

موج کی رفاقت میسر ہے اور اس ہمدم کی ہمدمی میں اس نے تڑپ کو اپنی عادت بنایا ہے - آسمان پر ستارہ ستارے کا ندیم ہے ، ماہ تاباں کے سر کو زانوئے شب کا تکیہ حاصل ہے ، دن پہلوئے شب میں زندگی بسر کرتا ہے ، اور امروز فردا کے ساتھ ہم رشتہ ہے ، جوئے رواں کی ہستی ایک دوسری جوئے رواں میں گم ہو جاتی ہے اور موج باد خوشبوؤں کی صحبتوں سے فیض یاب ہے ، ویرانے کے ہر گوشے میں رقص برپا ہے اور دیوانے دیوانوں کے ساتھ ہم رقص ہیں - (اور اے میرے معبود ! کہاں تک بتاؤں حد یہ ہے کہ)[۳۳] اگرچہ تو خود اپنی ذات میں یکتا ہے لیکن تونے اپنے لیے بزم عالم آراستہ کی اور (میرا حال یہ ہے کہ) میں لالۂ صحرا کی مانند یکہ و تنہا ہوں ، میں محفل میں ہوتے ہوئے بھی اکیلا ہوں:

من مثالِ لالۂ صحراستم
درمیانِ محفلے تنہاستم[۳۴]

اے اللہ مجھے بھی از راہ لطف و کرم ایک رفیق ، ایک ہمدم عطا کر ، ایسا رفیق اور ایسا ہمدم جو میری فطرت کے رموز سے آگاہ و باخبر ہو :

خواہم از لطفِ تو یارے ہمدمے
از رموزِ فطرتِ من محرمے
ہمدمے دیوانۂ فرزانۂ
از خیالِ این و آن بیگانۂ[۳۵]

---

۳۳ - میرا اضافہ -
۳۴ - ''اسرار خودی'' ، ص ۸۹ -
۳۵ - ایضاً ، ص ص ۸۹-۹۰ -

دعا کا ایک ایک شعر اور شعر کا ایک ایک لفظ اس اضطراب کا غماز ہے جس میں اقبال کے جان و روح مبتلا ہیں - جس اضطراب کے تجزیے سے اقبال کے منطقی مزاج اور حکیمانہ فطرت نے عاجزی و بے بسی ظاہر کی تھی اس کا حق ان کی شاعرانہ افتاد طبع نے ادا کیا اور یوں اضطراب کا پورا نقش بھی ابھر کر سامنے آ گیا اور اضطراب کے اسباب کی نشان‌دہی بھی ہوگئی - اقبال کی زندگی کا ایک اضطراب وہ تھا جس میں انھیں ہر دم مظاہر فطرت کی رفاقت و ہمدمی حاصل تھی - اضطراب کی اس حالت میں ان کے تخیل نے ہمیشہ انھیں کنج عزلت کی وادیوں میں لے جا کر اضطراب کے لیے سامان سکون مہیا کیا - لیکن موجودہ اضطراب، جس کی عقلی توجیہ خود اقبال کے لیے بھی ممکن نہیں، نوعیت اور کیفیت میں زیادہ شدید اور زیادہ پیچیدہ ہے اور اس میں کوئل کی ہم نوائی[۳۶] ، انجم کی ہم نشینی[۳۷] اور قدرت کی ہم نفسی[۳۸] بھی مضطرب روح اور جان نا شکیبا کے سکون و راحت کا سبب نہیں بن سکتی - اس اضطراب میں اقبال کو کسی ایسے ہمدم اور کسی ایسے رازداں کی رفاقت اور ہمدمی کی ضرورت ہے جو غمگساری اور رازداری کے رموز سے آگاہ ہو - جو باطن کے نہاں خانوں میں جا کر اضطراب کے اسباب کا کھوج لگا سکے ، جسے اقبال کی طرح شمع عشق کا پروانہ بن کر خود کو خاکستر کردینے کی لذت سے آشنائی ہو ، جو این و آں کے خیال سے بیگانہ ہو کر حسب توفیق دیوانگی اور فرزانگی کی راہوں پر چل سکے ، جو اقبال کی ہو کو اپنی جان میں سمیٹ سکے، اس طرح کہ اقبال اس کے دل کے آئینے میں اپنی ذات کا جلوہ

---

۳۶ - 'ایک آرزو' کے ایک شعر کی طرف اشارہ -
۳۷ - نظم 'تنہائی' (''بانگ درا'' ، ص ۱۳۷) کے دو شعروں سے ماخوذ -
۳۸ - ایضاً -

دیکھ سکے - اقبال کے دل میں ایک ایسے صنم کی آرزو ہے جس کے آذر بھی وہ ہوں اور جس کے صنم بھی -[۳۹]

"اسرار خودی" کی یہ دلسوز دعا ان کی زندگی کے اس عہد کی یادگار ہے جب ان کے فکر ، احساس ، خیال اور جذبے کی دنیاؤں میں ، کسی حد تک ان واردات نے جن کا تعلق ان کی ذاتی اور نجی زندگی سے تھا اور بڑی حد تک ان کیفیات نے جو اپنے عہد کے انسان ، اپنے عہد کے مسلمان کی زندگی کے مطالعے اور مشاہدے کا نتیجہ تھیں ، شدید اضطراب پیدا کیا - اس اضطراب میں انھیں رفیقوں کے سہارے کی ضرورت تھی جو ان کے اضطراب میں پوری طرح ان کے شریک اور دمساز بن سکیں ایسے رفیق انھیں کبھی کبھی ملے بھی اور انھیں اقبال نے اپنے درد دل کا ساتھی بھی بنایا ، لیکن دل جس مستقل اور دائمی رفاقت کا آرزو مند تھا وہ انھیں میسر نہ آئی اور کرب اور مایوسی کے اس عالم میں ان کے سوز دل نے اپنی فریاد اس طرح اس فریاد رس تک پہنچانے کی کوشش کی جو فریاد رسوں کا فریاد رس ہے :

ع : درمیان انجمن تنہاستم

ع : شمع را تنہا تپیدن سہل نیست

انتظارِ غم گسارے تا کجا ؟
جستجوئے رازدارے تا کجا ؟

---

۳۹ - زیر بحث نظم کے آخری دو شعر :

تا بجان او سپارم ہوئے خویش
باز بینم در دلِ او روئے خویش

سازم از مشتِ گلِ خود پیکرش
ہم صنم او را شوم ہم آذرش

خواہم از لطفِ تو یارے ہمدمے
از رموزِ فطرتِ من محرمے

اس فریاد میں اتنی لذت تھی اور اتنا سرور کہ عزلت کی آرزو مندی اور تنہائیوں کی درد مندی کا ذکر ان کے شاعرانہ تخیل کا مستقل وظیفہ بن گیا اور تنہائیوں کے شدید احساس اور اس کے پیدا کیے ہوئے اضطراب کا دور ختم ہونے کے بعد بھی انھوں نے اس کی لذیذ اور دل نواز خلش کو اپنے سینے سے لگائے رکھا اور ان کی شاعری کے اگلے ادوار میں بھی یہ خلش نغموں کی جھنکار بن کر ان کے شعروں میں جگہ پاتی رہی - اضطراب ان کے جہان فکر اور جہان تخیل کا مستقل مکین ہوگیا کہ یہ خود شاعر کی اپنی ذات کا جزو لازم بن گیا تھا - ''پیام مشرق'' ، ''بال جبریل'' اور ''ارمغان حجاز'' کے ورق الٹتے چلے جائیے اور دیکھیے کہ جلوت میں رہ کر خلوت کے مزے لوٹنے اور احساس تنہائی کی لذتوں میں گم رہنے کی عادت مزاجِ شاعر کا جزو لازم بن جائے تو اس کا خیال خلوت پسندی کے شعار اور تنہائی کے احساس کو کیسی کیسی صورتیں دیتا ہے - آئیے پہلے ''پیام مشرق'' کی جنت خیالی کی سیر کیجیے اور دیکھیے کس طرح شاعر نے تنہائی کے احساس کا اپنی جذباتی دنیا سے ایک دائمی رشتہ قائم کر کے اسے اپنے فلسفۂ حیات کا ایک حصہ بنا لیا ہے اور تنہائی کا احساس پیدا کرنے والی کیفیتوں اور عواقب میں ایک منطقی ربط قائم کیا ہے ، جو شاعری کی سطح پر تو خیر ہے ہی درست ، فکری سطح پر بھی قابل قبول ہے - اس فلسفۂ حیات میں جدائی ، فراق اور ہجر کی کڑیاں منطقی طور پر تنہائی اور احساسِ تنہائی کی کڑیوں سے مربوط ہیں - یہاں آرزومندی اور تنہا گزینی کی سطحیں کبھی کبھی ایک

ہو جاتی ہیں ، یہاں جلوت و خلوت دو متضاد کیفیتیں ہونے کے بجائے ایک وسیع تر کیفیت کی دو شکلیں ہیں - یہاں نغمہ سرائی کسی کی یادوں کی خلش سے رہائی پانے کے لیے نہیں[۴۰] خود ذوق نغمہ کی تسکین کے لیے کی جاتی ہے - ''پیام مشرق'' کے شعر میری ان توجیہات و تاویلات کی منہ بولتی تصویریں ہیں - کس طرح؟ اس کا جواب ذیل کے شعروں میں ملے گا - پہلے دو ایسے شعر سن لیجیے جن میں جلوت اور خلوت ایک ہی کیفیت کی دو مختلف شکلیں ہیں اور جہاں ذوق نغمہ وسیلہ نہیں مقصد ہے :

چو ذوقِ نغمہ ام در جلوت آرد
قیامت افگنم در محفل خویش
چو می‌خواہم دمے خلوت بگیرم
جہان را گم کنم اندر دلِ خویش[۴۱]

چوتھے مصرعے میں دل شاعر کی وسعت کا اندازہ لگائیے - اب دل محض اس کی تنہائیوں کے احساس کا امین اور خزانہ دار ہونے کے بجائے پورے جہان کو اپنے اندر سمیٹنے اور سمو لینے کا دعویدار ہے - خلوت گزینی اس کی مجبوری نہیں بلکہ اس کا اختیار ہے اور نغمہ سرائی کی محرک ، حصول تسکین کی خواہش نہیں بلکہ قیامت خیزی کی امنگ اور ولولہ ہے اور اس صورت حال کا نتیجہ

---

۴۰ - ''بانگ درا'' کی نظم 'فراق' کے اس شعر کی طرف اشارہ ،

سکوتِ شام، جدائی ہوا بہانہ مجھے
کسی کی یاد نے سکھلادیا ترانہ مجھے

۴۱ - ''پیام مشرق'' ، ص ۲۹ -

یہ ہے کہ تنہا سرائی نے ایک محبوب مشغلے کی صورت اختیار کر لی ہے :

ز مرغانِ چمن نا آشنایم
بشاخِ آشیان تنہا سرایم

اگر نازک دلی از من کران گیر
کہ خونم می‌تراود از نوایم[۴۲]

''جہاں را گم کنم اندر دلے خویش'' اور ''بشاخِ آشیاں تنہا سرایم'' میں جذبے کے ایک ہی رنگ کا پرتو ہے اور جذبہ یہ رنگ اس وقت اختیار کرتا ہے جب ہمدم اور رفیق کی جستجوئے پیہم سے دل پر یہ راز منکشف ہوتا ہے کہ خود اپنی ذات ہی اپنا سب سے بڑا ہمدم اور سب سے سچا رفیق ہے۔ انسان پر یہ راز منکشف ہو جائے تو ہمدم ، رفیق اور رازداں کی جستجو ختم ہو جاتی ہے اور اپنی ذات کی ہمدمی اور رفاقت سرمایۂ زیست بن جاتی ہے۔ اقبال کے یہاں اس منزل تک رسائی کا نام ''بہ خود پیچیدن'' ہے۔ ہم اسے طوافِ ذات کہہ سکتے ہیں۔ یہ طواف ذات میسر نہ آئے تو زندگی کا وجود ختم ہو جاتا ہے۔ اور یہ طوافِ ذات وظیفۂ حیات بن جائے تو اجل کا احساس بارِ گراں نہیں بنتا :

دلِ من رازدانِ جسم و جان است
نہ پنداری اجل بر من گران است

چہ غم گر یک جہان گم شد ز چشمم
ہنوز اندر ضمیرم صد جہان است[۴۳]

---

۴۲ - ''پیام مشرق'' ، ص ۲۶ -
۴۳ - ایضاً ، ص ۶۷ -

اور بالآخر وہ مقام آتا ہے کہ انسان ان سب کی سرزنش کو اپنا حق سمجھنے لگے جو طواف ذات کا جادہ ترک کر کے طواف کعبہ اور گردش دیر کی راہ اختیار کرتے ہیں :

طوافِ کعبہ زدی گردِ دیر گردیدی
نگہ بخویش نہ پیچیدہ ای دریغ از تو[۴۴]

یا یہ کہ :

غلط کردی رہِ سر منزلِ دوست
دمے گم شو بصحرائے دلِ من[۴۵]

تنہائی کی یہ عظمت سود و زیاں کے احساس سے بالاتر ہو کر اور قدروں کا اعلیٰ اور ارفع معیار قائم کر کے حاصل ہوتی ہے اور انسان دنیا کے عام معیاروں کا ذکر بڑے تحقیر آمیز انداز میں کرتا ہے :

ز خوب و زشتِ تو ناآشنایم
عیارش کردہ ای سود و زیان را

در این محفل ز من تنہا ترے نیست
بچشمِ دیگرے بینم جہان را[۴۶]

یہاں تنہائی عظمت نفس کی مظہر بھی ہے اور اعزاز اور افتخار کا

---

۴۴ - ایضاً ، ص ۲۲۲ -
۴۵ - ایضاً ، ص ۷۱ -
۴۶ - ایضاً ، ص ۳۹ -

سرمایہ بھی - یہاں پہنچ کر تنہائی کو یکتائی کا درجہ مل جاتا ہے اور یکتائی کی اس دولتِ سرمدی کا سرمایہ دار دوسروں کے دعویٰ یکتائی پر تمسخر آمیز تبسم کر کے اپنی یکتائی کی عظمت کے احساس میں مگن رہتا ہے - اقبال کے ذوق تمثیل نے اپنے شاعرانہ تخیل کی مدد سے اس تمسخر آمیز صورت حال کی بڑی نظرافروز اور دل آویز تصویر بنائی ہے - اس مختصر سی تخیلی اور شاعرانہ تمثیل کے چار پردے بڑی برق رفتاری سے کھلتے اور گرتے ہیں - ہر پردہ ایک نیا منظر دکھاتا اور ایک الگ کردار کی ہستی کے وزن کو ہلکا کر کے رخصت ہو جاتا ہے اور تین کرداروں کی رسوائی چوتھے کردار ، یعنی شاعر کی یکتائی کے نقش کو زیادہ آبھارنے اور صورت دوام دینے کا سبب بنتی ہے - یوں فن کی چابک دستی اور حسن ترتیب کی بدولت ایک شاعرانہ تصور حکیمانہ حقیقت بن جاتا ہے اور اقبال کے فلسفۂ حیات کی معنویت کی اساس زیادہ مستحکم ہو جاتی ہے - نظم[۴۷] کی ہیئت مخمس کی ہے اور شاعر نے اپنے تخئیلی سفر کی روداد یوں بیان کی ہے :

بہ بحر رفتم و گفتم بہ موجِ بیتابے
ہمیشہ در طلب استی چہ مشکلے داری؟
ہزار لولوئے لالاست در گریبانت
درونِ سینہ چون من گوہرِ دلے داری؟
تپید و از لبِ ساحل رمید و ہیچ نگفت

---

۴۷ - نظم کا عنوان ہے 'تنہائی' ، ایضاً ، ص ۱۳۶ -

بکوه رفتم و پرسیدم این چه بے دردیست
رسد بگوشِ تو آه و فغانِ غم زدۂ ؟
اگر بہ سنگ تو لعلے ز قطرۂ خون است
یکے در آ بسخن با منِ ستم زدۂ
بخود خزید و نفس در کشید و ہیچ نگفت

رہِ دراز بریدم ز ماہ پرسیدم
سفر نصیب ! نصیب تو منزلیست کہ لیست؟
جہان زِ پرتوِ سیمائے تو سمن زارے
فروغِ داغِ تو از جلوۂ دلیست کہ نیست؟
سوئے ستارہ رقیبانہ دید و ہیچ نگفت

شدم بحضرتِ یزدان گذشتم از مہ و مہر
کہ در جہانِ تو یک ذرہ آشنایم نیست
جہان تہی ز دل و مشتِ خاکِ من ہمہ دل
چمن خوش است ولے درخورِ نوایم نیست
تبسمے بہ لبِ او رسید و ہیچ نگفت

شاعر کے شکوۂ ناآشنائی میں اپنی یکتائی کی عظمت کا جو احساس شامل ہے یزداں کے تبسم آمیز سکوت سے اس پر ثبت دوام کی مہرِ تصدیق لگ جاتی ہے -

اقبال نے محرومیوں ، مایوسیوں اور ناکامیوں سے گھبرا کر عزلت پسندی کی جو روش اختیار کی تھی اس کا رخ احساس کی شدت ، جذبۂ خدمت گزاری کے گداز ، جستجو کے ذوق فراواں اور آرزوؤں کے بے پایاں ہجوم نے احساس تنہائی کی طرف موڑ دیا اور فکر کی گرمی نے احساس کی اس شمع کو پگھلا کر ایک نئے سانچے میں ڈھالا اور اس سانچے میں ڈھل کر جو پیکر شکل پذیر ہوا اسے یکتائی کا نام ملا - یہ یکتائی اقبال کے فلسفۂ حیات کی یکتائی ہے جس میں سب سے اونچا مقام اور منزلت احساسِ نفس یا شعورِ ذات کو حاصل ہے - اقبال کے فلسفۂ حیات میں یہ احساسِ نفس یا شعورِ ذات عشق کی آنچ میں تپ تپ کر کندن بنتا ہے اور اس کندن کی جوت آرزوؤں کی لگائی ہوئی چوٹ سے جاگتی ہے، اور ہوتے ہوتے اس جوت کا جلوہ آنکھوں میں ، دل میں ، روح میں اور پھر انسان کی نس نس میں سما جاتا ہے اور انسان یوں ساری کائنات کو اپنی ذات میں جذب کر لیتا ہے کہ اسے کسی کی محتاجی باقی نہیں رہتی - احتیاج کی اس منزل سے گزر کر ہی انسان ایسا بنتا ہے کہ اسے حسب خواہش اور حسب طلب جلوت میں خلوت کے سکوت اور خلوت میں جلوت کے ہنگاموں کی لذتیں میسر آتی ہیں ، جدائی کے سوز اور وصل کی راحت میں فرق باقی نہیں رہتا اور ان امتیازات کے ختم ہونے کے بعد فتح بالآخر خلوت ، جدائی ، ناصبوری اور آرزومندی کی ہوتی ہے - عزیز ترین رفاقت کا حق آرزوئیں ادا کرتی ہیں ، جن کی آبیاری اشک سحرگہی کے آب بقا سے ہوتی ہے - عزلت پسندی اور احساس تنہائی کے ملے جلے جذباتی اور فلسفیانہ

تصور نے "بال جبریل" کی غزلوں کو حکیمانہ تغزل اور متغزلانہ حکمت کا وہ پیکر عطا کیا ہے جو ہماری شاعری میں اس سے پہلے صرف غالب کی غزلوں میں نظر آتا ہے ۔ اس تغزل میں فلسفۂ حیات جسے اتنی طویل گفتگو کے بعد خلوت پسندی اور احساس تنہائی کا فلسفہ کہا جا سکتا ہے ، کس کس طرح جلوہ گر ہوا ہے اس کے اندازے کے لیے "بال جبریل" کے کچھ شعر ملاحظہ کیجیے :

پریشاں کاروبارِ آشنائی
پریشاں تر مری رنگیں‌نوائی

کبھی میں ڈھونڈتا ہوں لذتِ وصل
خوش آتا ہے کبھی سوزِ جدائی[۴۸]

ہر اک ذرے میں ہے شاید مکیں دل
اسی جلوت میں ہے خلوت نشیں دل

اسیرِ دوش و فردا ہے و لیکن
غلامِ گردشِ دوراں نہیں دل[۴۹]

سورج بنتا ہے تارِ زر سے
دنیا کے لیے ردائے نوری

عالم ہے خموش و مست گویا
ہر شے کو نصیب ہے حضوری

---

۴۸ - "بال جبریل"، ص ۱۱۶ -
۴۹ - ایضاً ، ص ۱۱۰ -

دریا ، کہسار ، چاند ، تارے
کیا جانیں فراق و ناصبوری

شایاں ہے مجھے غمِ جدائی
یہ خاک ہے محرمِ جدائی[۵۰]

تارے آوارہ و کم‌آمیز
تقدیرِ وجود ہے جدائی[۵۱]

کبھی حیرت ، کبھی مستی ، کبھی آہِ سحرگاہی
بدلتا ہے ہزاروں رنگ میرا دردِ مہجوری[۵۲]

کھو نہ جا اس سحر و شام میں اے صاحبِ ہوش
اک جہاں اور بھی ہے جس میں نہ فردا ہے نہ دوش

کس کو معلوم ہے ہنگامۂ فردا کا مقام
مسجد و مکتب و مےخانہ ہیں مدت سے خموش

میں نے پایا ہے اسے اشکِ سحرگاہی میں
جس دُرِ ناب سے خالی ہے صدف کی آغوش[۵۳]

---

۵۰ - ایضاً ، ص ۲۱۴ -
۵۱ - ایضاً ، ص ۷۹ -
۵۲ - ایضاً ، ص ۸۷ -
۵۳ - ایضاً ، ص ۱۰۷ -

تری دنیا جہانِ مرغ و ماہی
مری دنیا فغانِ صبح گاہی

تری دنیا میں میں محکوم و مجبور
مری دنیا میں تیری پادشاہی[۵۴]

نہ چھین لذتِ آہِ سحرگہی مجھ سے
نہ کر نگہ سے تغافل کو التفات آمیز[۵۵]

کیا عجب میری نواہائے سحرگاہی سے
زندہ ہو جائے وہ آتش کہ تری خاک میں ہے[۵۶]

راہِ محبت میں ہے کون کسی کا رفیق
ساتھ مرے رہ گئی ایک مری آرزو[۵۷]

نہ مے ، نہ شعر ، نہ ساقی ، نہ شورِ چنگ و رباب
سکوتِ کوہ و لبِ جوئے و لالۂ خودرو[۵۸]

نہیں اس کھلی فضا میں کوئی گوشۂ فراغت
یہ جہاں عجب جہاں ہے ! نہ قفس نہ آشیانہ[۵۹]

---

۵۴ - ایضاً ، ص ۱۴ -
۵۵ - ایضاً ، ص ۲۵ -
۵۶ - ایضاً ، ص ۹۵ -
۵۷ - ایضاً ، ص ۱۲۳ -
۵۸ - ایضاً ، ص ۱۹ -
۵۹ - ایضاً ، ص ۲۳ -

"بال جبریل" کی غزلوں کے ان جستہ جستہ اشعار میں اقبال نے خلوت و جلوت ، وصل و ہجر ، جدائی و تنہائی ، تغافل و التفات ، رفاقتِ آرزو اور ان سب سے قطع نظر آہ سحرگاہی ، اشک سحرگاہی نوائے سحرگاہی اور فغان صبح گاہی کی ترکیبیں استعمال کرکے اپنے فکر کے ان پہلوؤں کی طرف اشارے کیے ہیں جن کا تعلق کسی نہ کسی طرح اس احساس سے ہے کہ انسان کن حالتوں میں ساقی و میخانہ و شعر و چنگ و رباب کی سرخوشیوں سے کنارہ کش ہو کر سکوتِ کوہسار ، نغمۂ جوئبار اور گوشۂ لالہ زار کی تنہائیوں میں گم ہو جانا چاہتا ہے اور کن حالتوں میں وہ زندگی کے ہنگاموں میں اپنے آپ کو یکہ و تنہا محسوس کرتا ہے - ان پہلوؤں میں سے جن جن میں اقبال کے شاعرانہ تخیل کو غزل کے شعر کا موضوع بننے کی گنجائش نظر آئی ہے ، انھوں نے ان سے بزم تغزل کی آراستگی و زینت کا کام لیا ہے - البتہ غزل کے محدود دائرے سے باہر نکل کر تخیل کے دائرے کو وسیع کرکے موضوع کے دوسرے گوشوں کے رخ سے نقاب اٹھانے میں شاعرانہ لذت محسوس کی ہے -

"ارمغان حجاز" اقبال کے شاعرانہ تفکر یا حکیمانہ شاعری کا آخری مظہر ہے اور بعض حیثیتوں سے اسے ان کے افکار و تصورات کا خلاصہ کہا جا سکتا ہے - ابلیس کی مجلس شوریٰ کے مطالب شعری انبال کے اکثر فکری پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہیں - راس مسعود کی یاد میں لکھا ہوا مرثیہ فلسفۂ حیات و ممات اور جذبات غم کے امتزاج کی بڑی دلنشیں صورت ہے - یہی صورت فارسی کے ان قطعوں کی ہے جو کتاب کے تین چوتھائی حصے میں پھیلے ہوئے ہیں - اقبال کے فلسفۂ حیات کے اکثر و بیشتر پہلوؤں کو یہاں شاعری کی زبان عطا ہوئی ہے اور چونکہ ہر خیال کو

چار مصرعوں میں نظم کیا گیا ہے اس لیے حسنِ ایجاز سے اشعار کی معنویت میں بھی گہرائی پیدا ہوئی ہے اور ان کے شاعرانہ محاسن میں بھی ایک طرح کا تیکھا پن آیا ہے - اشعار میں جو مضامین نظم ہوئے ہیں ان میں بھی کوئی نہ کوئی نکتہ اور کوئی نہ کوئی باریکی ہے اور نظم کرنے کے انداز میں بھی کوئی نہ کوئی نزاکت اور لطافت ہے اور خیال اور بیان کی موزوں اور متناسب ہم آہنگی سے اشعار نظر افروز تصویر اور دل نواز نغمے کے رنگ و آہنگ کی یکجائی کا مرقع بن گئے ہیں - اقبال کے نظام فکر سے تعلق رکھنے والے تخیلی اور شعری تلازمات میں سے کسی ایک کو بھی شعر کے سانچے میں ڈھلا ہوا دیکھنے کی خواہش ہو تو ''ارمغان حجاز'' کے ان ابتدائی دو سو صفات کے مطالعے سے اس خواہش کی تشفی کا وافر سرمایہ میسر آ جاتا ہے - چنانچہ موضوع زیر بحث کے خیالی سلسلے سے تعلق رکھنے والی مختلف کڑیاں بھی ان اوراق میں بکھری پڑی ہیں ، جنھیں باہم جوڑ کر خیالات کا ایک باقاعدہ سلسلہ مرتب ہو سکتا ہے - اقبال خلوت اور تنہائی کے احساسات اور ان احساسات کے ضمنی متعلقات کو اپنی شاعری کے مختلف ادوار میں جس انداز میں شعروں اور نظموں کی شکل دیتے رہے ہیں ان میں سے ہر ایک کا عکس ہمیں ''ارمغان حجاز'' کے زیر تذکرہ شعروں میں مل جاتا ہے - میں نے انھیں بکھرے ہوئے تصورات کی کڑیوں کو جوڑ کر ایک مربوط شکل دینے کی کوشش کی ہے - اس سلسلۂ تصورات کی پہلی کڑی اقبال کا مظاہر فطرت کے حسن کے ساتھ وہ جمالیاتی لگاؤ ہے جو کسی اور مقصد کے بجائے صرف اس لیے تنہا نشینی پر مائل کرتا ہے کہ اس طرح عروس لالہ کی رفاقت آن کے لیے انبساط روح کا باعث بنے گی :

بہ راغان لالہ رست از نو بہاران
بہ صحرا خیمہ گستردند یاران

مرا تنہا نشستن خوشتر آید
کنارِ آبجوئے کوہساران[۶۰]

خلوت پسندی اور خلوت گزینی کا ایک مرحلہ وہ ہے (اور اسے اقبال نے اپنی زندگی کی متاع عزیز سمجھنے کی عادت ڈالی ہے) کہ نے نوازی آن کا محبوب مشغلہ ہے اور وہ ہر دو عالم سے بے نیاز ہو کر اپنے نغمۂ پر سوز کو طبیعت میں گداز پیدا کرنے کا وسیلہ بناتے ہیں اور میخانۂ شوق کے بادہ کش بن کر آہ و فغاں کی رفاقت عزیز میں خلوت میں جلوت کی ہنگامہ آرائیوں کے مزے لیتے ہیں۔

مرا تنہائیِ آہ و فغان بہ
سوئے یثرب سفر بے کاروان بہ

کجا مکتب، کجا میخانۂ شوق
تو خود فرما مرا این بہ کہ آن بہ[۶۱]

۶۰۔ ''ارمغان حجاز''، ص ۳۵۔
۶۱۔ ایضاً، ص ۵۶۔

غریبے ، دردمندے ، نےنوازے
ز سوزِ نغمۂ خود در گدازے

تو می‌دانی چہ می‌جوید چہ خواہد
دلے از ہر دو عالم بےنیازے[۶۲]

نے نوازی اور دل گدازی کی ایک کیفیت تو وہ ہے جس میں انسان دونوں عالم سے بے نیازی حاصل کر لیتا ہے اور دوسری وہ جس میں فقر نے اُسے قیصر و سلطان کی بے نیازی کا سبق دیا ہے :

بہ جلوت نےنوازی‌ہائے من بین
بہ خلوت خود گدازی‌ہائے من بین
گرفتم نکتۂ فقر از نیاگان
ز سلطان بےنیازی‌ہائے من بین[۶۳]

دونوں عالموں سے بے نیاز ہو کر انسان مشرق و مغرب دونوں کے لیے اجنبی بن جاتا ہے اور اجنبیت کے اس عالم میں اُسے کوئی نہیں ملتا کہ اُس کا محرم راز بن سکے - بے نصیبی و نا کسی کے اس عالم میں غم دل کا امانت دار خود دل ہی بنتا ہے اور شاعر انسان کی اس معصوم خود فریبی میں ایک نامعلوم لذت محسوس کرتا ہے :

---

۶۲ - ایضاً ، ص ۶ -
۶۳ - ایضاً ، ص ۷۹ -

من اندر مشرق و مغرب غریبم
کہ از یارانِ محرم بےنصیبم
غمِ خود را بگویم با دلِ خویش
چو معصومانہ غربت را فریبم[۶۴]

کبھی تو لالہ و گل انسان کی دلسوزی میں اُس کے رفیق اور شریکِ غم بنتے تھے ، لیکن اُس نے اپنی تنہائی کو یکتائی کا جو بلند مقام دیا ہے اُس میں لالہ خود ، اُس کی دردمندی و دل سوزی کا محتاج ہے :

شریکِ درد و سوزِ لالہ بودم
ضمیرِ زندگی را وانمودم
ندانم با کہ گفتم نکتۂ شوق
کہ تنہا بودم و تنہا سرودم[۶۵]

دو عالم سے بے نیازی اور پھر قیصر و سلطان سے بے نیازی انسان کو یکتائی کا وہ اعلیٰ رتبہ عطا کرتی ہے کہ اُس کا دل دانا ، زمان و مکان کے قید و بند سے آزاد ہو کر حلقۂ نہ آسمان سے پرے نکل جاتا ہے ، لیکن آزادی و یکتائی کی یہ شان صرف مسلمان کے حصے میں آتی ہے اور اس کا ایک سجدہ اُسے اُس بلندی پر لےجاتا ہے کہ خداوندان جہاں کی خداوندی کی اُس کی نظر میں کوئی قیمت نہیں رہتی :

---

۶۴ - ایضاً ، ص ۷ -
۶۵ - ایضاً ، ص ۸۰ -

مسلمانیم و آزاد از مکانیم
برون از حلقۂ نہ آسمانیم
بما آموختند آن سجدہ کزوے
جبینے بر خداوندے بدانیم[۶۶]

مسلمان ہی ہے کہ وہ صوفی و ملا کی ہم نشینی ترک کر کے صرف اپنی ذات سے رشتہ جوڑتا ہے اور لوح دل پر اللہ کے نام کا نقش ثبت کر کے وہ بصیرت حاصل کرتا ہے کہ اُس پر اُس کی اپنی ذات کے جلوے اور اللہ کی ذات کے جلوے منکشف ہو جاتے ہیں :

نہ با ملا نہ با صوفی نشینم
تو می دانی کہ من آنم نہ اینم
نویس 'اللہ' بر لوحِ دلِ من
کہ ہم خود را ہم اورا فاش بینم[۶۷]

نگاہ کی یہ بے نیازی کہ اُسے دونوں عالم ہیچ نظر آئیں اور کلاہ قیصری و تاج سلطانی کے لعل و جواہر خزف ریزے بن جائیں ، اور سوز دروں کی بدولت گداز دل کی دولت بے بہا ہاتھ آ جائے تو دل سوچ میں پڑ جاتا ہے اور حضور رسالت ؐ میں حاضر ہو کر شکوہ سنج

---

۶۶ - ایضاً ، ص ۸۶ -
۶۷ - ایضاً ، ص ۶۴ -

ہوتا ہے :

نگاہم زانچہ بینم بےنیاز است
دل از سوزِ درونم در گداز است

دن و این عصرِ بے اخلاص و بے سوز
بگو با من کہ آخر این چہ راز است ؟[۶۸]

اور پھر شکوہ سنجی ایک دوسرا رخ اختیار کرتی ہے - بندے کو خالق کی ''شوخی تخلیق'' سے یہ شکایت ہے کہ اُس کے جسم خاکی کو دل پر سوز کا خزینہ بنایا اور اُسے پیدا کیا ایک ایسے زمانے میں جو سوز سے بالکل خالی ہے :

مرا در عصرِ بے سوز آفریدند
بخاکم جانِ پر شورے دمیدند

چو نخ در گردنِ من زندگانی
تو گوئی بر سرِ دارم کشیدند[۶۹]

لیکن عصر حاضر کے اس امروز میں جو ہر ایک نئے خداوند کے آستانے پر سربسجود ہونے کی تعلیم دیتا ہے ذات کی شان یکتائی یہ ہے کہ وہ ہر آن ایک تازہ صنم کو خدائی عطا کرنے والے صنم‌خانے کی طرف سے منہ موڑ لیتا ہے اور یہ اعلان کر کے سننے والوں کے دل پر اپنی یکتائی کا نقش بٹھاتا ہے کہ زمانے کی نادانی تو دیکھو کہ وہ آج مجھ سے اُس بت کی پرستش کروا رہا ہے جسے میں کل توڑ

---

۶۸ - ایضاً ، ص ۶۸ -
۶۹ - ایضاً ، ص ۶۹ -

چکا ہوں :

درین بتخانہ دل باکس نہبستم
و لیکن از مقامِ خود گسستم

ز من امروز می‌خواہد سجودے
خداوندے کہ دی او را شکستم[۷۰]

اقبال نے خلوت و جلوت ، نے نوازی و دلگدازی ، صوفی و ملا کی کم سوادی ، ہر دو عالم سے اپنی بے نیازی ، بت شکنی و سجدہ گزاری اور ان سب کے پردے میں چھپی ہوئی اپنی شان یکتائی کی یہ سب باتیں بارگاہ نبوت میں پیش کی ہیں ۔[۷۱] اب وہ بات سن لیجیے جو اقبال نے اپنی شان تنہائی کے متعلق ''یاران طریق'' سے مخاطب ہو کر کہی ہے:[۷۲]

بچشمِ من جہان جز رہگذر نیست
بزاران رہرو و یک ہمسفر نیست

گذشتم از ہجومِ خویش و پیوند
کہ از خویشان کسے بیگانہ تر نیست[۷۳]

---

۷۰ - ایضاً ص ۷۴ -

۷۱ - ''ارمغان حجاز'' کے صفحہ ۲۵ پر ایک عنوان ہے : ''حضور رسالت'' یہ باب صفحہ ۸۶ پر ختم ہوتا ہے ۔ اب تک ''ارمغان'' کے جو شعر زیر بحث آئے وہ اسی باب سے ماخوذ ہیں ۔

۷۲ - ''ارمغان حجاز'' کے اس حصے کا عنوان ہے : ''بہ یاران طریق'' جو صفحہ ۱۸۷ سے شروع ہو کر صفحہ ۲۱۰ پر ختم ہوتا ہے ۔

۷۳ - ایضاً ، ص ۱۹۴ -

اپنی خودی کو ہر جستجو اور ہر آرزو کا مرکز و محور بنا لینے والا انسان اور خودی کے سوز میں زندگی کا ساز تلاش کرنے والا انسان ، عہد حاضر کی بےسوزی کا شکوہ سنج ہونے والا انسان ، جب ہر دو عالم سے بے نیاز ہو کر خود اپنی ذات کو اپنا تنہا محرم راز اور اپنے غموں کا واحد چارہ ساز سمجھ لے تو سفر حیات کی کڑی منزلوں میں کسی ہم سفر کی رفاقت کی احتیاج باقی نہیں رہتی اور انسان خویش و پیوند سے اپنا رشتہ ناتا توڑ کر زندگی کا طویل سفر تنہا طے کرتا ہے -

یہ سفر ختم ہوتا ہے اور مرحلہ سزا و جزا کا آتا ہے تو اپنی خودی کے سہارے زندگی بسر کرنے والا انسان دوسری دنیا میں بھی اُسی کنج خلوت کی طلب کرتا ہے جس میں اُس نے من و تو کا دست نگر ہوئے بغیر اپنے سوز دل کی پرورش کی تھی - خلوت و تنہائی کا یہ شیدائی آخرت میں بھی اسی گوشۂ خلوت اور عالم تنہائی میں رہنے کی آرزومندی ظاہر کرتا ہے - اقبال نے ''حضور حق''[۷۴] اپنی یہ آخری تمنا کن لفظوں میں پیش کی ہے اُس پر خلوت گزینی ، احساس تنہائی اور شان یکتائی کی اس حکایت کو ختم کروں گا :

دلِ من در کشادِ چون و چند است
نگاہش از مہ و پروین بلند است
بدہ ویرانۂ در دوزخ آو را
کہ ایں کافر بسے خلوت پسند است[۷۵]

---

۷۴ - ''ارمغان حجاز'' کے پہلے باب کا عنوان ''حضور حق'' ہے - یہ باب صفحہ ایک سے شروع ہو کر صفحہ ۲۳ پر ختم ہوتا ہے -

۷۵ - ایضاً ، ص ۴ -

زندگی کا جو سفر کسی جبر کی بنا پر ''خلوت پسندی'' کی خواہش اور آرزو سے شروع ہوا تھا اُسے اب عالم اختیار میں طلب کیا جاتا ہے ۔ اقبال نے یہ سفر خلش ، کشمکش اور اضطراب کے نہ جانے کتنے مرحلوں سے گزر کر اور خودی کے سوز ، اُس کی قوت اور اُس کے اعتماد کی مدد سے اس خلش ، کشمکش اور اضطراب کو شکست دے کر کیا ہے اور اسی کا کرشمہ ہے کہ بالآخر اختیار بن کر اُن کے فکر ، احساس ، جذبے اور تخیل کی دنیاؤں پر محیط نظر آتا ہے ۔

طلسمِ گنجینۂ معنی

شاعر اپنی ذات کا ترجمان ہے اور اُس کا ہر شعر کسی نہ کسی انداز سے اُس کی ذات کے کسی رخ کی تعبیر و تفسیر ہے لیکن اس تعبیر و تفسیر میں لفظ معنی کے ابلاغ کی خدمت انجام دیتے ہیں اور یوں گویا شعر کے معنی و مفہوم سے جب ہم شاعر کی ذات کے کسی رخ تک رسائی حاصل کرتے ہیں تو اس شعر میں لفظ ہمارا رفیق و رہنما بنتا ہے - لفظ کی صحیح وضاحت ہی سے معنی کا ادراک بھی ممکن ہوتا ہے اور اس معنی کی تہ میں چھپی ہوئی ذات کا عرفان بھی - لفظ ، معنی اور ذات کے اس باہمی رشتے کا احساس ہمیں ہر بڑے شاعر کا کلام پڑھتے وقت ہوتا ہے اور مطالعے کی ایک منزل پر پہنچ کر ہمیں اندازہ ہونے لگتا ہے کہ شاعر نے معانی کے ابلاغ کے لیے بیان کا جو پیرایہ اختیار کیا ہے اُس میں بعض خاص لفظوں یا ترکیبوں کا اعادہ بار بار ہوتا ہے ، اور یہی خاص لفظ اور یہی خاص ترکیبیں ہیں جن سے شاعر کے اُسلوب کی اور اس اُسلوب کے رشتے سے اُس کی شخصیت کی انفرادیت متعین ہوتی ہے - اُسلوب کی ایسی انفرادیت کو ہم شاعر کا مخصوص Diction کہتے ہیں -

یہ مخصوص Diction جذبے ، احساس ، تخیل اور تفکر کی مخصوص نوعیت سے پیدا ہوتا ہے - جذبے ، احساس ، تخیل اور تفکر کی اس مخصوص نوعیت سے شاعر کے شعری تجربے کو جو خاص شکل ملتی ہے اُسی سے اظہار کا ایک پیرایہ وجود میں آتا ہے

اور اس مخصوص پیرایۂ اظہار میں لفظوں کا ایک خاص مجموعہ دوسرے لفظوں کے مقابلے میں زیادہ تکرار اور تواتر سے ہمارے سامنے آتا ہے ، اور بالآخر ہمیں یہ محسوس کرنے میں ذرا بھی دقت محسوس نہیں ہوتی کہ لفظوں کے اس مجموعے سے تعلق رکھنے والے ہر لفظ میں معنی کی ایک ایسی تہ ہے جہاں اب تک ہماری رسائی نہیں ہوئی تھی - لفظوں کے ان پوشیدہ معنوی امکانات کا علم ہمیں اُس وقت ہوا جب شاعر نے اُسے ایک تجربے کے اظہار اور ابلاغ کا وسیلہ بنایا -

ہمارے اپنے عہد میں لفظ اور معنی کے رشتے کی یہ نوعیت جس طرح اقبال کی شاعری میں بار بار نمایاں ہوتی ہے کسی اور شاعر کے یہاں نہیں ہوتی اور عموماً یہ ہوتا ہے کہ لفظ جہاں ایک طرف کسی مخصوص مفہوم اور معنی کے ابلاغ کا ذریعہ بنتا ہے دوسری طرف یہ کہ اس لفظ میں آنے والا کوئی ایک حرف اپنے صوتی آہنگ کی بنا پر ایک مخصوص تأثر کی تخلیق میں حصہ لیتا ہے - اقبال کے شارحین نے اشعار کی تشریح کرتے ہوئے اُس تاثیر کا ذکر بھی کیا ہے جو اقبال نے بعض حروف کے صوتی آہنگ کی مدد سے پیدا کی ہے ، مثلاً ر ، ل ، س اور ک - اسی طرح کے چند حروف ہیں جن سے اقبال اُردو اور فارسی دونوں میں خوشگوار صوتی تأثر ، ترنم یا نغمگی پیدا کرتے ہیں - اسی طرح کا ایک حرف 'غ' بھی ہے ، جس کے صوتی آہنگ میں ر ، ل ، س اور ک کی نرمی اور سبک پن کے بجائے ایک خاص طرح کی خوشگوار گونج ہے اور اس گونج سے اقبال کو بارہا مطلوبہ تاثر پیدا کرنے میں مدد ملی ہے - مثنویوں کے ان بہت سے اشعار کے علاوہ جن میں 'غ' پر ختم ہونے والے لفظ قافیہ کے طور پر استعمال ہوئے ہیں ، ضرب کلیم ، بال جبریل اور پیام مشرق کی کئی نظموں میں داغ ، راغ ، زاغ ، باغ ، دماغ ،

چراغ ، ایاغ ، سراغ اور فراغ کے قافیے لائے گئے ہیں ، بلکہ اس تأثر میں زیادہ گونج اور جھنکار پیدا کرنے کے لیے کبھی کبھی اس طرح کے دو لفظوں کو ملا کر مرکب بنا لیا گیا ہے - باغ و راغ اسی طرح کی ترکیب ہے جو پیام مشرق ، زبور عجم ، جاوید نامہ ، اور پس چہ باید کرد کے کئی شعروں میں استعمال کی گئی ہے اور ہر جگہ اس سے اس مخصوص فضا کی تشکیل میں بھی حصہ لیا ہے جو شاعر کا مقصود ہے اور اپنے صوتی تأثر سے شعر کے نغماتی آہنگ کی تعمیر بھی ہے - لیکن اس وقت میری گفتگو کا موضوع 'غ' پر ختم ہونے والا ایک ایسا لفظ ہے جو اپنے لغوی مفہوم کے اعتبار سے اقبال کی حکیمانہ شاعری کے مجموعی مزاج کا ساتھ بھی دیتا ہے اور اس مزاج کی تشکیل جن اجزا سے ہوئی ہے ان میں سے ہر ایک کا پرتو بھی اس میں موجود ہے - یہ لفظ 'فروغ' ہے جو بانگ درا کے علاوہ ان کے کلام کے ہر مجموعے میں بار بار آیا ہے اور مزاج کی وہی خصوصیات لے کر آیا ہے جن کی طرف میں نے ابھی اشارہ کیا اور ایک لحاظ سے تو یہ بانگ درا میں بھی موجود ہے کہ وہ نظموں کے ان اشعار میں استعمال ہوا ہے جنھیں بانگ درا کی ترتیب کے وقت شامل نہیں کیا گیا ، مثلاً بانگ درا کے جو گیارہ شعر والدہ مرحومہ کی یاد میں شامل نہیں ہیں اُن میں سے ایک شعر یہ ہے :

دیکھنے میں گرچہ ہے مثلِ شرر اُن کا فروغ
خندہ‌زن ہے صرصرِ ایام پر اُن کا فروغ
(رختِ سفر ، صفحہ ۲۱)

اسی طرح اقبال نے 'ابر گہر بار' کے نام سے ایک نظم انجمن حمایت اسلام کے جلسے میں پڑھی اور بعد میں وہ ۱۹۱۳ء میں 'فریاد امت'

کے نام سے چھپی - اس کے چوتھے بند میں یہ شعر آیا ہے :

ہے فروغِ دو جہاں داغِ محبت کی ضیا
چاند یہ وہ ہے کہ گھٹتا نہیں کامل ہو کر

(باقیات اقبال ، صفحہ ۲۶)

ایک اور مثال اُس قطعہ کی ہے جو اقبال نے 'شمع اور شاعر' پڑھنے سے پہلے انجمن حمایت اسلام کے جلسے میں پڑھا تھا - چار شعروں کے اس قطعہ کا پہلا شعر یہ ہے :

ہم نشینِ بے ریایم از رہِ اخلاص گفت
اے کلامِ تو فروغِ دیدۂ برنا و پیر

(باقیات اقبال ، صفحہ ۱۲۲)

باقیات اقبال (صفحہ ۱۳۳) میں چار ایسے شعر درج ہیں جو حالی کی صد سالہ برسی کے موقع پر نواب صاحب بھوپال کی موجودگی میں پڑھے گئے - ان چار اشعار میں سے ایک میں نواب صاحب بھوپال کی تعریف کی گئی ہے :

حمیداللہ خاں اے ملک و ملت را فروغ از تو
ز الطافِ تو موجِ لالہ خیزد از خیابانم

محولۂ بالا چار شعروں میں سے پہلے تین شعروں میں 'فروغ' کا لفظ 'روشنی' اور چمک ، کے معنی میں استعمال ہوا ہے ، البتہ چوتھے شعر میں اس لفظ سے کئی معنی لیے جا سکتے ہیں : روشنی ، رونق اور ترقی ، لیکن بہ حیثیت مجموعی یہاں 'فروغ' سے ایک ایسے معنی

نکلتے ہیں جو روشنی ، رونق اور ترقی کے علاوہ ہیں اور جن کا احاطہ یہ لفظ نہیں کرتے ۔

اب ذرا یہ دیکھیے کہ لغات میں 'فروغ' کے کیا معنی درج ہیں : انگریزی کے لغات اسٹائنگاس اور پلاٹس میں علی الترتیب 'فروغ' کے لیے یہ الفاظ درج ہیں :

اسٹائنگاس : splendour, light, brightness, flame

پلاٹس : مندرجہ بالا چاروں لفظوں کے علاوہ Illumination نیز glory ، fame اور honour

نوراللغات میں فروغ کے مرادفات یہ ہیں : روشنی ، چمک ، سرافرازی ، رونق ، سبقت ، ترجیح ۔

فرہنگ آصفیہ : روشنی - جوت - درخشندگی - شعاع - تابش - نور - چمک دمک - رونق ۔

اور فرہنگ انند راج میں صرف دو مرادفات درج ہیں : روشنی اور تابش - انگریزی کے لفظوں میں glory اور splendour دو ایسے لفظ ہیں جن کا مرادف اردو اور فارسی کی فرہنگوں میں نہیں - البتہ سرفرازی کا لفظ کسی حد تک اس مفہوم کو ادا کرتا ہے ، اس لیے فہرست میں شان و شوکت ، رفعت ، عظمت اور جلال کے الفاظ بھی شامل کیے جا سکتے ہیں ۔

اقبال کا فلسفہ بنیادی طور پر اثبات خودی کا فلسفہ ہے جو خود اقبال کے نزدیک نفی خودی کے زہر کا تریاق ہے ، اور یہ فلسفہ انسان کو ذات ، عمل ، جد و جہد کا اور مسلسل اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کا سبق دیتا ہے کہ اسی طرح ذات کے جوہر بھی ابھرتے ہیں اور جہان رنگ و بو کا پوشیدہ حسن بھی

نمایاں ہوتا ہے - اقبال نے خودی اور کائنات کے جملہ امکانات کے واضح ہونے کا جو نقشہ اپنے تخیل میں بنایا ہے اس کے اظہار کے لیے 'فروغ' کا لفظ استعمال کیا ہے کہ اس لفظ کے ساتھ روشنی ، ترقی ، عظمت ، رفعت ، جلال اور جمال کے تصورات یکجا ہو کر سامنے آتے ہیں -

اقبال کے کلام میں 'فروغ' کا لفظ جتنی جگہ بھی استعمال ہوا ہے وہاں کبھی تو محض روشنی ، نور یا جلوے کا مفہوم ادا کرتا ہے ، کہیں اس سے رونق اور چہل پہل کے معنی نکلتے ہیں ، لیکن زیادہ موقعے ایسے ہیں جہاں کئی تصورات ایک ساتھ مل کر ذہن پر وارد ہوتے ہیں اور ایک یا دو لفظ اس کا احاطہ نہیں کر سکتے ، بلکہ کبھی کبھی تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ 'فروغ' کے لفظ نے اس جگہ جتنے معانی و مفاہیم کا احاطہ کیا ہے لغت کے تمام لفظ مل کر بھی اسے اپنی گرفت میں نہیں لے سکتے - پہلے چند شعر ایسے سنیے جہاں 'فروغ' روشنی یا نور کے معنی میں آیا ہے :

اے فروغِ دیدۂ برنا و پیر
سرِّ کار از ہاشم و محمود گیر

(پس چہ باید کرد ، ۳۸)

* * *

نہ در دیدۂ او فروغِ نگاہے
نہ در سینۂ او دلِ بیقرارے

(پیامِ مشرق ، ۱۳۴)

* * *

اگرچہ زادۂ ہندم فروغِ چشمِ من است
ز خاکِ پاکِ بخارا و کابل و تبریز

(پیامِ مشرق ، ۲۰۳)

* * *

ترا جوہر ہے نوری ، پاک ہے تو
فروغِ دیدۂ افلاک ہے تو

(بالِ جبریل ، ۱۱۹)

* * *

اے سوارِ اشہبِ دوران بیا
اے فروغِ دیدۂ انسان بیا

(اسرارِ خودی ، ۵۱)

* * *

رہِ دراز بریدم ز ماہ پرسیدم
سفر نصیب ! نصیبِ تو منزلے است کہ نیست؟

جہاں ز پرتوِ سیمائے تو سمن زارے
فروغِ داغِ تو از جلوۂ دلے است کہ نیست ؟

سوئے ستارہ رقیبانہ دید و ہیچ نہ گفت

"نظم تنہائی"
(پیامِ مشرق ، ۱۳۷)

ان سب شعروں میں جو علی الترتیب ''پس چہ باید کرد'' ''پیام مشرق'' ''بال جبریل'' ''اسرار خودی'' اور ''پیام مشرق'' سے لیے گئے ہیں ''فروغ'' روشنی اور نور کے معنی میں استعمال ہوا ہے لیکن ہر جگہ لفظ سے جو مفہوم برآمد ہوتا ہے وہ روشنی اور نور کے لفظوں کے معنوی حدود سے وسیع تر ہے ، خاص کر فروغ دیدۂ افلاک ، فروغِ دیدۂ آسماں اور فروغِ داغ تو ، کی ترکیبوں میں -

اب چند شعر ایسے ملاحظہ کیجیے جن میں ''فروغ کا لفظ 'ترقی' یا 'رونق' کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے :

علمِ اشیا داد مغرب را فروغ
حکمتِ او ماست می بندد ز دوغ

(پیام مشرق ، ٦)

* * *

سحرہا در گریبانِ شبِ او ست
دو گیتی را فروغ از کوکبِ او ست

نشانِ مردِ حق دیگر چہ گویم
چو مرگ آید تبسم بر لبِ او ست

(ارمغانِ حجاز ، ١٦٥)

* * *

ذوقِ تخلیق آتشے اندر بدن
از فروغِ او فروغِ انجمن

(خلافتِ آدم ، جاوید نامہ ٧٦)

* *

فروغِ دانشِ ما از قیاس است
قیاسِ ما ز تقدیرِ حواس است

(زبورِ عجم ، ۲۳۶)

لیکن ان اشعار کو بھی غور سے پڑھا جائے تو ان میں آنے والا 'فروغ' کا لفظ محض 'ترقی' یا محض 'رونق' سے زیادہ کچھ اور کہنا چاہتا ہے ، اور جو کچھ وہ کہنا چاہتا ہے اسے جس حد تک لفظوں میں ادا کیا جا سکتا ہے اس سے زیادہ صرف محسوس کیا جا سکتا ہے ، اور مفہوم کو محسوس کرنے والی بات ان شعروں میں اور بھی زیادہ ہے جن میں شاعر نے 'فروغ' کے لفظ کو کئی ملے جلے معنوں میں اس طرح استعمال کیا ہے کہ کئی لفظ مل کر بھی اس مفہوم کا پوری طرح احاطہ نہیں کر سکتے - یہ شعر تخیل کی جولان گاہ البتہ بنتے ہیں اور ہم 'فروغ' کے لفظ میں سے زندگی کے وہ گونا گوں نقش ابھرتے دیکھتے ہیں ، جو اپنی رنگینی اور تابناکی میں ان نقوش سے مختلف ہیں جن کا مشاہدہ نگہِ ظاہربیں کرتی ہے - جاوید نامہ ، پیام مشرق، بال جبریل ، اور ضربِ کلیم کے ان شعروں کی یہی کیفیت ہے :

فروغِ مشتِ خاک از نوریان افزون شود روزے
زمین از کوکبِ تقدیرِ او گردون شود روزے

(جاوید نامہ ۱۰ (نغمۂ ملائک)

* * *

فروغِ او بہ بزمِ باغ و راغ است
گل از صہبائے او روشن ایاغ است

شبِ کس در جہان تاریک نگزاشت

کہ در ہر دل ز داغِ او چراغ است

(پیامِ مشرق ، ۶۵)

* * *

مردِ خدا کا عمل ، عشق سے صاحب فروغ

عشق ہے اصلِ حیات، موت ہے اس پر حرام

(مسجد قرطبہ ، بالِ جبریل ، ۱۲۷)

* * *

یہ ایک بات کہ آدم ہے صاحبِ مقصود

ہزار گونہ فروغ و ہزار گونہ فراغ

(جاوید نامہ ، ۱۵۷)

* * *

وہ دانائے سبل، ختم الرسل، مولائے کل جس نے

غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیِ سینا

(بالِ جبریل ، ۱۱۹)

* * *

اور پھر بالآخر ضرب کلیم کے یہ دو شعر :

عجب نہیں کہ پریشاں ہے گفتگو میری
فروغِ صبح پریشاں نہیں تو کچھ بھی نہیں

(ضربِ کلیم ، ۲۹)

* * *

مہر و مہ و مشتری چند نفس کا فروغ
عشق سے ہے پائدار تیری خودی کا وجود

(اہلِ ہنر سے ، ضرب کلیم ، ۱۱۰)

ان سب شعروں میں 'فروغ' کے لفظ سے معنی اور مفہوم کا جو تصور ابھرتا ہے وہ نہ محض روشنی و نور ہے ، نہ محض رونق و ترقی اور نہ محض عظمت و رفعت ۔ شعر پڑھ کر گرد و پیش کے ماحول کی جو تصویر ہمارے ذہن میں بنتی ہے اس میں ان سب رنگوں کا ملا جلا عکس ہے جو ان میں سے ہر لفظ میں الگ الگ جلوہ فگن ہے اور تصورات کی یہ ملی جلی کیفیت جہاں ایک طرف ذہن کے لیے نشاط و انبساط کا سرمایہ مہیا کرتی ہے ، اس سے دل کے تاروں میں کبھی ایک لرزش خفی پیدا ہوتی ہے اور دل ایک ایسے جمالیاتی احساس سے آشنا ہوتا ہے جو بہ یک وقت رنگ بھی ہے اور نغمہ بھی اور یہ اسلوب شعری کا ایسا اعجاز ہے جس سے ہم اقبال کے وسیلے سے آگاہ ہوئے ہیں ۔ اقبال نے ایک جگہ کہا ہے :

ز شعرِ دلکشِ اقبال می‌توان دریافت
کہ درسِ فلسفہ می داد و عاشقی ورزید

'عاشقی ورزید' میں مجھے کلام اقبال کی اس خصوصیت کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ شعر کا موضوع خواہ فلسفہ ہی کیوں نہ ہو اس کا اسلوب ہمیشہ دل آویز اور دل نشیں ہوگا ، اور شعر اقبال میں دل آویزی اور دل نشینی دوسری بہت سی چیزوں کے علاوہ اس بات سے بھی پیدا ہوئی ہے کہ وہ لفظ کی معنوی اہمیت کے علاوہ اس کی جمالیاتی حیثیت کے رمز شناس ہیں ، اور لفظ کو شعر میں صرف اس لیے جگہ دیتے ہیں کہ وہ بہ یک وقت فلسفی کی میراث بھی ہے اور شاعر و مغنی کی بھی اور 'فروغ' کا لفظ میراث کے اس مشترک سرمایے اور خزینے کا صرف ایک لعل بے بہا ہے -

(سہ ماہی اقبال ریویو ، کراچی ، جولائی ۱۹۷۵ء)

جائزے

۱ - اقبالیات کے پانچ سال ۱۹۳۷ء-۱۹۴۱ء

۲ - 'اقبال کی شخصیت اور شاعری' پر ایک نظر

۳ - اقبال کی شاعری کے ادوار

۴ - اقبال کی اردو اور فارسی غزل

۵ - اقبال کی فطرت نگاری اور ان کا فلسفۂ جمال

۶ - پیغامِ اقبال کی آفاقیت

۷ - اقبال کا نظریۂ وطنیت

۸ - اقبال اور اشتراکیت

اقبالیات کے پانچ سال ۱۹۳۷-۱۹۴۱ء

(۱)

غالب ، انیس اور اقبال——اردو کے یہ تین ایسے خوش نصیب شاعر ہیں جن کی زندگی اور کلام کے متعلق اردو اور انگریزی میں بہت کچھ لکھا گیا ہے ، ان کی زندگی میں بھی اور آن کے مرنے کے بعد بھی - انیس کی عظمت لوگوں کے دلوں میں اب بھی ہے لیکن افسردہ دلی کچھ لکھنے نہیں دیتی اور شاید جو کچھ لکھا جا چکا ہے ، اس کے بعد لکھنے کی زیادہ گنجائش بھی باقی نہیں - غالب پر لکھنے کا فیشن جسے کسی حد تک craze کہہ سکتے ہیں شاید ابھی جاری رہتا ، لیکن اس craze نے غالب سے ہٹ کر اب اقبال کو اپنا مرکز بنا لیا ہے -

اقبال کی زندگی میں آن کے کلام پر بہت کچھ لکھا گیا - متعدد مضامین کے علاوہ اردو میں ایک کتاب ''اقبال'' مرحوم کی زندگی ہی میں شائع ہو چکی تھی[1] لیکن اقبال کے انتقال کے بعد سے

---

۱ - ''اقبال'' از : مولوی احمدالدین بی - اے ''اقبال کی اردو منظومات، ان کے مقصدِ شاعری اور خیالات کے نشو و نما ، مضامینِ کلام اور طرزِ بیان پر ایک نظر'' مطبع اسلامیہ ، اسٹیم پریس ، لاہور ، ۱۹۲۶ء ، صفحات : ۲۸۴ - کتاب پہلی بار ۱۹۲۴ء میں طبع ہوئی تھی لیکن علامہ نے کتاب کی اشاعت کو ناپسند کیا ، اس لیے مؤلف نے کتاب کے سارے نسخے جلا دیے - نظرِ ثانی کے ساتھ دو برس بعد کتاب پھر چھپی - مؤلف نے ۱۹۲۶ء کی اشاعت کو ''بار اول'' قرار دیا -

اب تک اچھی ، بری ، چھوٹی بڑی تقریباً ایک درجن کتابیں شائع ہو چکی ہیں ـــ مضمون ان کے علاوہ ـــ لیکن پھر بھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ اقبال پر ابھی لکھنا باقی ہے -

۱۹۳۷ء سے اب تک اردو میں جتنی کتابیں شائع ہوئی ہیں ، ان میں سے کچھ کے نام یہ ہیں :

۱ - جوہرِ اقبال

۲ - اقبال

۳ - اقبال نامہ

۴ - متاعِ اقبال

۵ - تعلیماتِ اقبال

۶ - سیرتِ اقبال

۷ - پیامِ اقبال

۸ - مقالاتِ یومِ اقبال

۹ - یادِ اقبال[1]

۱۰ - اقبال اور اس کی شاعری اور پیغام[2]

شروع کی تین کتابیں علی الترتیب ''جامعہ''ـ ''اردو''ـ ''شیرازہ''

---

۱ - ''علامہ اقبال کی وفات پر ہندوستان کے مقتدر شعراء کا اظہارِ عقیدت مندی'' مرتبہ : چوہدری غلام سرور فگار ، مطبوعہ : اقبال اکیڈمی ، لاہور ، ۱۹۴۰ء ، صفحات ۱۲۷ -

۲ - از : مولانا عبدالمالک آروی ، مطبوعہ : ادارہ طاق بستان ، آرہ ، ۱۹۳۸ء ، صفحات ۶۴ -

کے اقبال نمبر ہیں ۔ ان تین رسالوں کے مخصوص نمبروں کو کتابی صورت میں چھاپ دیا گیا ہے ۔

۲

''جوہرِ اقبال'' میں یوں تو کئی مضمون ہیں لیکن ان میں سے چار ، مختلف حیثیتوں سے قابل توجہ ہیں——ڈاکٹر عابد حسین کا مضمون : ''عقل و عشق'' ایک جامعی کا مضمون : ''اقبال— شخصیت اور پیام'' ڈاکٹر عبدالحمید کا مضمون : ''اقبال کا فلسفۂ زندگی و عمل'' اور پروفیسر محمد مجیب کا مضمون : ''ڈاکٹر اقبال'' ۔

اقبال کے کلام کا مطالعہ کرنے والے کو ان کی تصنیفوں میں ان کے فلسفۂ زندگی کے ساتھ ساتھ ، جا بجا عقل اور عشق نظر آتا ہے لیکن چونکہ پڑھنے والے کے ذہن میں عقل اور عشق کا ایک بنا بنایا مفہوم بسا ہوا ہے جس میں عشق ، مایوسی اور مہجوری ہے اور عقل اس مایوسی اور مہجوری کی تضحیک ؛ عشق ، اشک ریزی اور عقل ، تبسم ۔ عشق کی انتہا یہ ہے کہ جنون بن کر بھی مطمئن نہیں :

مجنوں مجنوں لوگ کہیں ہیں ، مجنوں کیا ہم سا ہوگا

عقل کی ابتدا کو بھی اس ''انتہا'' کی ہم نوائی گوارا نہیں ۔ تضاد کی اس شاعرانہ دنیا میں بسنے والے جب اقبال کو یہ کہتے سنتے ہیں کہ :

علم نے مجھ سے کہا عشق ہے دیوانہ پن
عشق نے مجھ سے کہا علم ہے تخمین و ظن

---

۱ مرتبہ : سید محمد حسنین ، مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ ، دہلی ،
طبع اول : ۱۹۳۸ء ، سائز : ۲۰ × ۸/۳۰ ، ص ۲۲۶
طبع دوم : مارچ ۱۹۴۰ء، سائز : ۲۰ × ۱۶/۳۰، ص ۲۸۵

بندۂ تخمین و ظن ، کرمِ کتابی نہ بن
عشق سراپا حضور ، علم سراپا حجاب

تو ان کی اس شاعرانہ (دنیا) میں ایک ہلچل سی پیدا ہو جاتی ہے - وہ طرح طرح کی الجھنوں میں پھنس کر رہ جاتے ہیں -

اقبال کی شاعری میں عقل اور عشق کا فلسفیانہ تصور ہر جگہ پیش کیا گیا ہے - وہ چونکہ ہمارے صدیوں کے بنے ہوئے تصور سے بالکل الگ سا ہے ، اس کی تعمیر میں دیوانگی کے نہیں بلکہ فرزانگی کے عناصر غالب ہیں ، اس لیے فرزانہ بنے بغیر اس کا ادراک بھی دشوار معلوم ہوتا ہے - عابد صاحب نے اپنے مضمون میں اس الجھن کو بڑے سلجھے ہوئے انداز میں دور کیا ہے اور کلام اقبال کی متعدد مثالیں دے کر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ :

''اقبال کے یہاں تصورِ عقل و عشق کا ماحصل یہ ہے کہ ان دونوں میں کوئی حقیقی فرق نہیں بلکہ مدارجِ ارتقا کا فرق ہے - عقل میں سوز پیدا ہو جائے تو وہ عشق بن جاتی ہے -''

''اقبال کی شخصیت اور پیام'' ایک خاص نقطۂ نظر سے بہت اچھا مضمون ہے - اقبال کے کلام کا مطالعہ اگر غور (سے) کیا جائے تو (یہ) اس فضا کا مطالعہ ہے جس سے متأثر ہو کر اقبال نے شعر کہے ہیں - دوسرے لفظوں میں یہ کہ اقبال کے کلام کے کسی پہلو کی نوعیت اور اس کی حقیقت سے آشنا ہونے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اس خاص پہلو کے مفصل پس منظر سے اچھی طرح واقف ہوں - اقبال کے پیام کی بنیاد ہر جگہ کسی نہ کسی سیاسی ، تاریخی ، معاشرتی ، فلسفیانہ ، اخلاقی یا مذہبی پس منظر

پر ہے اور اس پس منظر سے اچھی طرح واقف ہوئے بغیر اقبال کے کلام اور پیام کو سمجھ سکنے کا دعویٰ (عبث ہے) ۔

''اقبال کی شخصیت اور پیام'' میں مضمون نگار نے اقبال کے پیام کا وہ پس منظر ، منظرِ عام پر لانے کی کوشش کی ہے جس کی بنیاد کسی حد تک تاریخ اسلام اور بڑی حد تک اسلام کے پیغام کے چند مرکزی (نکات) پر ہے ۔ مضمون نگار نے اسلام کے پیغام کو ایک زنجیر بتایا ہے ۔ اس زنجیر کی پہلی کڑی آنحضرتؐ ہیں ، درمیانی کڑیاں امام غزالی اور مولانا روم اور آخری کڑی اقبال ۔ فطرت نے اسلامی زندگی میں انقلاب پیدا کرنے اور اس میں حیاتِ تازہ پیدا کرنے کے لیے ہمیشہ کسی نہ کسی پیامی کی ضرورت محسوس کی ۔ اس پیام میں آنحضرتؐ کے زمانے سے اب تک جس طرح تسلسل رہا ہے ، اسے مضمون نگار نے پیامِ اقبال کا پس منظر بنایا ہے اور اس لیے یہ مضمون اس لحاظ سے اچھا ہے کہ وہ ہمارے ذہن میں پیامِ اقبال کے ایک پہلو کا نقش واضح طور پر بٹھا دیتا ہے ۔

اس کتاب کا تیسرا اچھا مضمون ڈاکٹر عبدالحمید کا مضمون ''اقبال کا فلسفۂ زندگی و عمل'' ہے ۔ اس مضمون کی تقسیم بہت اچھی ہے ۔ مضمون نگار نے مضمون کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے : تصورِ خودی ، انسانیت کی خودی ، کائنات کی خودی یا خدا ۔ پہلے حصے میں خودی کے تصور کو واضح کیا ہے ۔ دوسرے حصے میں خودی کے صاف اور سیدھے مفہوم کے تحت کلام اقبال سے بحث کی ہے ۔ تیسرے حصے میں کہیں کہیں تصوف اور فلسفے کی بحثیں آ گئی ہیں اور مضمون نگار انھیں اچھی طرح واضح نہیں کر سکا ۔

چوتھا مضمون ، ''ڈاکٹر اقبال''۔[1] اقبال کا ایک چھوٹا سا لیکن بڑا دلکش سکیچ ہے اور اس سے اقبال کی شخصیت کے بعض ایسے پہلو ہمارے سامنے آتے ہیں کہ ہم اپنے آپ کو شاعر سے قریب محسوس کرتے ہیں ۔ سکیچ میں جذبات کی ہلکی سی جھلک ہے ۔ طرز میں سادگی اور شگفتگی ہے ، لیکن ان دونوں چیزوں پر سیدھی سادی سچائی کا رنگ غالب ہے ۔ اس لیے نہ دیکھنے والوں کے سامنے بھی چلتے پھرتے ، ہنستے بولتے اقبال کی ایسی تصویر آتی ہے جس کے لیے دل میں رعب ، وقار ، عزت اور محبت کے جذبات ساتھ ساتھ پیدا ہوتے ہیں ۔

(۳)

دوسری کتاب ''اقبال''[2] مجموعی حیثیت سے ''جوہر اقبال'' سے اچھی ہے ۔ ایک تو اس لیے کہ اسے پڑھ کر کلامِ اقبال کے وہ پہلو زیادہ روشن ہو جاتے ہیں جن پر ''جوہرِ اقبال'' میں بحث کی گئی ہے ۔ دوسرے یہ کہ ''اقبال'' کے مضامین میں ''جوہرِ اقبال'' کے مقابلے میں توازن کہیں زیادہ ہے اور ان دونوں باتوں سے بھی زیادہ یہ کہ ''اقبال'' میں کلامِ اقبال کے بعض ان پہلوؤں پر اچھی بحث کی گئی ہے جنھیں اب تک کسی نے نہ چھیڑا تھا یا اگر چھیڑا بھی تھا تو صرف چھیڑ کر چھوڑ دیا تھا——اقبال مرحوم پر اب تک جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں اُن کے مضامین کا انتخاب کر کے

---

۱ ۔ مضمون نگار : پروفیسر محمد مجیب ۔

۲ ۔ ''علامہ اقبال کی زندگی ، ان کی شاعری اور فلسفے پر سیر حاصل محققانہ مضامین کا مجموعہ'' (طبع جدید :''اقبال نمبر'' رسالہ :''اردو'' دہلی ، اکتوبر ۱۹۳۸ء) مرتبہ : بابائے اردو مولوی عبدالحق ، مطبوعہ : انجمن ترقیٔ اردو ، ہند ، دہلی ۱۹۴۰ ، صفحات ۳۷۶ ۔

اگر ایک جگہ چھاپا جائے تو دو ایک مضمونوں کو چھوڑ کر اس کتاب کے باقی سارے مضمون ایسے ہیں جو اس انتخاب میں آ جائیں گے۔

اس کتاب کا سب سے پہلا مضمون ڈاکٹر عابد حسین کا مضمون ''اقبال کا تصورِ خودی'' ہے۔ ''جوہرِ اقبال'' میں ڈاکٹر عبدالحمید نے تصورِ خودی کی تشریح کی ہے۔ وہ تشریح اس نقطۂ نظر سے تو اچھی ہے کہ اوسط طبقے کے لوگ اس سے کسی حد تک مطمئن ہو جاتے ہیں اور اقبال کے فلسفۂ خودی کا تصور قائم کرنے میں انھیں جس الجھن سے دوچار ہونا پڑتا تھا، وہ بھی دور ہو جاتی ہے، لیکن اقبال کے کلام کے کسی پہلو کو اس سرسری نظر سے دیکھ کر اس کی صحیح حقیقتوں کا محاکمہ ممکن نہیں۔ اس کے لیے گہری فلسفیانہ نظر اور منطقی ادراک و استدلال کی ضرورت ہوتی ہے۔

عابد صاحب کا مضمون اسی لیے بہت اچھا ہے کہ اس میں اقبال کے تصورِ خودی کو گہری فلسفیانہ نظر سے دیکھا گیا ہے اور اس کے خاص خاص پہلوؤں پر منطقی استدلال کے بعد محاکمہ کیا گیا ہے، اس لیے اقبال کے فلسفۂ خودی کا فلسفیانہ تصور اچھی طرح ہمارے سامنے آ جاتا ہے۔ عابد صاحب نے فلسفیانہ مباحث کو صاف اور سلجھے ہوئے انداز میں پیش کیا ہے اور فلسفے کی خشکی کی تلافی اپنے شاعرانہ اندازِ بیان سے کی ہے۔ فلسفیانہ خیال، منطقی استدلال اور شاعرانہ انداز، یہ تینوں چیزیں جب یک جا ہو جائیں تو نہ خشک فلسفیوں کو ناک بھوں چڑھانے کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ خالص شاعروں کو۔

اقبال کے نام کے ساتھ ''فلسفے'' کا لفظ اتنا زیادہ استعمال کیا

گیا ہے کہ اب اقبال کے شعر اور فلسفے کے تصور کو ایک دوسرے سے الگ کرنا بھی دشوار سا ہوگیا ہے ، لیکن اگر کوئی کہے کہ آخر اس فلسفے کا مطلب کیا ہے ؟ تو ہم میں سے بہت کم لوگ کوئی تشفی بخش جواب دے سکیں گے - اگر اس سے وہی چیز مراد ہے جس کا نتیجہ ''مغز سر کا اماس'' ہوتا ہے تو ظاہر ہے کہ اس میں اور شعر میں کوئی علاقہ نہیں اور اس لحاظ سے یہ فلسفہ اقبال کی شاعرانہ حیثیت پر ایک بدنما دھبہ ہے اور مشکل یہ ہے کہ ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ اقبال کے شعر میں فلسفہ نہیں -

اس ساری کشمکش کی تان جا کر اقبال کی شاعرانہ عظمت پر ٹوٹتی ہے - اگر اقبال کا شعر فلسفہ ہے تو وہ آن وجدانی کیفیتوں سے محروم ہے جو شعر کو فلسفے کی خشکی کا بدل قرار دیتی ہیں - اگر اس میں فلسفہ نہیں تو پھر ہے کیا ؟ ان ساری الجھنوں کا جواب عابد صاحب نے بڑے جامع انداز میں دیا ہے —— یعنی ''شعر کے لیے فلسفے کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے تو فلسفے کی صرف ایک ہی صفت مدِ نظر ہوتی ہے ، یعنی موضوع کی کلیت اور ہمہ گیری - اقبال کا کلام فلسفیانہ اس معنی میں ہے کہ وہ ایک کلی تصورِ حیات پیش کرتا ہے -''

آگے چل کر فاضل مضمون نگار نے بتایا ہے کہ اقبال کے نزدیک ملتِ اسلامی کے زوال کی حقیقی وجہ ''نفیِ خودی'' ہے اور اسے وہ ''اثباتِ خودی'' کے نظریے سے رد کرنا چاہتے ہیں - اقبال نے خودی کا لفظ کبر اور غرور کے معنوں میں استعمال نہیں کیا بلکہ ایک فلسفیانہ اصطلاح کے طور پر اس احساس اور عقیدے کے لیے استعمال کیا ہے کہ فرد کا نفس یا انا گو ایک مخلوق اور خالی ہستی ہے لیکن یہ ہستی اپنا ایک علیحدہ وجود رکھتی ہے جو عمل سے پائیدار اور لازوال ہو جاتا ہے - اس کا مفہوم احساسِ

نفس یا تعینِ ذات ہے - خودی کا یہی تصور اقبال کے فلسفۂ حیات و کائنات کی بنیاد ہے -

اس کتاب کا دوسرا اچھا مضمون خلیفہ عبدالحکیم صاحب کا مضمون ''رومی ، نطشے اور اقبال'' ہے - اقبال کو فلسفی شاعر کہنے کے بعد اب تک عام طور پر لوگوں نے یہ ضروری سمجھا کہ جب اُس کی شاعری میں فلسفے کا ذکر کریں تو ایک سانس میں جتنے نئے پرانے فلسفیوں اور مفکروں کے نام لیے جا سکتے ہیں لے کر ، کسی طرح کھینچا تانی کر کے یہ ثابت کر دیں کہ اقبال پر ان سب کا کوئی نہ کوئی اثر ہے - حالانکہ اقبال جیسے فلسفی شاعر کا مطالعہ کرتے وقت کوئی Sweeping Remark دینا تنقید کے راستے سے الگ جا پڑنا ہے - یہی وجہ ہے کہ اب اقبال کے کلام کے کسی پہلو پر کچھ لکھنے سے پہلے سمجھ دار لوگ اس پہلو کی اونچ نیچ کا مطالعہ اچھی طرح کر لیتے ہیں ، پھر کچھ لکھتے ہیں - یہی وجہ ہے کہ اقبال کے کلام کے متعلق جو غلط تصورات عام ہوگئے تھے وہ سمٹ سمٹ کر کوئی مرکزی شکل اختیار کرتے جاتے ہیں - ''رومی ، نطشے اور اقبال'' اس طرح کے مضامین میں ایک وقیع حیثیت رکھتا ہے جو بھٹکے ہوؤں کو راہ پر لگانے میں شمع ہدایت کا کام دے سکتے ہیں -

فاضل مضمون نگار کا Thesis یہ ہے کہ افکار اور تصورات کے تنوع اور بوقلمونی کے باوجود بھی ''خودی'' اقبال کا خاص موضوع ہے اور اس نظریۂ حیات کے لحاظ سے اس نے اپنے سے پہلے کے دو مفکروں میں یکسانیت پائی اور اس لیے شاعری میں ان دونوں کے خیالات کی ترجمانی کی ہے - یہ دو مفکر ہیں : رومی اور نطشے — اس Thesis کی بنیاد پر فاضل مضمون نگار نے پہلے رومی کے تصوف

کی تشریح کی ہے اور اس کا واضح پس منظر ہمارے سامنے پیش کیا ہے ؛ اس کے بعد نطشے کا نظریۂ حیات پیش کیا ہے ، پھر مثالوں کے ذریعے سے واضح کیا ہے کہ اقبال پر کہاں کہاں ان دو مفکروں کا اثر نمایاں ہے اور انھوں نے دونوں کے افکار کے کون سے اجزا کو اپنا بنایا ہے ۔

اقبال اور رومی دونوں اعلیٰ درجے کے شاعر ہیں ، دونوں اسلامی شاعر ہیں ، دونوں کی شاعری حکیمانہ ہے ، دونوں معقولات کے سمندر کے تیراک ہونے کے باوجود وجدانات کو معقولات پر ترجیح دیتے ہیں ۔ دونوں خودی کی تقویت چاہتے ہیں ۔ دونوں ارتقائی مفکر ہیں ۔ دونوں قرآن کے آدم کو نوع انسان کی معراج کا ایک نصب العینی تخیل سمجھتے ہیں ۔ دونوں کے نزدیک جد و جہد زندگی اور خفتگی موت ہے ۔ دونوں کے یہاں بقا مشروط ہے سعیِ بقا پر ۔ نطشے سے اقبال نے تعمیرِ خودی، استحکامِ خودی اور عروجِ آدم کے تصورات لیے ۔ عارف رومی کا نظریہ ہے کہ زندگی میں نہ رجعت ہے نہ تکرار ۔ اس نظریے میں اقبال رومی کا ہم نوا ہے اور دونوں نطشے کے مخالف ہیں ۔

اس مجموعے کا تیسرا بہت اچھا مضمون ڈاکٹر یوسف حسین خان کا مضمون ''اقبال اور آرٹ'' ہے ۔ اقبال کے کلام کے اس پہلو پر اب تک کسی کی نظر نہیں گئی تھی ۔ ڈاکٹر یوسف نے اقبال کے آرٹ کے تصور اور اس کی شاعری کے آرٹ کا تجزیہ بڑے عالمانہ انداز میں کیا ہے ۔ آرٹ کے علمی پہلوؤں پر بحث کرتے وقت غالب ، رومی ، شیکسپیئر ، کیٹس وغیرہ کے کلاموں سے جو مبصرانہ نوٹ دیے ہیں ، ان سے پڑھنے والے کے ذہن میں سب سے پہلے تو آرٹ کا علمی تصور اچھی طرح جم جاتا ہے ، پھر اسی تصور کے سہارے وہ اقبال کے افکار کا مطالعہ کرتا ہے ۔

یوسف صاحب نے اپنے مضمون کی بنیاد جس Thesis پر رکھی ہے وہ یہ ہے کہ اقبال آرٹ کو آرٹ کی خاطر نہیں برتتا ، بلکہ اُسے مقاصد حیات کے حصول کا ذریعہ بناتا ہے :

نغمہ کجا و من کجا سازِ سخن بہانہ ایست
سوئے قطار می کشم ناقۂ بے زمام را

یا

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ
کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ میخانہ

اقبال کا آرٹ اس کے فلسفۂ خودی کا تابع ہے - وہ آرٹ جس میں خودی باقی نہیں رہتی ، اقبال کے نزدیک کوئی مستحسن چیز نہیں - فطرت کا وجود آرٹسٹ کا ممنونِ نظر ہوتا ہے -

آگے چل کر فاضل مضمون نگار نے اقبال کے شاعرانہ آرٹ کے سلسلے میں اُس کی رمزیت ، بحروں کے انتخاب ، اوزان ، تشبیہوں ، استعاروں ، مصوری ، منظر کشی ، محاکات اور الفاظ و معنی کی موزونیت کا ذکر کر کے اقبال کے کلام کی موزوں مثالیں دی ہیں اور اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اقبال نے اپنے آرٹ سے ہمارے تصورِ حیات کو وسیع تر بنا دیا ہے -

مجموعے میں ان تین بہت اچھے مضمونوں کے علاوہ اقبال کی شخصیت اور اس کا پیغام[۱]، اقبال کا ذہنی ارتقا[۲]، اقبال کا تصورِ زماں،[۳]

---

۱ - از : ڈاکٹر عبدالحمید—بغیر مثالوں کے اقبال کے کلام کے تمام پہلوؤں پر اظہار رائے -
۲ - از : ابو ظفر عبدالواحد—ارتقا میں نظموں کی تقدیم و تاخیر کا خیال نہیں ، ہندی الفاظ بلا ضرورت -
۳ - از : سید بشیر الدین احمد—سائنس کا نظریہ -

اقبال کی آخری علالت ،[1] اقبال اور اس کے نکتہ چیں ،[2] پانچ مضامین اور ہیں - ان میں سے پہلے تین کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اقبال کے کلام کے مختلف پہلوؤں کے اچھے خاکے ہیں ، گو عالمانہ اور مبصرانہ نہیں ، پھر بھی انہیں پڑھ کر اقبال کے سمجھنے میں انسان کو کچھ نہ کچھ آگے بڑھنے میں ضرور مدد دیتے ہیں ، اس لیے قابلِ قدر ہیں -

نذیر نیازی صاحب کے مضمون ''اقبال کی آخری علالت'' میں سے اگر کچھ غیر ضروری تفصیلات نکال دی جائیں تو اس سے مرحوم کی آخری زندگی کی بڑی اچھی تصویر ذہن میں آ جاتی ہے - آلِ احمد سرور صاحب کا مضمون ''اقبال اور اس کے نکتہ چیں'' بے حد دل چسپ مضمون ہے جس میں آپ نے اقبال کے نکتہ چینوں اور ان کی نکتہ چینیوں کو ایک غیر جانب دار نقاد کی نظر سے دیکھ کر ان کے جواب دیے ہیں - اگر مضمون ذرا اور مفصل ہوتا تو اور بھی بصیرت افروز ہو جاتا -

اقبال پر اب تک جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں ، میں نے ان میں سے صرف دو کا مختصر طور پر ذکر کیا ہے اور ان دو کتابوں میں بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن سے اقبال کے کلام کے سمجھنے اور اس کی تہہ تک پہنچنے میں بڑی مدد ملتی ہے - ان کے علاوہ اور بھی بہت سی کتابیں ہیں :

---

۱ - از : سید نذیر نیازی—اس طرح کے مضامین سے کلام کی اہمیت ، پڑھنے والا چونکہ شاعر سے قرب محسوس کرتا ہے ، اس لیے کلام کو چلتی پھرتی زندگی کا ہم عناں سمجھتا ہے - کلام میں ہر جگہ زندگی لہریں لیتی دکھائی دیتی ہے -

۲ - از : آلِ احمد سرور -

''اقبال نامہ''[۱]——شیرازہ کے 'اقبال نمبر' کی کتابی شکل ہے۔ اس میں مختلف لوگوں نے اقبال کے وہ حالات لکھے ہیں جو خود آن کے مشاہدے میں آئے۔ اقبال کے حالات کے بعض ایسے پہلو جن پر عام سیرت نگار کی نظر نہیں جاتی یا جن سے وہ آسانی سے واقف بھی نہیں ہو سکتا، اس کتاب کے مختلف مضامین میں بہت سے ہیں۔

---

۱ - مرتبہ: چراغ حسن حسرت، مطبوعہ، تاج کمپنی لمیٹڈ، لاہور صفحات ۱۲۴۔

طبع جدید: رسالہ شیرازہ، لاہور، اقبال نمبر، مئی ۱۹۳۸ء [م-ا-ر]

اقبالنامہ: زندگی کے چشم دید واقعات——تاریخی حیثیت سے بڑی قیمتی چیز (کہیں کہیں زیبِ داستان کے لیے کچھ باتوں کا اضافہ)

علی بخش: ''مولوی احمد دین بڑے پڑھے لکھے آدمی تھے۔''

سالک: سائیں کا واقعہ (قطرہ، دریا، دولت؟ نہیں! جاہ؟ نہیں)—— تفصیلی مضمون کا وعدہ۔

حکیم محمد حسن قرشی: دوسرے مضمون کا وعدہ——ڈاکٹری دوائیں ——ان میں مریض کے مذاق کا خیال نہیں رکھا جاتا۔

مہر: موت کے واقعات۔

عاشق بٹالوی: واقعات۔

اکبر کے خط: بہت اچھے (ایک بڑے شاعر کے خیالات، شاعری کے ابتدائی زمانے میں، اکتوبر ۱۹۱۱ء مارچ ۱۹۱۳ء)

نذیر نیازی کا روزنامچہ: بہت اہم چیز (پورے روزنامچے کے شائع ہونے کی ضرورت)، علمی بحثیں۔

قاسمی: چشم دید واقعات۔

فارابی القمری: اقبال جامعہ میں۔

''اقبالنامہ'' کا Style ذرا اور وقیع ہونا چاہیے تھا۔ قصے کا انداز پیدا کرنا ضروری تھا۔ کوئی اور آدمی اسے Edit کر سکتا ہے۔ جذبات کا رنگ غالب ہے، اس لیے بعض چھوٹی چھوٹی باتیں بھی آ گئی ہیں۔ ان کی ادبی حیثیت۔ [و-ع]

''مقالاتِ یومِ اقبال''[۱]——اقبال پر کچھ انگریزی اور کچھ اردو کے مضامین کا مجموعہ ہے - بعض مضمون بہت اچھے ہیں - ''سیرتِ اقبال''[۲] اقبال کی حیات اور اُن کے کلام پر ایک مفصل ریویو کی کوشش ہے - اقبال کی زندگی اور اُن کے کلام کے مختلف پہلوؤں سے واقف ہونے کے لیے یہ کتاب بہت مفید ہے - کتاب کی تقسیم بہت اچھی ہے - اقبال کی زندگی اور کلام پر سب سے ضخیم کتاب (سوانح حیات ستر صفحات ، شاعری ، اُن کی شاعری کی خصوصیات ، تصانیف ، زمانے کے اعتبار سے—— اقبال کا پیغام ، شریعت ، طریقت ، سیاست ، اقبال کا خطاب) سیدھے سادے انداز میں سب کچھ موجود ہے - گہری فلسفیانہ نظر نہیں ، اس لیے عوام کے لیے یہ کتاب بہت مفید ہے - مثالوں کے انتخاب میں زیادہ کاوش اور دقتِ نظر کی ضرورت تھی - عام نقادوں کی طرح رائیں Sweeping ہیں اور اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں ، اقبال کا کلام پڑھنے والا اپنی رایوں میں توازن قائم نہیں رکھ سکتا -

''متاعِ اقبال''[۳]——''تعلیماتِ اقبال''[۴]——''پیام اقبال''[۵] میں مختلف حضرات نے اقبال کے کلام کے مختلف پہلوؤں کو اپنی نظر

---

۱ - انٹر کالجییٹ مسلم برادر ہڈ کے زیرِ اہتمام منعقدہ یومِ اقبال ۹ جنوری ۱۹۳۸ء میں پڑھے جانے والے اردو اور انگریزی مقالات کا مجموعہ۔ مطبوعہ : قومی کتب خانہ ، لاہور ، ۱۹۳۸ء ، حصہ اردو ۱۰۸ صفحات ، حصہ انگریزی ۱۱۴ صفحات -

۲ - از : پروفیسر محمد طاہر فاروقی ، مطبوعہ قومی کتب خانہ ، لاہور ، ۱۹۳۹ء ، ۴۳۹ صفحات -

۳ - مرتبہ : ابو ظفر عبدالواحد ، مکتبہ ابراہیمیہ پریس ، حیدر آباد دکن ، ۱۹۳۹ء ، صفحات ۱۰۰ (م-ا-ر) ''متاعِ اقبال'' تین شائع شدہ

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

سے دیکھا ہے ۔ اگر ذرا اور توازن سے کام لے کر ان کتابوں کے

(پچھلے صفحے کا بقیہ حاشیہ)

مضامین کا مجموعہ ہے : ذہنی ارتقا (مطبوعہ ''اردو''—، اقبال کا شاعرانہ فلسفہ مطبوعہ : ''سب رس'')—اقبال کی شاعری اور اس کا پس منظر (''ریڈیو'' کے لیے لکھا گیا) ، اس مضمون کی تاریخی تمہید زائد ہے ۔ اقبال کی شاعری کا پس منظر ، حالی اور اکبر کی شاعری ہے ۔ دوسرے مضمون کا مطلب صاف نہیں کہ ''اقبال کا شاعرانہ فلسفہ'' سے مراد کیا ہے ؟ ''فلسفے'' کا مفہوم صاف نہیں ۔ ایک جملہ ہے : ''پیامِ مشرق'' اور دوسری فارسی تصانیف محض فلسفیانہ نظر کے سوا کوئی تعمیری یا کام کا فلسفہ نہیں—اقبال کا فلسفیانہ خواب ناکام ہوا ۔ مضمون صرف کلام کے کچھ حصوں کا تاریخی پس منظر پیش کرتا ہے ۔ ضرورت ہے کہ لوگ زیادہ ذمہ داری محسوس کرکے لکھیں ۔ جذبات کی رو اور قلم کی روانی کے ساتھ بہنا ٹھیک نہیں ۔'' (و-ع) ۔

۴ - از : یوسف سلیم چشتی ، مطبوعہ : اقبال اکیڈمی ، لاہور ، ۱۹۴۱ء، صفحات ۱۳۵ (م-ا-ر)

''یوسف سلیم ، مختلف پہلوؤں سے کلام اقبال پر بحث کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں، ''تعلیمات اقبال'' اس سلسلے کی پہلی کڑی ہے ۔ ہندو فلسفہ خودی کی بحث ، بے محل سی ہے ۔ پیغام اقبال سے چار عنوانوں کے تحت بحث کی گئی ہے : دعوت اسلام ، اصلاح عقائد ، تنبیہات ، ہدایات—ہر سلسلے میں بحثوں کو چھیڑ کر تشنہ چھوڑ دیا ہے ۔ اقبال نے تحریک وطنیت ، جمہوریت ، ملوکیت ، اشتراکیت ، سرمایہ داری ، تہذیب مغرب پر جو نکتہ چینی کی ہے اس پر صرف دو صفحوں میں اظہار خیال نہیں کیا جا سکتا'' (و-ع) ۔

۵ - عبدالرحمان طارق ، مطبوعہ : تاج کمپنی لمیٹڈ ، لاہور ، ۱۹۳۸ء ، صفحات ۲۰۰ (م-ا-ر) ۔

مختلف مضامین کو مرتب کیا جائے تو ان میں سے کافی کام کی چیزیں نکل آئیں گی - ان کتابوں کے علاوہ اردو اور انگریزی کے رسالوں میں اقبال کے کلام کے مختلف پہلوؤں پر بعض اچھے مضامین شائع ہوئے ہیں - کچھ اور لوگوں نے کلام اقبال پر بعض چھوٹے چھوٹے رسالے شائع کیے ہیں - اس طرح اقبال کی زندگی اور آن کے کلام پر ادھر اُدھر بکھرا ہوا مواد خاصی مقدار میں موجود ہے اور اس مواد پر نظر ڈالنے کے بعد پڑھنے والے کو کچھ اچھی اور کچھ بری باتیں محسوس ہوتی ہیں -

ان مضامین کا سب سے اچھا اور روشن پہلو تو یہ ہے کہ ان سے اقبال کے کلام کی بے پایاں وسعتوں اور اتھاہ گہرائیوں کا اندازہ ہوتا ہے - ہر نظر کو اس گہرے سمندر میں ایک نیا موتی نظر آتا ہے ، جس کی آب و تاب ہر دوسرے موتی سے بڑھ چڑھ کر ہوتی ہے - اقبال کے ذہن کی وسعت اور زندگی کی ہمہ گیری کا اندازہ ، آن کے کلام کا ہر پڑھنے والا شاید آسانی سے نہیں کرسکتا ، لیکن جب یہ مضامین آن کے کلام کا پس منظر بن جاتے ہیں تو پڑھنے والوں کی طرح طرح کی اُلجھنیں خود بخود دور ہو جاتی ہیں -

اقبال کو لوگوں نے جیسا خود دیکھا ہے اور آن کی زبان سے جو کچھ سنا ہے ، آس کا ذکر جذباتی حیثیت سے بھی کچھ کم اہم نہیں ، لیکن ان مضامین کی قدر اس لیے اور زیادہ ہے کہ وہ اقبال کے پیام کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں اور اقبال کی شخصیت اور ان کا پیام ، دونوں چیزیں ہمیں ایک ہی سانچے میں ڈھلی ہوئی معلوم ہونے لگتی ہے —— یہ سب کچھ ہے لیکن ایک کمی بھی محسوس ہوتی ہے ، اور وہ یہ کہ ابھی اقبال پر بہت کچھ لکھنا باقی ہے - یہ سب جانتے ہیں کہ اقبال پر ابھی بہت کچھ لکھا جائے

گا ، لیکن ضرورت تو اس بات کی ہے کہ جو کچھ لکھا جائے ، وہ شاعر کے دل اور فلسفی کی نظر سے لکھا جائے ۔ اقبال کی ''نوا'' کو صرف شاعری سمجھ کر اس پر کچھ لکھنا مشکل ہے، جب تک ہم اسے ''محرمِ رازِ درونِ مے خانہ'' بھی نہ سمجھیں ۔

اقبال کی شاعری کے ادوار

"سرشیخ عبدالقادر مرحوم نے اقبال کی شاعری کے تین دور تاریخی اعتبار سے مقرر کیے ہیں جن میں اقبال کے شاعرانہ اور دماغی ارتقاء کا لحاظ رکھا گیا ہے - - - - ان ادوار ثلاثہ کا کوئی تفصیلی پس منظر ہمارے سامنے نہیں ہے ، نہ آن داعیات و اسباب سے ہم واقف ہیں جنھوں نے اقبال کو شعر کہنے پر آمادہ کیا"*

قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی

○

"اقبال کی شاعری کا ارتقا" — "اقبال کا فکری ارتقا" — "اقبال کا ذہنی ارتقا" — "اقبال کی شاعری کے ادوار" جیسے عنوانات کے تحت اقبال کی شاعری پر اتنا کام ہوا ہے کہ آس سے اچھا خاصا دفتر مرتب کیا جا سکتا ہے - بعض دوسرے اہم موضوعات کی طرح اس موضوع پر بھی اقبال کی زندگی ہی میں مختلف طرح کے خیالات ظاہر کیے جاتے رہے - مثلاً مضامین کے ایک ایسے مجموعے میں جو اقبال کے معاصرین کی تحریروں پر مشتمل** ہے

---

*اقبالیات کا تنقیدی جائزہ ، کراچی ، نقش ثانی جون ۱۹۶۵ء ، صفحہ ۵۳ -

**'اقبال معاصرین کی نظر میں' مرتبہ : پروفیسر سید وقار عظم، مطبوعہ مجلس ترقی ادب ، لاہور ، دسمبر ۱۹۷۳ء ، صفحات : ۵۴۳ -

جستہ جستہ اس طرح کی مثالیں مل جاتی ہیں جن میں اول تو اقبال کی شاعری کے ہر دور کے متعلق الگ الگ بھی اظہارِ خیال کیا گیا ہے ، اور سب ادوار کا احاطہ کرتے ہوئے بھی تبصرہ ہوا ہے مثلاً پہلے دور کے متعلق ایک جگہ یہ بات کہی گئی ہے :

''اقبال کے ابتدائی دور میں ایک بے چینی ، بے اطمینانی اور جھجک تھی''[1]

دوسرے دور کی شاعری پر اس طرح کے کئی جملے ہیں :

''چند ہی سال بعد ''آمیدواری'' کا دور ختم ہوا اور اقبال کا وجدانِ روحانی آن کو ''قصۂ دار و رسن'' میں لے جانے لگا - وہی شاعر جو خلوتِ میخانہ میں ناپختہ آیا تھا ، اب حیات ملی کے جلوت‌خانے میں ایک حقیقت مسلمہ ہے ، ایک زندہ پیغامِ عمل ہے -''[2]

* * *

''بانگِ درا'' کی حصۂ دوم کی نظمیں ایک غیر معمولی دلچسپی رکھتی ہیں - یہ نظمیں اقبال کے شاعرانہ ماضی کی یاد دہاں اور اس کے شاعرانہ مستقبل کا پیش خیمہ ہیں -''[3]

* * *

''یہ شاعر کی زندگی کا وہ زمانہ ہے جب خواب و خیال کی دنیا کا حسن و جمال ، دل کی پر شوق آرزو کا آب و رنگ بنتا

---

۱ - قاضی عبدالغفار : پیام اقبال ، مشمولہ : اقبال معاصرین کی نظر میں ص ۶۰ -

۲ - ایضاً ، ص ۶۱ -

۳ - ممتاز حسن : اقبال کی شاعری پر قیام یورپ کا اثر، ایضاً ، ص ۱۰۱ -

ہے ، اور پھر یہ جذبہ قلب کی گہرائیوں سے نکل کر مادی اشیاء کے ساتھ متحد ہو جانا چاہتا ہے ۔"۴

تیسرے دور کی شاعری پر ایک مختصر تبصرہ یہ ہے :

"اقبال کی شاعری کے دورِ ثالث کی تمام بنیاد اسی فلسفے پر ہے جس کے لیے اُس نے اپنے زورِ قلم کو وقف کر دیا ۔ اُسی فلسفے کی فضا میں اقبال کی شاعری نے نشو و نما پائی ، بلندی پائی ، حوصلہ پایا ، نظر پائی اور ایمان پایا ۔"۵

کہیں کہیں وہ تبصرہ تینوں ادوار کی شاعری پر بہ حیثیتِ مجموعی کیا گیا ہے :

"اقبال کا کلام مجموعی طور پر یکساں نہیں ہے ۔ اپنے ابتدائی اور آخری دور میں عموماً ، اور درمیان کے زمانے میں کہیں کہیں ، اقبال ایک شاعر محض یا ایک فلسفی محض کی حیثیت سے بھی ظاہر ہوتا ہے ۔"۶

* * *

"اقبال کی شاعری کا ہر دور ایک ہی فلسفۂ حیات کا حامل ہے ۔"۷

اقبال کی شاعری کے مختلف ادوار پر اس طرح کی رائیں عموماً ذاتی تأثر کا نتیجہ نہیں ۔ اُن کے کلام کو واضح رجحانات کی بنا پر

---

۴ ۔ ملک راج آنند : اقبال کی شاعری ، ایضاً ، ص ۲۷۷ ۔
۵ ۔ قاضی عبدالغفار : پیام اقبال ، ایضاً ، ص ۶۴ ۔
۶ ۔ ممتاز حسن : اقبال ایک پیغمبر کی حیثیت سے ، ایضاً ، ص ۱۴ ۔
۷ ۔ قاضی عبدالغفار : پیام اقبال ، ایضاً ، ص ۵۸ ۔

ادوار میں تقسیم کرنے کا جو کام ، اُن کے انتقال کے بعد شروع ہوا ، اُس کی اساس تجزیے اور استدلال پر قائم ہے - تجزیے کے اسی میلان سے ہمیں شعر اقبال کے مختلف ادوار کی واضح تصویر بنانے میں مدد ملتی ہے -

اقبالیات کے ایک نئے نقاد ڈاکٹر عبدالحق نے 'باقیاتِ اقبال' کو اُن کے دورِ اول کا کلام کہہ کر ، دورِ اول کو دوسرا دور کہا ہے اور اس پر یہ تبصرہ کیا ہے کہ اس دور کی ''اہم خصوصیت یا رجحان جذبۂ استفہام و استفسار ہے—فن کار شدید ذہنی خلش اور اضطراب میں مبتلا ہے - وہ انفس و آفاق کے اسرار و رموز جاننے کے لیے مضطرب ہے—اقبال حقیقت کی رازجوئی میں منہمک ہیں—وہ اس تفتیش و تلاش میں بے حد لذت محسوس کرتے ہیں - ادراک حقیقت میں انھیں کہیں کہیں مایوسیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے ، (چنانچہ) اس دور میں ذہن و فکر میں مایوسی کی بھی لہر موجود ہے - ہستی کے دل آزار پہلوؤں سے گھبرا کر وہ راہِ فرار اختیار کرنا چاہتے ہیں - کسی ہم نفس کی غیر موجودگی سے وہ شدید تنہائی محسوس کرتے ہیں - اس تنہائی سے گھبرا کر وہ وادیِ قدرت میں پناہ لینا چاہتے ہیں - اسی رومانی کیفیت نے فطرت پرستی کی صورت اختیار کی ہے -[۸]

اس دور کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے خلیفہ عبدالحکیم نے لکھا ہے کہ :

''اُس کی شاعری کے موضوع ابھی محدود نہیں ہوئے ، لیکن بہت کم نظمیں ایسی ہیں جو فلسفیانہ افکار سے خالی ہوں -

---

۸ - ڈاکٹر عبدالحق : اقبال کے ابتدائی افکار ، جمال پرنٹنگ پریس ، دہلی، مارچ ۱۹۶۹ء ، صفحہ ۹۴-۱۰۲ -

اقبال کے کلام میں شاعری اور حکمت شروع ہی سے توام نظر آتی ہیں ، لیکن کہیں بھی خالی فلسفہ شعریت پر غالب نہیں آیا ۔"[۹]

اس دور کی شاعری کے کچھ موضوع ایسے ہیں جو بعد میں قریباً غائب ہوگئے اور آن کی کہیں کہیں ہلکی جھلکیاں رہ گئیں ۔ جغرافیائی وطنیت کا جذبہ جو پہلے دور میں موجود ہے آگے چل کر ساقط ہو جائے گا ۔ عشق مجازی کی لہریں جو اس دور میں موجود ہیں ، وہ یورپ میں کہی ہوئی نظموں میں بھی دکھائی دیں گی ، لیکن حکمت و وجدان اور دردِ ملت کی فراوانی سے بعد میں ناپید ہو جائیں گی ۔ عشق ایک لامحدود جذبۂ حیات اور خودی کا پروردگار بن جائے گا ۔ اس دور میں کچھ روائتی تصوف بھی ہے جو بعد میں چل کر اقبال کے اجتہادی تصوف میں بدل جائے گا— شاعر ابھی کسی پختہ یقین پر نہیں پہنچا ۔ ابھی رازِ حیات کو ٹٹولتا ہوا دکھائی دیتا ہے ۔ ابھی تک یقین و گمان کی آویزش سے نہیں نکلا ۔"[۱۰] اس کے باوجود یہ بات درست ہے کہ اس دور کے کلام میں ہمیں "کہیں کہیں آن چیزوں کی جھلک نظر آ جاتی ہے جو آگے چل کر تیسرے دور میں آن کے فکر ، پیغام اور فلسفۂ حیات اور نظریۂ حیات کا لازمی جزو بنیں ۔"[۱۱]

اقبال کے دوسرے دور کی شاعری قیامِ یورپ کے زمانے کی شاعری ہے ۔ اس دور میں کہی ہوئی نظموں کی تعداد بہت کم ہے ، لیکن ان میں ہر رنگ کی شاعری ملتی ہے ۔ حسن اور عشق

---

۹ ۔ خلیفہ عبدالحکیم : فکر اقبال ، ص ۵۹ ۔
۱۰ ۔ ایضاً ، ص ۶۰ ۔
۱۱ ۔ سید وقار عظیم : اقبال ، شاعر اور فلسفی ، ص ۲۸ ۔

پر اعلیٰ درجے کی نظمیں موجود ہیں ۔[۱۲] ان نظموں میں بعض جگہ تشبیہہ و تمثیل اور تخیل کی معراج نظر آتی ہے ۔ ایسے اشعار عشقیہ شاعری میں ہمیشہ لطافتِ فکر و تأثر اور حسنِ کلام کا نمونہ پیش کرتے رہیں گے ۔[۱۳] یورپ میں کہی ہوئی نظموں میں تصوف اور فلسفہ ، مجاز اور حقیقت کی آمیزش بھی موجود ہے ۔ کلام میں کہیں کہیں مبلغانہ رنگ بھی ہے ۔[۱۴] قیامِ فرنگ کے دوران میں اقبال کا زاویۂ نگاہ وطنیت سے ملت کی طرف پھرا[۱۵] اور انھوں نے ایسی شاعری شروع کی جسے جزو پیغمبری کہا گیا ہے ۔[۱۶]

عابد علی عابد نے اقبال کے سفر یورپ کو اُن کے فکری انقلاب کا دور کہا ہے اور اپنی کتاب کے حصہ دوم[۱۷] میں مختلف عنوانات کے تحت ، اُن کے مخصوص ذہنی رجحانات کی نشاندہی کرتے ہوئے ، ان پر بڑی تفصیل سے بحث کی ہے ۔ جن ذہنی رجحانات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ، وہ یہ ہیں :

۱ ۔ وطنیت کے مغربی تصور سے گریز ۔

۲ ۔ شعر کی غایت اور شعر گوئی کے مقصد کا تعین ۔

۳ ۔ عجمی تصوف کے غیر اسلامی عناصر کے خلاف احتجاج ۔

---

۱۲ ۔ خلیفہ عبدالحکیم : فکر اقبال ، ص ۶۹ ۔
۱۳ ۔ ایضاً ، ص ۶۹ ۔
۱۴ ۔ ایضاً ، ص ۷۵ ۔
۱۵ ۔ ایضاً ، ص ۸۲ ۔
۱۶ ۔ ایضاً ، ص ۹۲ ۔
۱۷ ۔ عابد علی عابد : شعر اقبال ، ص ۲۱۳-۳۶۰ ۔

۴ - رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ، ائمۂ اطہار ، صحابۂ کرام ، تابعین اور اولیاء سے محبت اور عقیدت کا اظہار -

۵ - احساسِ تنہائی* کے ذہنی رجحان کا اظہار -[۱۸]

''اقبال کا علمِ کلام''[۱۹] میں ایک باب کا عنوان ہے : ''اقبال کے رومانی افکار'' ——اس باب میں مستند حوالوں سے رومانیت کے مفہوم کی وضاحت کرنے کے بعد اقبال کی شاعری کے پہلے دو ادوار کے متعلق یہ رائے ظاہر کی گئی ہے کہ :

''بانگِ درا'' کے پہلے دو حصوں کی اکثر نظمیں رومانی ہیں -[۲۰] یہ نظمیں اُن کے بے پناہ جذباتی خلفشار اور شورش دروں کی حامل ہیں——ان منظومات میں فطری مناظر کی دل آویز لفظی تصویریں پیش کی ہیں——ان نظموں میں فلاطینوس اور ابن سینا کے ہمہ گیر حسن و عشق کے نظریے کی فن کارانہ ترجمانی ہے——اقبال کی ان نظموں میں کیف ہے ، موسیقیت ہے ، تفکر ہے ، جوش و خروش ہے ، جذبۂ ہمدردیِ انسانی کی ولولہ انگیز ترجمانی ہے - ان خصوصیات کی بنا پر یہ نظمیں نہ صرف اُردو شاعری میں بے مثال ہیں ، بلکہ انھیں

---

* احساس تنہائی کے موضوع پر تفصیلی اور مدلل بحث ہے عثمان صاحب کی کتاب : ''حیات اقبال کا ایک جذباتی دور'' (صفحہ ۶۷-۱۱۵) میں کی گئی ہے (و - ع)

۱۸ - ایضاً ، ص ۲۲۹ -

۱۹ - تصنیف : سید علی عباس جلال پوری -

۲۰ - اقبال کا علم کلام ، ص ۱۳۸ -

دنیا کے کسی بھی عظیم شاعر کے کلام کے مقابلے میں فخر و اعتماد کے ساتھ پیش کیا جا سکتا ہے۔"[۲۱]

اقبال کی تیسرے دور کی شاعری کے متعلق بھی علی عباس جلال پوری نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ جہاں کہیں جوشِ تخلیق میں فن کار، مصلح پر غالب آ گیا ہے، اقبال کی رومانیت بیدار ہوگئی ہے۔[۲۲]

اقبال کی شاعری کو تین ادوار میں تقسیم کرکے اُن میں سے ہر دور پر الگ الگ تبصرہ کرنے کی جو روش سر عبدالقادر کے مقدمہ 'بانگِ درا' سے شروع ہوئی تھی، اُس نے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ایک مستقل رجحان کی صورت اختیار کر لی اور اس طرح کے تبصروں کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ مختلف ادوار کی شاعری ایک مربوط وحدت معلوم ہونے کے بجائے ٹکڑوں میں بٹی ہوئی نظر آنے لگی اور ہم اقبال کی شخصیت کا کوئی مستقل تصور قائم کرنے کے بجائے اُسے مختلف ٹکڑوں اور حصوں میں بٹی ہوئی شخصیت کی طرح دیکھنے لگے۔

اس طرح کے تبصروں میں بہت سے مطالب کو یکجا کرکے اقبال کے فکر کے جملہ عناصر پر بحث کرنے کی جو علمی مساعی کی گئیں، اُنھوں نے بھی ذہنی ارتقا کے مسئلے کو خاصا الجھا دیا۔ اس طرح کی مساعی میں سب سے نمایاں مثال عزیز احمد کی کتاب: "اقبال، نئی تشکیل" کی ہے، جس میں اقبال کے تینوں ادوار کی شاعری کو ان ادوار کے غالب رجحانات کی بنا پر وطنی شاعری، اسلامی شاعری، اور انقلابی شاعری کہا گیا ہے، لیکن جب ان

---

۲۱ - ایضاً، ص ۱۳۹۔
۲۲ - ایضاً، ص ۱۳۹۔

عنوانات کی تشریح کی غرض سے کلامِ اقبال کی روشنی میں آن کے سلسلۂ افکار کا تجزیہ کیا گیا تو ان میں وہ ربط اور تسلسل قائم نہ رہ سکا ، جو تفہیم مطالب میں مددگار ثابت ہوتا ۔

اقبال کے شاعرانہ ارتقا کو صحیح معنی میں ارتقا سمجھنے کی ایک صورت پروفیسر حمید احمد خاں کے ایک مضمون[۲۳] میں نظر آتی ہے ۔ اس سلسلے میں جو باتیں مضمون میں کہی گئی ہیں ، آن کا خلاصہ ان الفاظ میں کیا جا سکتا ہے :

"دورِ اول اور دورِ آخر کے اقبال میں ایک خاص امتیاز واضح طور پر نظر آتا ہے ۔ مگر اس امتیاز کی جو تاویل کی جاتی ہے ، وہ ادبی تنقید کو سیاسی مصلحتوں کے بھینٹ چڑھا دینے کی ایک زندہ مثال ہے ۔ اول تو یہی غلط ہے کہ دور اول کے اقبال میں صرف عشقِ وطن نظر آتا ہے، عشق مذہب دکھائی نہیں دیتا ۔ پھر پہلے اور آخری دور کے فرق کو ایک ذہنی 'انقلاب' کا نام دینا اور بھی غلط ہے ۔ جس کیفیت کو اقبال کے 'قلب ماہیت' سے منسوب کیا جاتا ہے ، وہ دراصل آس کی اولین شاعرانہ فطرت کے ارتقا کی ناگزیر منزل مقصود تھی ۔ دورِ حاضر کے سیاسی و عمرانی ماحول سے اقبال کی شخصیت کے ٹکرانے کو لازماً یہی نتیجہ پیدا کرنا تھا کہ اقبال اس اٹل منزلِ حیات کی طرف جادہ پیما ہوتا ۔"[۲۴]

اقبال جوں جوں اقبال بنتا گیا، آسی قدر وہ اپنے آپ کو واقعات

---

۲۳ ۔ حمید احمد خاں : اقبال کا شاعرانہ ارتقا : مشمولہ اقبال کی شخصیت اور شاعری ، ص ۶۵-۸۰ ۔

۲۴ ۔ ایضاً ، ص ۶۶ ۔

کی دنیا کے قریب تر پاتا گیا۔[۲۵] دورِ اول میں 'مقامی رنگ' کے ظہور کے باوجود اقبال کی فطرت نے اپنے مقصدی انداز سے کبھی انحراف نہیں کیا[۲۶] اپریل ۱۹۰۱ء سے مارچ ۱۹۰۵ء تک چہار سالہ مدت میں جو قابلِ ذکر نظمیں شائع ہوئیں، اُن سے ظاہر ہوتا ہے کہ قیدِ مقامی میں بھی احساسِ مقصد برابر زندہ ہے۔[۲۷] ۱۹۰۵ء میں اقبال نے 'نیا شوالہ' لکھ کر ایک نیا لہجہ بھی اختیار کیا اور اجتماعی شعور کا ایک باب بھی کھولا۔[۲۸] فرد کو جماعت میں ضم کرنے کے اس ابتدائی تجربے کے ذریعے اقبال نے اپنے مقصد کو پا لیا[۲۹] ہے۔ یہاں سے جذبہ و فکر کے ایک نئے نظام کی تشکیل کا آغاز ہوا اور اس کے بعد 'پیغمبری' کی یہ راہ اقبال کی نظروں سے کبھی اوجھل نہیں ہوئی۔[۳۰]

ہندوستان کے بعد ایشیا، جس کی زبان بن کر اقبال نے یورپ کو اپنی تاریخی یاددہانی روانہ کی[۳۱] اور ایشیا کے بعد (مذہب کی راہ سے) ایک عالمگیر انسانی اخوت تک پہنچنا بالکل قدرتی تدریجات تھیں۔[۳۲] ہندوستان اور مشرق اور عالمِ انسانی، اس کے 'پیغمبرانہ' اضطراب کے مختلف زینے تھے۔[۳۳] وہ ہر رنگ میں زندگی کا معمار تھا۔

---

۲۵ - ایضاً، ص ۶۷ -
۲۶ - ایضاً، ص ۶۹ -
۲۷ - ایضاً، ص ۶۹ -
۲۸ - ایضاً، ص ۷۰ -
۲۹ - ایضاً، ص ۷۰ -
۳۰ - ایضاً، ص ۷۱ -
۳۱ - اس جگہ: "تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی" کی طرف اشارہ ہے۔ ایضاً، ص ۷۱ -
۳۲ - حمید احمد خاں: اقبال کی شخصیت اور شاعری، ص ۷۱ -
۳۳ - ایضاً، ص ۷۲ -

اُس کی گذشتہ چالیس سال کی سرگرمیاں دراصل ایک ہی سرگرمی کے مختلف پہلو ہیں - اُس کی حرکت کا دائرہ بتدریج وسیع تر ہوتا جاتا ہے مگر اس ارتقاء میں کوئی تناقض ، کوئی نام نہاد 'انقلاب' کہیں نظر نہیں آتا - اُس کے طلوع و ظہور کے تین اُفق ایک ہی آسمان کے تین اُفق ہیں -[۳۴]

یہ ارتقاء دراصل ایک ہی حرکتِ حیات کا تدریجی انکشاف تھا ، اور اقبال کی شاعری کا دورِ اول جو شاعر کے قیامِ یورپ کے ساتھ ختم ہوتا ہے ، صرف ایک خاص ذہنی استعداد یا ربطِ حیات کے ایک خاص ملکے کا سراغ دیتا ہے - یہاں ہم اُس ذوقِ ہنگامہ سے دوچار ہوتے ہیں جسے عادت ہے کہ حوادث و مصائب کو ٹھوکر مار کر دعوتِ پیکار دے (تصویرِ درد ، ۱۹۰۴ء)[۳۵] ، بایں ہمہ زندگی کے ساتھ ابھی اُس کا وہ ربط پیدا نہیں ہوا کہ کوئی خاص نظامِ عمل اقبال کے سامنے ہو -[۳۶]

یورپ پہنچ کر حقائق سے پہلی مرتبہ اُس کی ٹکر ہوئی اور ربطِ حیات کا وہ ملکہ جو اب تک عالمِ تخیل سے باہر نہیں آیا تھا ، قوت سے فعل میں آنے کے لیے مضطرب ہوا — پہلی مرتبہ اُس کے ذہن پر یہ نکتہ روشن ہوا کہ زندگی ایک رزم گاہ ہے جس کے سپاہی کا سب سے تیز ہتھیار استحکام نفس ہے -[۳۷]

یورپ سے واپسی کے بعد آٹھ دس سال میں اقبال نے اپنا جو عمرانی فلسفہ تعمیر کیا ، دیارِ فرنگ میں واقعات سے ربط پیدا

---

۳۴ - ایضاً ، ص ۷۲ -
۳۵ - ایضاً ، ص ۷۲ ، ۷۳ -
۳۶ - ایضاً ، ص ۷۴ -
۳۷ - ایضاً ، ص ۷۴-۷۵ -

کرنے کی اسی کیفیت کا لازمی نتیجہ ہے - اپنے شاعرانہ ارتقا کے اس دور میں زندگی کے مختلف شعبوں کے متعلق ایک پختہ اور مستحکم نقطۂ نظر پیدا کر لیا ہے (شمع و شاعر (۱۹۱۲ء)، اسرار خودی (۱۹۱۸ء) اور رموزِ بے خودی (۱۹۱۸ء)) ، اب صرف حالات و واقعات کی دنیا پر اس نقطۂ نظر کا اطلاق کرنا باقی ہے -[۳۸]

اس کام کو اقبال نے تحصیل کمال کے تیسرے دور میں انجام دیا -[۳۹] 'طلوعِ اسلام' ——'پیام مشرق' اس دورِ سوم کی اولین نقیب ہیں - اس دور میں اقبال ، عام اصول و نظریات کے بیان پر اکتفا نہیں کرتا——اب اس نے واقعات کی دنیا سے براہِ راست تعلق پیدا کر لیا ہے اور وہ اس عالمِ نو بہ نو میں اپنے خیالات عملاً نافذ کرنا چاہتا ہے——اس دور میں اظہارِ مطلب ، آرائش گفتار سے زیادہ اہم رہا -[۴۰]

''خضرِ راہ'' (۱۹۲۱ء) اور ''طلوعِ اسلام'' (۱۹۲۲ء) سے قطع نظر ، اقبال نے اپنے نئے مضامین پہلے صرف فارسی زبان میں ادا کیے اور پھر اس خاص طریقِ بیان میں پختگی پیدا کر لی تو وہ اردو کی طرف رجوع ہوا ، چنانچہ 'بال جبریل' (۱۹۳۵ء) میں عربی شاعری کی سادگی اور زورِ بیان دونوں بہ یک وقت موجود ہیں -[۴۱] لیکن اس دور کی شاعری کا اسلوب ہی صاف صاف نہیں، مضامین بھی کھرے کھرے اور ذرا سخت ہیں -[۴۲]

---

۳۸ - ایضاً ، ص ۷۵ -
۳۹ - ایضاً ، ص ۷۵ -
۴۰ - ایضاً ، ص‌ص ۷۶-۷۷ -
۴۱ - ایضاً ، ص ۷۷ -
۴۲ - ایضاً ، ص ۷۷ -

اقبال کا ذوقِ حرکت و عمل ، اس تیسرے دور میں اسے کھینچ کر خود بخود سیاسیات تک لے آیا[۴۳] اور عملی طور پر زندگی سے ربط پیدا کرنے کی خواہش اور اضطراب نے اسے مسلم سیاسیات سے وابستہ کر دیا ۔ کہ اس کے نزدیک ایشیا اور ہندوستان کی سیاسی تقدیر کا حل یہی تھا ۔[۴۴]

پہلے اور تیسرے دور میں کوئی تضاد نہیں ۔ ربطِ واقعات کی جس منزل کی طرف وہ دورِ اول میں روانہ ہوا تھا وہ لازماً اسے یہیں پہنچانے والی تھی[۴۵] ۔

اب اقبال کے سامنے ایک نصب العین ہے اور وہ اس نصب العین کی انتہائی بلندی کو واقعات کی دنیا سے دوچار دیکھنا چاہتا ہے ۔ اس دور کا اقبال 'خیالی اقبال' نہیں ، 'عملی اقبال' ہے[۴۶] ——جو سمجھتا ہے کہ اس کے مخصوص نصب العین کے لیے سیاست کا کوئی رنگ مسلم سیاسیات سے زیادہ موزوں نہیں ۔[۴۷]

---

۴۳ ۔ ایضاً ، ص ۷۸ ۔
۴۴ ۔ ایضاً ، ص ۷۹ ۔
۴۵ ۔ ایضاً ، ص ۷۹ ۔
۴۶ ۔ ایضاً ، ص ۸۰ ۔
۴۷ ۔ ایضاً ، ص ۸۰ ۔

اقبال کی اردو اور فارسی غزل

''اقبال کی غزل پر اب تک بہت ہی کم لکھا گیا ہے اور ان کے تمام معنوی و صوری پہلوؤں پر کسی نے تفصیلی نظر نہیں ڈالی - البتہ ڈاکٹر یوسف حسین نے ''روح اقبال'' میں اقبال کے آرٹ کا جائزہ لیتے ہوئے اقبال کی غزل پر اظہارِ خیال کیا ہے جس میں زیادہ تر غزل کا ادبی اور صنعتی پہلو دکھایا ہے - غزل کے جمالی ، فنی اور نفسیاتی پہلو پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے - اقبال کا رنگِ تغزل اُن کی تمام نظموں اور غزلوں میں اس قدر مشترک اور عام ہے کہ ایک کو دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا - اس میں اردو یا فارسی کلام کی تخصیص نہیں ہے - یہی رنگِ تغزل اُن کی شاعری کی جان ہے جو اپنی نرالی جمالیاتی شان اور فنی ، ادبی اور نفسیاتی خصوصیات کے ساتھ ہر ایک کو اپنی طرف مائل کر لیتا ہے -''*

قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی

○

پچھلے چند برسوں میں اقبال کی غزل اور ان کے رنگِ تغزل کو تبصرے کا موضوع بناتے ہوئے کلامِ اقبال کے کئی مبصروں نے اُن کی غزل کے موضوع اور اسلوب سے بحث کی ہے - اردو غزل پر تبصرہ کرتے ہوئے عموماً اس بات کی طرف اشارے کیے گئے ہیں

*اقبالیات کا تنقیدی جائزہ : کراچی ، جون ۱۹۶۵ء ، ص ۶۴ -

کہ ''بانگِ درا'' کے دورِ اول کی غزلوں سے ''بالِ جبریل'' کی غزلوں تک موضوع کی نوعیت اور اظہار کے اسلوب میں بتدریج تبدیلیاں پیدا ہوئی ہیں - یہاں تک کہ اقبال کی غزل نے وہ مقام اور مرتبہ حاصل کیا ، جو آن سے پہلے صرف غالب کے حصے میں آیا تھا -[1]

اقبال کی اردو غزل کے ارتقا کا جائزہ لیتے ہوئے مرزا محمد منور[2] نے پہلے دور کی غزلوں کے متعلق یہ رائے ظاہر کی ہے کہ آن میں مضامین کے عدم تناسب کی وجہ سے کہیں کہیں ناہمواری پیدا ہوگئی ہے اور بہ حیثیت مجموعی اس دور کی غزلوں کے مقابلے میں آن کی نظمیں زیادہ کامیاب ہیں - دوسرے دور کی غزلوں میں ارتقا کی یہ صورت نظر آتی ہے کہ یورپ کی مشینی زندگی سے بیزاری اور تہذیبِ جدید سے ناخوشی کے مضامین بھی جزوِ غزل بن گئے ہیں - وطن کی محبت کے اظہار کے علاوہ مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کی نوید بھی موضوعِ غزل بن گئی ہے -

تیسرے دور کی غزل ارتقا کی طرف ایک اور واضح قدم ہے - پہلے اور دوسرے دور کی غزل میں کہیں کہیں جو ناہمواری نظر آتی ہے وہ تیسرے دور میں بڑی حد تک ختم ہوگئی ہے اور غزل میں ''پر تغزل نظمیت'' کا جوہر بڑھ گیا ہے* - تیسرے دور میں اقبال کی

---

۱ - صلاح الدین احمد : تصوراتِ اقبال ، ص ۱۲۶ -
۲ - مضمون : علامہ اقبال کی اردو غزل ، مشمولہ : میزانِ اقبال -

*اس جگہ مقالہ نگار مرزا محمد منور نے یہ جملہ لکھا ہے :
''اردو کے کئی اکابر نقاد بشمول ڈاکٹر یوسف حسین خاں آلِ احمد سرور ، ڈاکٹر سید عبداللہ ، ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی اور سید وقار عظیم اس عندیے کے مالک ہیں کہ اقبال نے اردو غزل اور نظم کے درمیانی فاصلے کو کم کرنے میں بڑا حصہ لیا -''
(میزانِ اقبال ، ص ۹۰)

غزلیں کمالِ فن کا اظہار کرنے لگی ہیں اور ''بالِ جبریل'' میں وہ اس شعلۂ آخریں پر نظر آتی ہیں - لفظی و معنوی ہم آہنگی کی بنا پر اکثر غزلیں مکمل فن پارے بن گئی ہیں - ڈاکٹر وزیر آغا کی رائے کے حوالے سے یہ تبصرہ ان الفاظ پر ختم کیا گیا ہے کہ :

''اقبال سے قبل حالی نے غزل کے افق کو کشادہ کرنے کی جس تحریک کی ابتدا کی تھی ، اسے اقبال نے پایۂ تکمیل تک پہنچایا ۔''[۳]

مولانا صلاح الدین احمد نے بھی اقبال کی غزل کے ارتقا کا جائزہ لیتے ہوئے دورِ اول میں جذبات کی سادگی ، بیان کی شوخی اور اظہار کے تیکھے پن کے حوالے سے اسے داخلی کیفیات کی غزل کہا ہے - دوسرے دور کی غزل میں کہیں کہیں بےتابی و خود شناسی کی وہ کیفیت ملتی ہے جو آگے چل کر آن کے پیغام کی روح بنی - شعر کی وہ کیفیت جس نے شاعر کی انفرادیت کو ملت کی اجتماعیت میں گم کیا ، مضمون نگار کو پہلی بار اسی دور کی ایک غزل میں نظر آتی ہے[۴] اور یہاں سے آن کی غزل کا وہ دور شروع ہوتا ہے جو اس کا سب سے بلند اور تابناک دور ہے - ''بالِ جبریل'' کی اکثر غزلیں اس اعجازِ تغزل کی کامیاب مثالیں ہیں ، جس میں شاعرانہ احساس کی نازک ترین کیفیتیں حکیمانہ فکر

---

۳ - میزان اقبال ، ص ۱۰۱ -

۴ - اس غزل کا مطلع ہے :

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا ، عام دیدارِ یار ہوگا
سکوت تھا پردہ دار جس کا وہ راز اب آشکار ہوگا

کی بلند ترین رفعتوں سے ہم کنار نظر آتی ہیں ۔[۵]

اقبال کی اردو غزل کا تجزیہ کرتے ہوئے ''اقبال—شاعر اور فلسفی''* میں اقبال کی آخری دور کی غزلوں (بالِ جبریل) کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ اس غزل میں آن عناصر کا پرتو ہے جن سے اقبال کی شخصیت کی تشکیل ہوئی ۔ اس شخصیت کے دو رخ ہیں ۔ اقبال بہ یک وقت فلسفی بھی ہے اور شاعر بھی، دردمند دل رکھنے والا مصلح اور محبِ قوم بھی اور قلب مہجور رکھنے والا عام انسان بھی اور اس لیے جب زندگی اور اس کے گوناگوں مظاہر پر اور فرد اور جماعت کے پیچیدہ رشتوں پر اور ان سے قطع نظر خود انسان کی خلش اور اضطراب پر اس کی نظر پڑتی ہے تو یہ مشاہدات مختلف وقتوں میں ردِ عمل کی مختلف صورتیں اختیار کرتے ہیں ۔ یہ رد عمل کبھی فلسفی کا ہوتا ہے ، کبھی شاعر کا ، کبھی واعظ و مصلح کا اور کبھی ایک دردمند انسان کا اور ردِ عمل کا یہ فرق جب غزل کے اشعار کے پیکر میں ڈھلتا ہے تو ہر جگہ اس کے لہجے میں ردِ عمل کی مخصوص نوعیتوں کی نوع بہ نوع جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں ۔[۶]

اقبال کی غزل نے غزل کی روایت کو آگے بڑھانے اور آئندہ کے غزل گو کے لیے ایک نئی راہ متعین کرنے کی جو خدمت انجام دی ہے ، اس کا تجزیہ ''اقبال—شاعر اور فلسفی'' میں ان الفاظ میں

---

۵ ۔ صلاح الدین احمد : اقبال کی غزل ، مشمولہ : تصوراتِ اقبال ، ص ۱۱۸ ۔

*''اقبال—شاعر اور فلسفی'' از : پروفیسر سید وقار عظیم ، مطبوعہ لاہور ، ستمبر ۱۹۶۸ء ، صفحات ۳۲۸ ۔

۶ ۔ سید وقار عظیم : اقبال —شاعر اور فلسفی ، ص ۱۸۵ ۔

کیا گیا ہے :

''اقبال نے بہ حیثیت غزل گو نہ صرف میر ، غالب ، مومن ، اکبر ، حسرت ، فانی ، اصغر اور جگر کی صف میں نمایاں جگہ بنائی ، بلکہ غزل گوئی کی روایت میں بعض نئے امکانات کے چراغ روشن کیے - آنھوں نے غزل کو فکر و فلسفہ سے آگے بڑھ کر ، پیغام و اصلاح کی پر شکوہ اور جلیل و جمیل زبان دی اور آئندہ کے غزل گو کو یہ سبق سکھایا کہ شاعر اگر غزل کے مزاج کی نزاکتوں کا رمز شناس ہے تو ہر بات اس کے پابند سانچے میں ڈھل سکتی ہے - اظہار و بیان کے لحاظ سے اس نکتے کی تفسیر کی ہے کہ پرشکوہ عجمی اسلوب اختیار کر کے بھی شاعر بیان میں وہی لطافت اور گھلاوٹ پیدا کر سکتا ہے جو روزمرہ کے سادہ لفظ اور محاورے کے لیے مخصوص ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ فن کی ہر جدت اور ندرت فن کار سے خلوص اور جرأت کا خراج طلب کرتی ہے - روایت کی محبت اور احترام کا نذرانہ مانگتی ہے اور جذب و ایثار کی سختی جھیلنے کی توقع رکھتی ہے - اگر یہ سب چیزیں یک جا ہو جائیں ، جیسی کہ اقبال میں بہ حیثیت فن کار اور بہ حیثیت غزل گو موجود تھیں تو فنی تخلیق کی روایت کو پرمایہ اور باثروت بھی بناتی ہے اور اس کی راہوں کو آنے والوں کے لیے منور بھی کرتی ہے - اقبال کی دورِ آخر کی غزل نے یقیناً یہ دونوں اہم فنی فریضے انجام دیے ہیں -''[۷]

خلیفہ عبدالحکیم نے ''فکرِ اقبال'' میں اقبال کی شاعری

---

۷ - سید وقار عظیم : اقبال--شاعر اور فلسفی ، ص ۱۹۱ -

(خصوصاً غزل) کے ارتقائی مراحل کا جائزہ لیتے ہوئے ، آن کے فارسی کلام کو بھی پیشِ نظر رکھا ہے اور بعض باتوں میں غالب اور اقبال کو مماثل ٹھہراتے ہوئے دونوں کے کلام میں تخیل اور تفکر کی دل نشین آمیزش کا ذکر کیا ہے ۔ لیکن روح کو گرمانے والی ایک اور چیز جس کا نام کبھی دردِ دل ہے اور کبھی سوزِ قلب اور کبھی عشق و جنون ، غالب کے کلام میں بہت نمایاں نہیں ۔ غالب کے کلام میں اس بارے میں جو کمی ہے وہ اقبال کے کلام میں بڑی حد تک پوری ہو جاتی ہے اور بہت سی غزلوں اور قطعات میں وہ سنائی ، عطار اور رومی کے دوش بدوش کھڑے نظر آتے ہیں ۔[۸]

اقبال ، غالب کے جس اندازِ تفکر و تخیل سے متأثر ہوئے وہ ان کے یہاں حد درجہ ارتقا یافتہ صورت میں ملتا ہے ۔ پھولوں کے رنگ و بو میں مماثلت ہے ، لیکن غالب کے یہاں کے گلستے اقبال کے کلام میں سدا بہار گلزار بن گئے ہیں ۔[۹] تقابل کے اس سلسلے کو جاری رکھتے ہوئے خلیفہ عبدالحکیم نے ایک مخصوص نظم کے تغزل کا ذکر بڑے والہانہ انداز میں کیا ہے ۔ وہ کہتے ہیں :

> ''ویسے تو اردو اور فارسی کا تمام تغزل عاشقانہ شاعری میں ہے ، لیکن اردو اور فارسی کے کسی شاعر کے کلام میں اس قسم کی لطیف عاشقانہ غزل یا نظم نہ ملے گی ۔''[۱۰]

اس تقابلی تحسین میں جو جذباتی اور تأثراتی غلو ہے ، اس سے ہمیں اقبال کی فارسی غزل کے فنی یا فکری مقام کے تعین میں کوئی مدد

---

۸ - خلیفہ عبدالحکیم : فکرِ اقبال ، ص ۳۷ - ۳۸ -
۹ - خلیفہ عبدالحکیم : فکرِ اقبال ، ص ۴۱ -
۱۰ - خلیفہ عبدالحکیم : فکرِ اقبال ، ص ۶۹ -

نہیں ملتی - سنائی ، عطار اور رومی کا ہم دوش قرار دینے کی بنیاد بھی تجزیے کے بجائے تأثر پر رکھی گئی ہے ، اس لیے یہ تقابل بھی اقبال کی فارسی غزل کو سمجھنے میں مدد نہیں دیتا ، البتہ ڈاکٹر سید عبداللہ نے اقبال کی فارسی غزل کو مطالعے اور تجزیے کا موضوع بنایا ہے - اپنے مضمون : ''اقبال شعرائے فارسی کی صف میں''[۱۱] کی بنیاد سید صاحب نے اس خیال پر رکھی ہے کہ اقبال ''بنیادی طور پر اردو سے زیادہ فارسی کے شاعر ہیں''[۱۲] اور ان کے اسالیب مجموعاً کلاسیکی شاعری کے اسالیب ہیں جن میں شعرائے فارسی کے تمام بڑے شعرا کے پیرایہ ہائے بیان کا کچھ نہ کچھ رنگ موجود ہے -''[۱۳]

وہ فارسی کے متعارف شعری دبستانوں میں سے کسی ایک دبستان کے پابند نہیں ہیں ، لیکن زبان و بیان کے معاملے میں وہ حافظ اور عہدِ مغلیہ کے فارسی شاعروں سے اتنے زیادہ فیض یاب اور متأثر ہوئے ہیں کہ ہم ''انھیں اس عراقی ہندی روایت کا شاعر کہنے اور سمجھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں جو حافظ سے شروع ہو کر بابا فغانی اور ان کے متبعین تازہ گویانِ ہند کے ذریعے بیدل اور غالب تک پہنچتی ہے''-[۱۴]

اقبال کے اسالیب پر (رومی کے علاوہ) بیدل کے اسالیب کا بڑا اثر ہے ، لیکن ''بیدل کے پیچیدہ اور معمائی طرز بیان کے برعکس اقبال کے کلام میں افکار و حقائق کا بیان زیادہ واضح ،

---

۱۱ - ڈاکٹر سید عبداللہ : مقاماتِ اقبال ، ص ۹۰ -
۱۲ - مقاماتِ اقبال ، ص ۹۰ -
۱۳ - مقاماتِ اقبال ، ص ۹۲ -
۱۴ - مقاماتِ اقبال ، ص ۹۵ -

صاف اور مؤثر ہے - وہ بیدل کی طرح محض بلند خیالی کی طرف متوجہ نہیں - آن کے افکار کی جذباتی سطح خاصی روشن ہے اس لیے آن کے حکیمانہ شعر بھی پر اثر اور پرسوز ہیں'' -[۱۵] بیدل کے کلام میں مدھم سی اثباتیت موجود ہے لیکن اقبال کے کلام میں جو تیقن ہے وہ بیدل کے کلام میں نہیں -[۱۶]

اقبال نے اپنے افکار کے اظہار کے لیے جن جذباتی اور احساساتی پیرایہ ہائے بیان سے کام لیا ہے آن میں مجذوب صوفی شاعروں کا اشتیاقی پیرایہ اور حافظ اور تازہ گویانِ ہند کا اسلوب زیادہ نمایاں ہے - مجذوب صوفی شاعروں میں اقبال پر رومی کا اثر ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے - انھوں نے رومی کی زمینوں میں کچھ غزلیں بھی لکھی ہیں اور بعض موقعوں پر آن کے مخصوص اسالیب بھی اختیار کر لیے ہیں - لفظوں کی تکرار و اعادہ سے کلام میں جوش اور تواجد پیدا کرنے کے معاملے میں اقبال نے رومی کا تتبع کیا ہے ، تاہم وہ سرمستی جو رومی کا امتیازِ خاص ہے ، اقبال کے یہاں کہیں کہیں ذرا سی جھلک دکھاتی ہے -

حقیقت یہ ہے کہ اقبال کی شاعری خصوصاً غزل میں رومی کا اثر اتنا نمایاں نہیں جتنا کہ بعض نقادانِ فن نے فرض کر لیا ہے - اقبال کا اسلوبِ بیان رومی کے مقابلے میں شستہ و رفتہ ہے -[۱۷] رومی کی غزل میں بیان کی جو ناہمواری ہر جگہ نمایاں ہے ، اقبال کی غزل میں یہ ناہمواری نہیں -[۱۸]

---

۱۵ - مقاماتِ اقبال ، ص ۱۰۲ -
۱۶ - مقاماتِ اقبال ، ص ۱۰۹ -
۱۷ - مقاماتِ اقبال ، ص ۱۲۰ -
۱۸ - مقاماتِ اقبال ، ص ۱۲۱ -

رومی کے علاوہ عراقی کا پرسوز لہجہ اور کہیں کہیں جامی کا رنگ بھی اقبال کی غزلوں میں موجود ہے ، لیکن آن کی غزلوں میں جو حقیقت میں غزل نما نظمیں ہیں ، سب سے زیادہ اثر حافظ اور تازہ گویانِ ہند کا نظر آتا ہے ، بلکہ اسالیب کے معاملے میں حافظ ، سچ مچ اقبال کے پیر و مرشد ہیں ، یہاں تک کہ ''پیامِ مشرق'' اور ''زبورِ عجم'' کی کئی غزلوں میں حافظ کی مخصوص تراکیب بھی بے تکلفی سے استعمال ہوئی ہیں[۱۹] ''پیامِ مشرق'' اور ''زبورِ عجم'' کی چند غزلوں کی زمینیں بھی حافظ سے مستعار ہیں -

اقبال کی بعض غزلوں میں وہی ڈرامائی اسلوب اختیار کیا گیا ہے جو حافظ کا انداز خاص ہے - اقبال نے بعض ایسے الفاظ بھی اختیار کر لیے ہیں جن کی حیثیت حافظ کے یہاں علامت کی ہے ، اس فرق کے ساتھ کہ اقبال نے بعض صورتوں میں ان میں اپنی مخصوص ''علامتیت'' پیدا کر لی ہے اور حافظ کے شخصی احساسات میں اجتماعی احساسات کا رنگ پیدا کر دیا ہے لیکن اقبال کی غزل میں حافظ کی غزل کی سی تاثیر نہیں - حافظ کے کلام میں ایک خاص قسم کی آرائش اور صنعت گری ہے ، جس سے اقبال کا کلام خالی ہے - حافظ کے کلام میں صنائع کے جو حسین انداز ملتے ہیں ، اقبال کے یہاں آن کا انداز بھی مختلف ہے - آنھوں نے صنائع معنوی کے مقابلے میں اصوات کی تجنیس وغیرہ کا زیادہ خیال رکھا ہے اور وہ لفظوں کی تکرار سے خاص کیفیت پیدا کرتے ہیں -[۲۰]

اقبال کے اسالیب پر دورِ مغلیہ کے تازہ گویان کا اثر نمایاں

---

۱۹ - مقاماتِ اقبال ، ص ۱۲۱ -
۲۰ - مقاماتِ اقبال ، ص ۱۲۶ -

ہے یا اقبال نے خاص طور سے آن کی استعارہ پسندی سے کام لیا ہے جس کا مقصود بیان میں جوش پیدا کرنا اور مخاطب کے تخیل کو ابھارنا ہے - تازہ گویانِ ہند کے اس ہیجانی اسلوب کا نتیجہ یہ ہے کہ اشعار میں کہیں کہیں مبالغہ اور بے ضرورت جوش پیدا ہوگیا ہے اور ان کا مطالعہ سکون و راحت کا سبب بننے کے بجائے ہیجان و اضطراب کا باعث بنتا ہے -[۲۱]

اقبال کے کلام میں استعاریت کے وہ سب انداز موجود ہیں جو عرفی ، فیضی اور غالب کے کلام میں ملتے ہیں - بعض موقعوں پر طالب آملی کی استعاریت اور جلال و اسیر کی ''ابہامیت'' بھی پیدا ہوگئی ہے -[۲۲] اقبال ، عرفی کے بھی مداح ہیں اور انہیں اس کا احتجاجی اور جارحانہ رجحان اور پرجوش طریقِ اظہار عزیز ہے - فیضی کی تعلیمات سے بھی اقبال نے بہت فائدہ آٹھایا ہے - اقبال اور فیضی میں یہ چیز مشترک ہے کہ دونوں ''اپنی فکریت کی خشکی اور خنکی دور کرنے کے لیے ہیجان انگیز استعارات و کنایات سے فائدہ آٹھاتے ہیں -''[۲۳]

خلاصۂ کلام یہ کہ اقبال کے کلام پر دورِ مغلیہ کے فارسی اسالیب کا گہرا اثر ہے اور آن کی شاعری میں اس دور کے تقریباً سب اہم اسالیب کا پرتو نظر آتا ہے - یہی بات مرزا غالب میں ہے - اس لحاظ سے مرزا غالب کو آن کا صحیح ادبی پیش رو کہا جا سکتا ہے -[۲۴]

---

۲۱ - مقاماتِ اقبال ، ص ۱۲۷ - ۱۳۰ -
۲۲ - مقاماتِ اقبال ، ۱۳۲ -
۲۳ - مقاماتِ اقبال ، ص ۱۳۶ -
۲۴ - مقاماتِ اقبال ، ص ۱۲۷ -

کلاسیکی روایت کے پابند ، دورِ آخر کے ایرانی شاعروں میں سے قاآنی کی لفظی پیکرتراشی اور مصوری کے کچھ نقوش بھی اقبال کے کلام میں موجود ہیں[۲۵] ، لیکن اقبال قاآنی کی طرح حسن کا بیان ، عبارت آرائی کے لیے نہیں کرتے بلکہ وہ حسنِ فطرت سے روحانی مسرت حاصل کرتے ہیں - اُن کی منظر کشی خیالی اور بے مقصد نہیں ہوتی . . . . .[۲۶]

مختصر یہ کہ اقبال فارسی میں ایک اہم ادبی روایت کے وارث ہیں ، لیکن اس کے علاوہ وہ ایک فارسی طرز و اسلوب کے مالک بھی ہیں - ''فارسی کے شعری اسلوب کی تاریخ میں اقبال کا امتیازِ خاص یہ ہے کہ انھوں نے فارسی شاعری کی از سرِ نو . . . . کی -''[۲۷] انھوں نے ''فارسی شاعری کے بعض الفاظ کو ، جن کی اخلاقی لامرکزیت نے بے اخلاقی کے میلانات پیدا کر دیے تھے ، ان کے اولین مفہوم سے آشنا کیا -''[۲۸] انھوں نے شاعری کو ایک نئی زبان دی - آنھوں نے بیسیوں الفاظ کو نئی زندگی بخشی - پرانی تلمیحات کے مفہوم میں توسیع کی - پرانے استعارات کے رخ اور روپ بدل ڈالے - انھوں نے فارسی شاعری کے وسیع ذخیرۂ الفاظ میں سے صدہا ایسے جذباتی پیرائے انتخاب کیے جو سوچ اور احساس کے نئے پیمانوں میں سما سکنے کی استعداد رکھتے تھے'' اور ہمارے عصری احساسات کی تسکین اور حیاتِ فکری کی ترجمانی کا حق ادا کر سکتے تھے-[۲۹]

---

۲۵ - مقاماتِ اقبال ، ۱۳۹ -
۲۶ - مقاماتِ اقبال ، ص ۱۴۰ -
۲۷ - مقاماتِ اقبال ، ص ۹۲ -
۲۸ - مقاماتِ اقبال ، ص ۹۳ -
۲۹ - مقاماتِ اقبال ، ص ۹۴ -

اقبال کی فطرت نگاری اور آن کا فلسفۂ جمال

''فطرت نگاری کی بنا پر اقبال کو ''مصورِ فطرت'' کا لقب دیا گیا ہے ۔ لیکن جمالیاتی نقطۂ نظر سے اقبال کے پورے کلام کا مطالعہ نہیں کیا گیا ۔ صرف اس کی ایک ظاہری صنف کو لے لیا گیا ہے ۔ حالانکہ اقبال کے اردو اور فارسی کلام کا اکثر حصہ حسن کاری کا ایک بے نظیر مرقع ہے جو آن کے جمالیاتی ذوق کا آئینہ دار ہے اور اس لحاظ سے وہ مستقل اظہار خیال چاہتا ہے ۔''*

قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی

○

پچھلے چند برسوں میں اقبال کی شاعری اور آن کے فکری اور فنی رجحانات کے متعلق جو تجزیاتی مقالے لکھے گئے اور بعض صورتوں میں جن مستقل کتابوں کو موضوع بنایا گیا ہے ، ان میں اقبال کی فطرت نگاری سے بھی تفصیل سے بحث کی گئی ہے اور آن کے جمالیاتی رجحانات کا بھی تجزیہ کیا گیا ہے ۔ اقبال کی فطرت نگاری پر دو مضمون ڈاکٹر سید عبداللہ کے ہیں جو پہلے آن کے مجموعۂ مضامین 'مقامات اقبال' میں شامل ہوئے اور بعد میں 'مسائلِ اقبال' میں ۔

*اقبالیات کا تنقیدی جائزہ ، کراچی ، نقش ثانی جون ۱۹۶۵ء ، صفحہ ۵۹ ۔

اپنے مضمون 'اقبال کی فطرت نگاری ، میں ڈاکٹر سید عبداللہ نے جو باتیں کہی ہیں ، آن کا خلاصہ یہ ہے کہ اقبال کی نظر ، حسن فطرت سے لذت حاصل کرتی ہے - لیکن جو جمال اپنے اندر جلال کی شان نہیں رکھتا وہ آن کے نزدیک نا مکمل ہے - دوسرے یہ کہ جمال و زیبائی کا ادراک اور احساس اسی صورت میں ہوتا ہے کہ دیکھنے والے کی نظر جمال کی شعاعوں کو جذب کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے - اقبال فطرت نگار تو ہیں لیکن فطرت پرست نہیں - آن کا ذہن حسنِ فطرت سے مسرت اندوز ہونے کے ساتھ ساتھ کائنات کے اسرار و رموز کے انکشاف اور جستجو کی طرف مائل ہو جاتا ہے -

فطرت نگاری میں اقبال کا طرز بیان وصفی یا توصیفی نہیں بلکہ ایمائی اور رمزی ہے اور وہ یا تو منظر کے حسن کے مجموعی تأثر کو سامنے رکھ کر خیالی مرقعے بناتے ہیں یا اشیائے فطرت میں مشابہتیں و مماثلتیں تلاش کرکے اظہارِ خیال میں مدد لیتے ہیں - مختلف نظموں کے حوالے سے ڈاکٹر سید عبداللہ نے جن چند باتوں پر زور دیا ہے ، وہ یہ ہیں کہ فطرت پر اقبال کی نظموں کی تحریک اکثر و بیشتر مفکرانہ و فلسفیانہ اور کم تر جمالیاتی ہے - ان نظموں میں مشاہدات کی جو کمی ہے ، آسے تخیل اور ذہانت نے پورا کیا ہے اور یہ کہ اقبال نے اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں مغرب کے فطرت پرست شعراء کے زیر اثر خارجی مناظر و مظاہر کی جو جمالیاتی عکاسی کی ہے ، آس میں بھی وہ فطرت پرست نہیں معلوم ہوتے -

یہی بات ڈاکٹر سید عبداللہ نے اپنے دوسرے مضمون : ''اقبال . . . . شیدائے فطرت یا حریفِ فطرت'' میں زیادہ واضح

انداز میں کہی ہے - مضمون کا آغاز وہ اس جملے سے کرتے ہیں :

''اقبال کے یہاں فطرت سے اعتنا کی کئی صورتیں ملتی ہیں مگر اقبال کو شاعرِ فطرت کہنے میں پھر بھی خاصا تأمل ہوتا ہے''۔[۱] اس اجمال کی تفصیل مضمون کی اگلی چند سطریں ہیں جنھیں اس موضوع پر ڈاکٹر صاحب کے خیالات کا خلاصہ بھی سمجھنا چاہیے :

''اقبال کے کلام کے دورِ اول میں شاہد رعنائے فطرت سے راز و نیاز کے کئی پہلو اور کئی روپ مل جاتے ہیں - مگر اقبال کی 'انائے کل' اور ذوقِ تسخیر کی زبردست ہمہ گیری رفتہ رفتہ اس قدر ترقی پذیر ہو جاتی ہے کہ اقبال کو شیدائے فطرت سمجھنے کی بجائے ، حریفِ فطرت کہنے کو جی چاہتا ہے -''[۲]

آگے چل کر کہتے ہیں :

''اقبال کو اس طرح کا شاعرِ فطرت سمجھنا سخت غلطی ہے جس طرح کا مثلاً ورڈز ورتھ کو سمجھا جاتا ہے - انگریزی شاعروں میں وہ اگر کسی شاعر کے کسی قدر قریب ہے تو وہ براؤننگ ہے جس کی شاعری میں فطرت مقصود بالذات نہیں بلکہ بعض افکار کی تشریح کے لیے پس منظر کا کام دیتی ہے -''[۳]

لیکن یہ سب کچھ کہنے کے بعد ڈاکٹر صاحب نے اقبال کی فطرت نگاری کی تعریف بھی کی ہے ، مگر کسی قدر احتیاط کے ساتھ :

---

۱ - مقاماتِ اقبال ، ص ۳۲ -
۲ - مقاماتِ اقبال ، ص ۳۲ -
۳ - مقاماتِ اقبال ، ص ۳۳ -

''یوں تو اقبال کے بعد کے کلام میں فطرت نگاری کے عمدہ نمونے مل جاتے ہیں ، مگر اس زمانے میں ، جیسا کہ بیان ہوا ، اقبال کی نظر فطرت پر حریفانہ پڑتی ہے - اُن کی فطرت دوستی کا اصل زمانہ 'بانگِ درا' کا زمانہ ہے جس میں اشیائے فطرت سے متعلق ان کی مصوری بڑی فن کارانہ اور ماہرانہ ہے -''[۴]

عابد علی عابد صاحب نے اپنی ضخیم تصنیف 'شعرِ اقبال' میں اقبال کے اِبتدائی دور (یعنی ۱۹۰۵ء تک) کی شاعری کے اہم ترین محرکات میں سے ایک محرک ، مناظرِ فطرت کے مشاہدات کو بتایا ہے اور اس نقطۂ نظر سے کلام اقبال کا جائزہ لینے کے لیے کچھ مقدمات قائم کیے ہیں - اُن کا کہنا ہے کہ جب تخلیقی فن کار ، مناظر فطرت کا مشاہدہ کرتا ہے تو ان مناظر کی تصویر کشی کی چار صورتیں اُس کے سامنے ہوتی ہیں :

(۱) پہلی صورت تو یہ ہے کہ وہ فطرت کے مناظر سے وہی لطف و سرور حاصل کرے جو عام لوگ حاصل کرتے ہیں -[۵]

(۲) دوسری صورت یہ ہوتی ہے کہ فن کار مناظرِ فطرت میں وہ تناسب اور ہم آہنگی دیکھتا ہے جو حسن کی صفتِ خاص ہے - انگریزی میں ایسے مشاہدے کو جو جذبات کو آکساتا اور تخلیق کی چنگاریاں سلگاتا ہے Sensuous کہتے ہیں - یہی صورت ہے کہ جس میں فن کار مناظر فطرت کے مشاہدات کو تخیل اور جذبے میں سمو کر شعری آہنگ عطا کرتا ہے[۶]

---

۴ - مقاماتِ اقبال ، ص ۳۴ -
۵ - عابد علی عابد : شعر اقبال ، ص ۱۴۲ -
۶ - شعرِ اقبال ، ص ۱۴۲ -

(۳) تیسری صورت یہ ہے کہ فن کار مناظرِ فطرت کو اپنے جذبات و واردات قلبی کی تصویر کشی کے سلسلے میں پس منظر کے طور پر استعمال کرے یا مناظرِ فطرت کو انسانی افعال و اعمال یا جذبات سے اس طرح مربوط کر دے کہ جذبے کی تصویر منظرِ فطرت کے چوکھٹے میں جڑی ہوئی نظر آئے ۔[۷]

(۴) چوتھی صورت یہ ہے کہ انسان مناظرِ فطرت کی بزرگی، وسعت اور ہیبت کے سامنے اپنے آپ کو حقیر محسوس کرے یا یہ خیال کرے کہ فطرت کے مناظر انسان سے بیگانہ اور اس کی تقدیر کی طرف سے بے پروا ہیں اور اس کی تمدنی راہ میں حائل ہوتے ہیں ۔[۸]

پہلی، دوسری، تیسری اور چوتھی صورتوں کو اردو شاعری میں جس جس طرح برتا گیا، اس کی مثالیں دیتے ہوئے عابد صاحب نے اقبال کے متعلق یہ رائے ظاہر کی ہے کہ ۱۹۰۵ء تک اقبال نے مناظرِ فطرت کی تصویر کشی کے سلسلے میں کم و بیش وہ چاروں صورتیں اختیار کی ہے، جن کا انھوں نے ذکر کیا ۔ البتہ یہ بھی ہوا ہے کہ کبھی انھوں نے پہلی اور دوسری صورت کے امتزاج سے کام لیا ہے اور کبھی دوسری اور تیسری صورت کے امتزاج سے ۔ چوتھی صورت ارتقاء کی آخری کڑی ہے ۔[۹]

عابد صاحب نے مثالوں کے ذریعے یہ بات بھی واضح کی ہے کہ اقبال نے منظر کشی میں مختلف محسناتِ شعر کو بڑی بے تکلفی سے برتا ہے مثلاً چست تراکیب اور نادر تشبیہات و استعارات کا استعمال، لفظ و معانی کی مطابقت اور حرف و لفظ کی تکرار

---

۷ ۔ شعرِ اقبال، ص ۱۳۷ ۔
۸ ۔ شعر اقبال، ص ۱۵۵ ۔
۹ ۔ شعر اقبال، ص ۱۵۷ ۔

سے نغمہ و آہنگ پیدا کرنے کی کوشش ، صنائع کا بے تکلف صرف ، آن کی مناظرِ فطرت کی عام خصوصیات ہیں ۔

لیکن بحث کے آخر میں ''پیام مشرق'' ، ''بال جبریل'' ، ''جاوید نامہ'' ، ''زبورِ عجم'' اور ''ارمغانِ حجاز'' کے حوالے سے یہ بات کہی گئی ہے کہ فن کار نے فطرت و مظاہر کے بیان کو پس منظر کے طور پر استعمال کیا ہے ۔ شعر ، غزل یا نظم کا محرک منظرِ فطرت نہیں بلکہ کوئی اور جذبہ یا احساس ہے ۔ بحث کے آخر میں اشارتاً یہ بات بھی کہی گئی ہے کہ اقبال نے مناظرِ فطرت میں حسنِ ازل کی جو جھلک دیکھی ہے ، وہ حقیقت میں وجودی فلسفے کا عکس ہے ۔

وجودی فلسفے کے اثر اور عکس والی بات عابد صاحب نے ایم ۔ ایم شریف صاحب کے ایک مضمون کے حوالے سے کہی ہے ۔[10] شریف صاحب کا مضمون انگریزی میں ہے[11] اور انھوں نے مشرق اور مغرب میں جمالیات کے مختلف نظریات کے ارتقا کا ذکر کرتے ہوئے آسے نو افلاطونیت تک پہنچایا ہے اور بتایا ہے کہ برطانوی رومانیت کی لہر کے ساتھ فطرت کی شاعری اور جمالیات کا نوافلاطونی نظریہ اردو کے آن ادیبوں اور شاعروں تک پہنچا جن میں سے ایک اقبال ہیں ۔

اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں جو شریف صاحب کے نزدیک ۱۹۰۸ء تک جاری رہتا ہے ، اقبال نہ صرف نو افلاطونی جمالیات کے قائل ہیں بلکہ حسن کے وجودی فلسفے پر عقیدہ رکھتے ہیں اور ہر

---

۱۰ ۔ شعر اقبال ، ص ۱۶۷ ۔

۱۱ M.M. Sharif : Iqbal's Theory of Beauty.Studies in Iqbal's Thought and Art pp. 431-459,

منظرِ فطرت میں حسنِ ازل کا جلوہ دیکھتے ہیں - حسن ہی ہے جو عشق کی تحریک کا باعث اور اس کے کمال کا سبب بنتا ہے - اس جگہ شریف صاحب نے اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ ایک راسخ العقیدہ مسلمان کی حیثیت سے اقبال اس بات پر بھی ایمان رکھتے ہیں کہ جمال ، اللہ تعالیٰ کے اوصاف میں سے ایک ہے - اس لیے آن کے تصورِ جمال پر بحث کرتے ہوئے اسے بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے - لیکن نتیجہ یہی نکلا ہے کہ ابتداً آن کا نظریۂ حسن نو افلاطونی روایت کا پابند ہے - آس کے نزدیک حسن ازلی و ابدی، اور عشق ، آرزو اور حرکت کی علت فاعلی اور علتِ غائی ہے - لیکن آگے چل کر آن کے نقطۂ نظر میں تبدیلی پیدا ہوئی - اولاً یہ تبدیلی ایک تشکیک کی صورت میں رونما ہوئی اور بالآخر اس نے حسن کی اہمیت کے متعلق ایک طرح کے قنوطی فلسفے کی صورت اختیار کر لی - اس لحاظ سے ۱۹۰۸ء سے ۱۹۲۰ء تک کا زمانہ اقبال کی ذہنی تبدیلی اور انقلاب کا زمانہ ہے -

آنیسویں صدی کے وسط کے بعد یورپ میں رومانی تحریک نے ایک نیا رخ اختیار کیا - انگلستان میں براؤننگ نے اسلوب کے لہجے اور انداز کی اساس قوت اور جوش پر رکھی ، کارلائل نے بطل پرستی کی طرح ڈالی ، لائڈ مارگن کی حیاتیات نے دنیا کو بروزی ارتقا کے نظریے سے آشنا کیا اور میڈوگل نے انا یا احساسِ ذات کو انسانی زندگی کی اساس قرار دیا - ایچ - جی ویلز کے ناولوں نے انسان کو زمان و مکان کی تسخیر کی راہ دکھائی اور سائنس دان تسخیر کے اس تصور کو حقیقت بنانے کے عمل میں مصروف رہے -

برنارڈشا نے قیصر ، نپولین ، ہٹلر ، مسولینی اور اسٹالن کو

قوت حیات کا مظہر بنا کر پیش کیا - جرمنی میں کانٹ عزمِ ذاتی کو تحسینِ جمال کی ایک شرط قرار دے چکا تھا اور شوپنہار اختیار کو کائنات کے اجزائے ترکیبی میں سے ایک قرار دے کر ہمیں اس کی طرف متوجہ کر چکا تھا - حقیقت حسن کی تلاش میں گوئٹے اس سے بھی آگے گیا - اس کے متعلق کہا گیا ہے کہ اس کی جستجوئے حسن ، عشق کی الوہی تاثیر کی توصیف پر ختم ہوتی ہے، اس عشق کی توصیف پر جو ہر لمحہ حسن کا ایک نیا جلوہ دکھاتا ہے -

آگے چل کر مارکس نے جدلیاتی فعلیت کا تاریخی فلسفہ پیش کیا اور اسی زمانے میں فرانس میں برگساں کا فلسفہ elan vital عام ہوا جو حرکت اور تغیر کا فلسفہ ہے - آسٹریا میں فرائڈ نے جنسی محبت کو تمام فنونِ لطیفہ کی بنیاد قرار دیا اور ایڈلر نے قوتِ انا کو عزم تفوق کے مماثل ٹھہرایا -

مختصر یہ کہ یورپ کے مختلف ملکوں میں ایک ہی زمانے میں وجود میں آنے والے مختلف حیات بخش فلسفوں نے اقبال کے ذہن کو متاثر کیا - زندگی کا یہ فلسفہ انسانِ کامل کے اس تصور سے مماثلت رکھتا تھا جس کی مشرقی ادب میں بھی ایک طویل تاریخ موجود تھی - حکیم سلطان کے افلاطونی تصور کو الغزالی ، ابنِ مینا ، ابنِ عربی ، رومی ، الجیلی اور دوسرے حکماء نے اپنی تحریروں میں پوری طرح نمایاں کیا -

اپنے مابعدالطبیعیاتی تصورات میں اقبال بھی ایک بطلی حرکتی ہیں - وہ اسلام کی نشاۃ الثانیہ کے خواہش مند ہیں اور مسلمانوں کو ابطال کی قوم بنانا چاہتے ہیں ، لیکن اس دور میں بھی حسن کا مقام اُن کی نظر میں اس لحاظ سے اونچا ہے کہ وہ عشق کی تخلیق کا

باعث ہے - شریف صاحب کے نزدیک اقبال اپنی شاعری کے پہلے اور دوسرے ادوار میں یعنی اولاً ۱۹۰۸ء تک اور پھر ۱۹۲۰ء تک ، اقبال کا نظریہ یہ تھا کہ حسن ، عشق کی تخلیق کا باعث بنتا ہے ، ۱۹۲۰ء کے بعد صورتِ حال بدل گئی - اس دور میں عزم للقوۃ (Will-to-Power) یا قوتِ انا (Ego-energy) حسن کی خالق بنتی ہے - حقیقت کی روح اب اُن کے نزدیک حسن نہیں بلکہ عشق یا انا کا عزم ہے ، اور خدا ، جو انائے مطلق اور حقیقتِ ابدی ہے -

اقبال کے تصورِ حسن کا خلاصہ یہ ہے کہ فکر کے ابتدائی مراحل میں اقبال کے لیے حسن ، عشق کا خالق اور اس کی منزل تھا؛ اگلے مرحلے میں حسن ، عشق کا خالق تو تھا ، لیکن اس کی منزل نہیں تھا اور بالآخر عشق ہی سب کچھ ہے . . . . اقبال کا نظریۂ حسن بنیادی طور پر ایک نظریۂ اظہار ہے ، لیکن یہ نظریہ ہم نے اُن کی شاعری سے اخذ کیا ہے ، اس کا ذکر اقبال نے کسی جگہ نظریے کے طور پر نہیں کیا - اسی ضمن میں شریف صاحب کا یہ جملہ قابلِ توجہ ہے :

> ''اقبال نے ہمیں لافانی شاعری دی ہے - کاش یہی بات میں اُن کے نظریۂ حسن کے متعلق کہہ سکتا''۔[۱۲]

شریف صاحب نے اقبال کے نظریۂ حسن کو بنیادی طور پر اُن کی شاعری سے مستنبط اور ایک نظریۂ اظہار قرار دے کر اُس کی فلسفیانہ اساس کو ضعف پہنچایا ہے -

اس کے برخلاف بعض نقاد ایسے بھی ہیں جنھوں نے اقبال کے پورے نظامِ فکر اور نظامِ فن میں اُن کے فلسفۂ حسن کا سراغ

---

۱۲ - Iqbal's Theory of Beauty : Studies in Iqbal's Thought and Art p. 150.

لگایا ہے - اس طرح کا ایک مطالعہ نصیر احمد ناصر کی کتاب ''اقبال اور جمالیات'' ہے - نصیر احمد ناصر نے اپنے مطالعہ کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے : پہلے حصے میں اقبال کے افکار اور جمالیات کے رشتے کی وضاحت کی گئی ہے اور دوسرے میں اُن کے فن اور جمالیات کے نطق کی - افکار کے حصے میں خودی ، وحدت الوجود حسنِ معروضی ، موضوعیت و معروضیت ، حسن کا حرکی نظریہ ، اظہاریت ، نظریۂ جلال ، جمالیاتی مشاہدہ ، جمالیاتی حس اور جمالیاتی ذوق کے عنوانات کے تحت اظہارِ خیال کیا گیا ہے ؛ جو کچھ کہا گیا ہے ، اُس کا خلاصہ کیا جائے تو یہ ہوگا :

''اقبال ، بار بار مختلف الفاظ میں اس امر کا اظہار کرتے ہیں کہ خودی ایک نور ہے ، جس سے انسان میں شعور و آگہی کی شمعیں روشن ہیں -[۱۳] یہی نور خودی ہے جسے حسنِ خودی سے تعبیر کرتے ہیں -[۱۴] خدا نور بھی ہے اور حسن بھی یا دوسرے لفظوں میں نور اور حسن ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں -[۱۵] علامہ اقبال کے نزدیک خدا حسنِ ازلی ہے جو اس عالم ہستی میں آشکارا بھی ہے اور مستور بھی ، یعنی یہ موضوعی اور معروضی دونوں عالموں میں موجود ہے اور یہ اُسی کا پرتو ہے کہ عالم انفس و آفاق ان گنت حسین و دل کش تصویروں کا ایک بے مثال مرقع ہے -[۱۶] علامہ اقبال کی نظر میں اس عالمِ طبیعی کی ہر چیز حسن و جاذبیت کا

---

۱۳ - نصیر احمد ناصر : اقبال اور جمالیات ، ص ۴۳ -
۱۴ - اقبال اور جمالیات ، ص ۴۵ -
۱۵ - اقبال اور جمالیات ، ص ۴۷ -
۱۶ - اقبال اور جمالیات ، ص ۶۳ -

پیکر ہے[۱۷] - حسن موضوعی ہے ، یعنی خارج میں نہیں بلکہ انسان کے موضوع یا قلب میں ہوتا ہے -[۱۸] علامہ اقبال حسن کو تخیل کا مرہونِ منت سمجھتے ہیں -[۱۹] اقبال کی فکر نے موضوعیت سے ''معروضیت و موضوعیت'' کی طرف تدریجی ارتقا کیا ہے[۲۰] - علامہ کے نزدیک جس طرح حسن حقیقت کا آئینہ دار ہے ، اسی طرح دل بھی حسن کا آئینہ دار ہے اور معروضی حسن دل کے لیے ایسا آئینہ ہے جس میں وہ حسن حقیقت کا مشاہدہ کرتا ہے -[۲۱] کائنات کے تغیر دوام میں سکون و ثبات کا نظر آنا تو فقط ایک فریبِ نظر ہے ، اصل یہ ہے کہ موجودات کا ذرہ ذرہ ہر دم ایک نئی شان یا حسین حالتِ ارتقائی میں رہتا ہے -[۲۲] زندگی کی طرح حسن بھی ہر لحظہ ایک نئی شان میں جلوہ نما ہوتا رہتا ہے[۲۳]- مشاہدے کی تکمیل کے لیے موضوعی حسن اور معروضی حسن دونوں کی ارتقائی حرکت میں مساوات و یکسانیت کا پایا جانا یقیناً ضروری ہوا[۲۴] - اقبال کے نزدیک ''ذوقِ نمو'' یا جمالیاتی اصطلاح میں ''ذوقِ اظہار'' ہی اصل میں ہر شے کا جوہر اور مقام ہوتا ہے -[۲۵] خودی جب تک معرضِ وجود میں نہیں آتی ،

---

۱۷ - اقبال اور جمالیات ، ص ۷۸ -
۱۸ - ایضاً ، ص ۹۶ -
۱۹ - ایضاً ، ص ۹۹ -
۲۰ - ایضاً ، ص ۱۱۱ -
۲۱ - ایضاً ، ص ۱۱۸ -
۲۲ - ایضاً ، ص ۱۳۶ -
۲۳ - ایضاً ، ص ۱۳۷ -
۲۴ - ایضاً ، ص ۱۳۹ -
۲۵ - ایضاً ، ص ۱۵۶ -

وہ محض ایک راز ہوتی ہے لیکن وہ اپنے آپ کو معرضِ اظہار میں لے آتی ہے تو کائنات کی بیداری یعنی حسنِ وجود بن جاتی ہے۔[۲۶] اقبال اظہار ہی کو عینِ حیات سمجھتے ہیں۔[۲۷] وہ چونکہ قوت، رفعت اور حسن کو اصل کے اعتبار سے ایک ہی شے خیال کرتے ہیں، اس لیے اسی خودی کا اظہار حسین ہوتا ہے جس کا مقام بلند ہوتا ہے۔[۲۸] اقبال اس کائنات کو جمال اور جلال دونوں کا مظہر سمجھتے ہیں۔[۲۹] فن کے حسن و کمال کا راز بھی یہ ہے کہ جمال و جلال دونوں کا مظہر ہونا چاہیے"۔[۳۰]

فن اور جمالیات کے رشتے پر بحث کرتے ہوئے نصیر احمد ناصر کہتے ہیں کہ:

"یہ درست ہے کہ "اظہارِ خودی" فن کا ایک ناگزیر عنصر ہے، لیکن فن کی جمالیاتی قدروں کا انحصار خود نوعیتِ خودی پر ہوتا ہے۔ یعنی اگر خودی کا مقام پست ہے تو اس کا اظہار بھی ادنیٰ اور قبیح ہوگا۔ اس کے برعکس اگر اس کا مقام بلند ہے تو اس کے اظہار میں بھی رفعت و خوبی اور جمال و جلال ہوگا . . . . خودی کا اپنی اور دوسروں کی خاطر اپنے حسن و کمال کے اظہار کا نام فن ہے۔[۳۱] حسن چونکہ آئینۂ حق ہے، اس لیے حق کا آئینہ دارِ حق ہونا بھی

---

۲۶ - ایضاً، ص ۱۵۸ -
۲۷ - ایضاً، ص ۱۶۰ -
۲۸ - ایضاً، ص ۱۶۱ -
۲۹ - ایضاً، ص ۱۸۳ -
۳۰ - ایضاً، ص ۱۸۵ -
۳۱ - ایضاً، ص ۲۸۶ -

ضروری ٹھہرا[۳۲] ، لیکن فن میں اس حقیقت کے علاوہ ایک اور عنصر کا ہونا بھی ناگزیر ہے جسے ''سوز'' کہتے ہیں اور جو اصل میں شعر کی جان ہے ، نیز یہ ''سوز'' ہی ہے جو فلسفہ اور شعر میں مابہ الامتیاز ہے[۳۳] - یہ سوز کیا ہے ؟ یہ دردِ انسانیت ہے جو طمانیت و مسرت کا سرچشمہ ہے - سرگرمیِ حیات کے تمام نظارے اس غمِ عشق کی بدولت معرضِ ظہور میں آئے ہیں - یہی ''غمِ دیگر'' ہے کہ مقصدِ حیات اور مقصودِ فطرت ہے''[۳۴]

اقبال کے نظریۂ عشق و فن کا خلاصہ یہ ہے کہ سوزِ عشق یا خونِ جگر ، فن کا ناگزیر عنصر ہے جس کے بغیر کوئی فنی تخلیق حسن و کمال کو نہیں پہنچ سکتی -[۳۵] مقصدیت ، اصل حیات اور حیات عمل و حرکت ہے تو فن کا مقصدِ اولین زندگی ، حرکت و عمل ہوا - لہٰذا فلسفہ ہو یا فن ، اگر حرکت و عمل کا دشمن ہے تو افسون و سحر کاری ہے اور اس لیے ناجائز و ناروا ہے -[۳۶] یہ ذوق عمل ہی ہے جو زندگی کے ارتقائے مسلسل کا ضامن ہے اور یہ آرزو ہے جو ذوقِ پیدا عمل کرتی ہے ، لہٰذا فن کا اہم وظیفہ تخلیقِ آرزو ہوا ، لیکن آرزو حسن کی ہونی چاہیے - اس اعتبار سے فن کی غایت حسن ہے اور حسن بذاتِ خود آرزوؤں کا خالق ہے اور اسی کے طفیل اس جمیل و جلیل دنیا میں آرزوؤں کی گرم بازاری و بہار ہے - جہاں تک حسن کا تعلق ہے ، یہ فن کا مقصود بھی ہے اور اس کی تخلیق بھی -[۳۷]

---

۳۲ - ایضاً ، ص ۲۸۷ -
۳۳ - ایضاً ، ص ۲۸۷ -
۳۴ - ایضاً ، ص ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹ -
۳۵ - ایضاً ، ص ۲۹۵ -
۳۶ - ایضاً ، ص ۳۰۶ -
۳۷ - ایضاً ، ص ۳۰۸ -

فن اور فطرت کے رشتے کے تعلق پر ''اقبال اور جمالیات'' میں علیحدہ عنوانات کے تحت بحث کی گئی ہے - نصیر احمد ناصر کا خیال ہے کہ اس سلسلے میں ''جہاں تک علامہ اقبال کا تعلق ہے ، وہ واضح طور پر دبستانِ فطریت سے تعلق رکھتے ہیں ، لہٰذا وہ فطرت کی تقلید اور غلامی کو فن کے لیے نہایت مہلک تصور کرتے ہیں . . . . وہ حتمی طور پر فن کو فطرت سے افضل و اعلیٰ سمجھتے ہیں -[۳۸] آن کے نزدیک فن کار فطرت کا غلام نہیں بلکہ اس کا فاتح ہے -[۳۹] فطرت ، جمال کے جن پیکروں کو ادھورا چھوڑ دیتی ہے فن کار آن کی تکمیل کرتا ہے -[۴۰]

کتاب کے آخری باب ''تقلید ، غلامی اور اجتہاد'' میں نصیر احمد ناصر صاحب نے ''زبورِ عجم'' اور ''ضربِ کلیم'' کی بعض نظموں کے حوالے سے بعض ایسے نتائج نکالے ہیں جن سے اقبال کے فلسفۂ جمال پر روشنی پڑتی ہے - کتاب کے الفاظ یہ ہیں :

> ''تقلید ذہنی غلامی کی مظہر، تخلیق فعلیت کے جمود و تعطل کی دلیل ، اجتہادِ فکر و نظر کی دشمن ، جدت و بداعت کی رقیب اور ندرت و عبقریت کی حریف ہے - یہ ایک طرف تو فن کار کی فنی صلاحیتوں کو مفلوج اور دوسری جانب ترقی کی راہوں کو مسدود کر دیتی ہے - لہٰذا یہی وجہ ہے کہ دیگر حریت پسند علمائے جمالیات کی طرح علامہ اقبال بھی آزادیِ فن کے حامی و نقیب اور تقلید کے زبردست مخالف ہیں اور اسے تخیل و تفکر اور عشق و مستی کے لیے ہلاکت و بربادی کا پیام سمجھتے ہیں''-[۴۱]

---

۳۸ - ایضاً ، ص ۳۷۵ -
۳۹ - ایضاً ، ص ۳۷۶ -
۴۰ - ایضاً - ص ۳۷۶ -
۴۱ - نصیر احمد ناصر ، اقبال اور جمالیات ، ص ۳۸۵ -

پیغامِ اقبال کی آفاقیت

''اقبال کا پیغام صرف مسلمانوں کے لیے نہیں ہے بلکہ اسلام کو تو انہوں نے دنیا کے سامنے بہترین تمدنی نظام کی حیثیت سے پیش کیا ہے ، اس لیے کہ وہ اسلام کو مذہب انسانیت سمجھتے ہیں اور جب وہ مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہیں تو گویا انسانوں کو اپنا موضوع سخن بناتے ہیں - جن لوگوں کی نظر اقبال کے پورے کلام اور اس کی غرض و غایت پر نہیں ہیں ، ان کی جانب سے آن پر فرقہ پرستی کا الزام لگایا جاتا ہے - اگرچہ پیغام اقبال کے انسانی اور عالمگیر ہونے پر بعض اہل قلم نے لکھا ہے اور آن کے کلام سے اس کا ثبوت بھی مہیا کیا ہے لیکن اس اعتراف کے پیش نظر اب تک اس موضوع پر جامعیت کے ساتھ نہیں لکھا گیا جو ناقدین اقبال کا مسکت جواب ہوسکے-''*

—قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی

پیغام اقبال کی انسانی، آفاقی یا عالمگیر حیثیت پر مختلف زاویوں سے نظر بھی ڈالی گئی ہے اور اسے بحث و تمحیص کا موضوع بھی بنایا گیا ہے - عام طور سے تو یہی کہا گیا ہے کہ اقبال اسلام کے ذریعے محبت اور اخوت کو عام کرنا چاہتے ہیں - آن کے نزدیک اسلام کا مقصود عالمگیر محبت و اخوت ہے لیکن جب تک ایک ملت اس کی مثال قائم نہ کرے اور دوسروں کے لیے نمونہ نہ

*اقبالیات کا تنقیدی جائزہ ، اقبال اکیڈمی ، کراچی ، نقش ثانی جون ۱۹۶۵ء ، ص ۱۲۷ -

بنے تب تک اخوت کی حدیں وسیع نہیں ہو سکتیں ۔[۱]

اقبال کا اپنے کلام میں ایسے استعارات ، علامات اور تلمیحات کا استعمال کرنا جن کا تعلق اسلامی تاریخ اور اسلامی ادب سے ہے ، اس بنا پر ہے کہ یہ استعارات اور علامات ان موضوعات سے ہم آہنگ ہیں جن پر اقبال نے لکھا ہے اور اقبال کے بعض اسلامی اصولوں پر زور دینے کی وجہ یہ ہے کہ اقبال کا اس بات پر ایمان تھا ، موجودہ تہذیب کی بعض مشکلات کا حل صرف ان اصولوں کو اختیار کرکے ہی تلاش کیا جا سکتا ہے ۔[۲]

بعض لکھنے والوں کے نزدیک اقبال کی عظمت وہ مقصد ہے جس کے لیے انھوں نے شاعری کی ۔ وہ ہر اعتبار سے ایک عہد آفریں شاعر ہیں ۔ ہم ان کے خیالات سے اتفاق کریں نہ کریں ، ان خیالات کی عظمت سے ہرگز انکار نہیں کرسکتے ، اس لیے کہ اقبال نے جو بات کہی ہے وہ انسانیت کی بلندی سے کہی ہے ۔ اقبال صرف مقصد کی عظمت ہی کے قائل نہیں ہیں بلکہ اس کے حصول کے لیے طریقِ کار کی عظمت کے بھی قائل ہیں ۔ عظمت کے اس تصور نے اقبال کی شاعری کو ایک آفاقی حیثیت اور عالمگیر قدر بخشی ہے ۔[۳]

بعض نقادوں کو یہ شکایت ہے کہ کلام اقبال کا مطالعہ اسے مختلف خانوں میں بانٹ کر کیا گیا ہے اور بعض صورتوں میں ایک خانے کو دوسرے خانے سے الگ رکھ کر ، اس لیے کلام اقبال کی

---

۱ ۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم : فکر اقبال ، صفحہ ۶۵ ۔

۲ ۔ Abdul Qadir : Dr. Sir Mohammad Iqbal the Great Poet of Islam in : The Great Poet of Islam Page 40

۳ ۔ جگن ناتھ آزاد ، اقبال اور اس کا عہد ، ص ۱۰۱ ۔

آفاقی حیثیت پوری طرح واضح نہیں ہو سکی ۔[۴] اقبال کے کلام کے حوالے سے کہا گیا ہے کہ اقبال کے فلسفۂ حیات کی روح توازن ہے اور انھوں نے ہر شئے کو خاص جگہ دے کر اور حدود و قیود میں محصور رکھ کر اپنا پیش کردہ نظامِ حیات قائم کیا ہے ۔ اقبال کا نقطۂ نگاہ عالمی ہے ۔ ملک پر بھی اُن کی نظر ہے اور ملت پر بھی ۔ وہ نسل کو بھی دیکھتے ہیں اور اصل کو بھی ۔ نظر کی یہ عالمیت ، عمومیت ، بلندی اور بے باکی اقبال کی خصوصیت ہے ۔ اقبال نے جہاں رنگ ، نسب اور نسبت سے برأت کی ہے وہاں مذہب کے اُس تصور کو بھی مستحسن نہیں سمجھا جو انسان کو انسان سے جدا کرے ۔[۵]

یہی بات حمید احمد خاں صاحب نے اپنے انگریزی کے ایک مضمون میں کہی ہے[۶] اور اقبال کے بعض نقادوں کے حوالے سے جنھوں نے شاعر کو ''ہندی مسلمانوں کا'' . . . . ''صرف مسلمانوں کا'' . . . . ''بنیادی طور پر مقامی'' کہا ہے ، اس بات سے عالمانہ بحث کی ہے کہ شاعری میں کیا چیز ہے جس کی بنا پر اسے مقامی یا آفاقی کہا جاتا ہے اور پھر ہومر ، ڈانتے اور شیکسپیئر کی مثالیں دے کر یہ واضح کیا ہے کہ ایک مخصوص عہد ، ایک مخصوص سرزمین ، ایک مخصوص عقیدے سے جذباتی وابستگی ایسی شاعری کی تخلیق کا باعث بن سکتی ہے جس کی کشش عالمگیر اور آفاقی ہو ۔

---

۴ ۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری : اقبال—آفاقی شاعر ، مشمولہ ، خیابان اقبال ۔

۵ ۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری : اقبال—آفاقی شاعر ، مشمولہ : خیابانِ اقبال ، ص ۱۹۷ ۔

۶ ۔ ''The Universal note in Iqbal's Poetry'' مشمولہ : اقبال کی شخصیت اور شاعری ۔

اقبال کی دور اول کی شاعری کے متعلق نقادانِ فن اسی طرح کا خیال ظاہر کرتے چلے آئے تھے - لیکن حیرت کی بات ہے کہ جب اقبال نے یہ کہنے کے بجائے کہ ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا'' یہ کہا ہے ''مسلم ہیں ہم ، وطن ہے سارا جہاں ہمارا'' تو اس پر مقامی ہونے کا الزام لگا کر ''آفاقی'' ہونے کی سند اس سے چھین لی گئی - غور سے دیکھا جائے تو ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا'' میں جس طرح کی علاقائی قومیت کا نعرہ بلند کیا گیا ہے ، اس کا دور ختم ہوچکا ؛ نیا زمانہ ایک نئے بین الاقوامی زاویۂ نظر کی تلاش میں ہے اور نسل اور مقام کی وفاداریاں اب نصب العینی وفاداریوں کے لیے جگہ خالی کر رہی ہیں -

تاریخ شاہد ہے کہ اسلام پہلا مذہب ہے جس نے قوموں کو بین الاقوامی وفاداری کا یہ تصور دیا اور اقبال پر جب مقامی اور علاقائی وطنیت کے نقائص واضح ہوئے تو فلسفۂ تاریخ کے مبصر کی حیثیت سے ان کی نظر فوراً اس نکتے کی طرف گئی اور انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے دنیا کو قومیت کا ایک وسیع تر تصور دیا - لوگ آن کی شاعری میں ''اسلام'' اور ''مسلم'' کے نام پر برافروختہ ہوتے ہیں ، حالانکہ کسی فلسفیانہ یا تاریخی سچائی سے کسی وسیع تر تصور کا استنباط نہ شعراً ممنوع ہے ، نہ عقلاً -

اردو کے مارکسی نقادوں نے اقبال کے احساس آفاقیت پر صرف اس بنا پر نکتہ چینی کی ہے کہ اقبال نے اخلاقی اور معاشرتی تصورات کے اظہار کے لیے مارکسیت کے بجائے اسلام کو پس منظر بنایا - اس اعتراض کا جواب یہ کہہ کر دیا گیا ہے کہ اقبال نے اسلام کو اشتمالیت پر اس لیے ترجیح دی کہ آن کی جذباتی وابستگی اسلام کے ساتھ تھی ، اشتمالیت کے ساتھ نہیں - ہر فن ، آس کی

نوعیت خواہ کچھ بھی ہو ، حقیقت میں جذباتی ردعمل کی ایک شکل ہے اور جو فن کار اپنی جذباتی وابستگیوں سے روگردانی کرتا ہے ، اُس کے تخلیقی عمل کی راہ میں رکاوٹیں حائل ہوتی ہیں - زندگی کے تجربے میں جذبے کی گرمی کے امتزاج ہی نے ڈانتے ، گوئٹے ، رومی ، سعدی اور اقبال کو عظمت بخشی -

پھر یہ بات بھی دیکھنے کی ہے کہ مذہب اور عظیم فن باہم متناقض نہیں ہیں ، بلکہ حقیقت اس کے خلاف ہے - شاعری ، موسیقی ، سنگ تراشی اور تعمیر کی عظیم ترین یادگاروں کی تخلیق ، مذہب کی تحریک کا نتیجہ اور اس کا فیضان ہے - یہ صحیح ہے کہ مذہب کی بنیاد پر بھی ایسی شاعری کی جا سکتی ہے جس کا نقطۂ نظر محدود ہو - لیکن جس مذہبی شاعری کا سرچشمہ خارجی مظاہر کے بجائے مذہب کی روح ہوگا ، اُس کی اساس عظمت پر قائم ہوگی - یہی صورت انگریزی میں ڈانتے کی شاعری کی اور فارسی اور اُردو میں اقبال کی شاعری کی ہے -

اقبال کی شاعری عروجِ آدم کی شاعری ہے - اللہ تعالیٰ جس انسان کی ذات میں اپنا جلوہ دیکھنے کا منتظر ہے ، اقبال اسے اپنی شاعری میں ارتقاء کے مختلف مرحلوں سے گزرتا ہوا دکھاتے ہیں تو وہی استعارے ، وہی اشارے اور وہی تلمیحات استعمال کرتے ہیں جو مسلمانوں کے معاشرے نے ، اُن کی تاریخ نے اور قرآنِ حکیم نے انہیں دیے ہیں ، اس لیے کہ ان میں سے ہر استعارے ، ہر اشارے اور ہر تلمیح میں معانی کی ایک دنیا آباد ہے اور اقبال کے کلام کے جن حصوں میں یہ خیالات نظم کیے گئے ہیں اُن کے مطالعے اور تجزیے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال کی نظر کسی مذہبی گروہ کے مستقبل کے بجائے حقیقت میں انسان کے مستقبل کی طرف ہے -

بارگاہِ الٰہی میں اقبال کی دعا صرف یہ ہے کہ :

ز خاکِ ما دگر آدم برانگیزے

اقبال اپنی قوم کی جسمانی بقا کے خواہاں ہونے کے بجائے پوری نسلِ انسانی کی اخلاقی بقا کے آرزومند ہیں ۔

اسی طرح گویا اقبال کی شاعری میں وسیلۂ اظہار تو اسلامی ہے ، لیکن شاعری کی روح آفاقی ہے اور یہ بات اس لیے ممکن ہے کہ اقبال کے نزدیک اسلام اپنی حقیقت کے اعتبار سے عالمگیر اور آفاقی ہے ۔ اسلام صرف مسجد و ملا تک محدود نہیں ؛ وہ ایک ہمہ جہت قوت ہے اور اسے انسانیت کی روحانی ، حتّٰی کہ جسمانی بقا میں ایک لازمی کردار ادا کرنا ہے ۔

ہمارے عہد کی انسانیت جن عوارض میں مبتلا ہے ، اُن کا علاج اب نہ صوفیت کے پاس ہے ، نہ قومیت کے پاس اور نہ ملحدانہ اشتراکیت کے پاس ۔ صرف مذہب ، ملائیت اور رسمیت سے بلند ہو کر اپنی اعلیٰ ترین صورت میں عہدِ جدید کے انسان کو اُس ذمہ داری کا بار اُٹھانے کا اہل بنا سکتا ہے جو جدید سائنس کی ترقی کا لازمی نتیجہ ہے ، اور اُس میں یقین کا وہ رویہ پیدا کر سکتا ہے جو اُس کی شخصیت کی تعمیر اور استحکام کا سبب بنے گا ۔

سیاسی شاعری میں بھی اقبال کا نقطۂ نظر انہیں اسلام اور ایشیا سے باہر لے جاتا ہے ۔ وہ نہ مغرب کے دشمن ہیں ، نہ اہلِ مغرب کے ، وہ صرف مغرب کے ایک مخصوص طرزِ زندگی کو برا کہتے ہیں ۔ وہ مغرب دشمن ہونے کے بجائے انسان دوست ہیں ۔[۸]

---

۷ - پروفیسر حمید احمد خاں : اقبال کی شخصیت اور شاعری ، ص ۱۶۹

۸ - پروفیسر حمید احمد خاں : اقبال کی شخصیت اور شاعری ، ص ۱۶۱ -

اقبال کی جنگ انسان دوستی پر مبنی تھی ، فرقہ پرستی پر نہیں ، اور جیسا کہ آن کے بعض بیانات سے ظاہر ہے ، وہ صرف اخوتِ انسانی کو ہی قابل اعتماد اخوت سمجھتے تھے ، اس لیے کہ یہ اخوت رنگ، نسل ، قوم اور زبان کی حد بندیوں سے بالاتر ہے ۔[۹]

جنوری ۱۹۳۸ء میں اقبال نے اپنی ایک نشری تقریر میں اپنے آفاقی مسلک کا اعلان بڑے واضح لفظوں میں کیا :

"۔۔۔۔ جب تک اس نام نہاد جمہوریت ، اس لعنت زدہ قومیت اور اس زوال آمادہ ملوکیت کو نیست و نابود نہیں کر دیا جاتا اور جب تک انسان اپنے عمل سے یہ ثابت کر کے نہیں دکھاتے کہ سارا عالم خدا کا گھرانا ہے ، وہ کبھی مسرت اور آسودگی کی زندگی بسر نہیں کر سکیں گے اور آزادی ، مساوات اور اخوت کا حسین نصب العین کبھی عملی صورت اختیار نہیں کرسکے گا ۔"[۱۰]

حمید احمد خاں صاحب نے مضمون کے آخر میں آفاقی شاعری کے خالص ادبی اصول پیش کرتے ہوئے اقبال کی شاعری کی آفاقیت کی طرف ایک اور اشارہ کیا ہے ۔ آن کا کہنا ہے کہ شاعری کے دوسرے اقسام کی طرح آفاقی شاعری بھی اپنے خاص اسلوب اور روپے رکھتی ہے ۔ شاعری کا دلچسپ ہونا یا آس کا زیادہ پسند کیا جانا ، آس کے آفاقی ہونے کی دلیل نہیں ، اور شاعر کی عظمت اور آفاقیت کا اندازہ آس کے قارئین کی تعداد کی کثرت سے نہیں لگایا جاتا ۔ دوسری بات یہ کہ شاعری خواہ حصولِ لطف و مسرت کا وسیلہ بنے یا پیغام کی ترسیل و ابلاغ کا ، وہ انسانی زندگی کی دو ضرورتیں پوری کرتی ہے ۔ یہ دونوں ضرورتیں انسان کے لیے اہم بھی ہیں اور ان کی

---

۹ ۔ پروفیسر حمید احمد خاں: اقبال کی شخصیت اور شاعری، ص ۱۶۰ ۔

۱۰ ۔ پروفیسر حمید احمد خاں : اقبال کی شخصیت اور شاعری، ص ۱۶۱ ۔

عالمگیر اور آفاقی نوعیت مسلم ہے اور اس لیے یہ کہنا کہ دونوں میں سے ایک دوسرے سے کم تر ہے ، صحیح نہیں ۔

یاد رکھنے کی بات صرف یہ ہے کہ اقبال ایک صاحب پیغام شاعر ہیں (ورڈزورتھ کی طرح) اور پیغام دینے والی شاعری کا ایک واضح رخ ہونا چاہیے ۔ اقبال کی شاعری کا بھی ایک واضح رخ ہے ۔ اقبال کی کائنات امید ، روشنی اور عمل کی زندہ کائنات ہے ۔ یہ مایوسی، تاریکی اور بے عملی کے الفاظ اس کائنات کے لیے بیگانہ ہیں ۔

اقبال کی شاعری ہمیں ایک ایسے نصب العین کی طرف لے جاتی ہے جو کبھی حاصل نہیں ہوتا ، اس لیے کہ ہر نصب العین سے آگے ہمیشہ ایک نصب العین ہوتا ہے ۔ اقبال اس لحاظ سے اس وقت تک دنیا کا سب سے بڑا شاعر شمار ہوتا رہے گا جب تک اس کی شاعری کے پیغام کو عملی جامہ پہنانے والے ستاروں پر کمند ڈالنے کے عمل میں مصروف رہیں گے ۔[11]

اور اقبال کی شاعری کی آفاقیت کی یہ ایک اور زندہ دلیل ہوگی ۔

---

۱۱ ۔ پروفیسر حمید احمد خاں : اقبال کی شخصیت اور شاعری، ص ۱۵۹۔

اقبال کا نظریۂ وطنیت

''اقبال کی قومی نظموں کے داعیات واسباب اور اُن کا پس منظر ایک سیر حاصل بحث کے محتاج ہیں جن پر مستقل اظہارِ خیال کی ضرورت ہے . . . . ''* اقبال پر ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ وہ پین اسلامزم (Pan-Islamism) کے حامی تھے حالانکہ خود اقبال نے اس خیال کی تردید کر دی ہے کہ اُن کے نزدیک اس لفظ کا کوئی مفہوم نہیں ہے . . . .''**

قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی

اقبال کے نظریۂ قومیت ، اُن کی قومی شاعری اور اقبال بہ حیثیت قومی شاعر کے موضوع پر اُن کی زندگی میں بھی جو کچھ لکھا گیا اور اُن کے انتقال کے بعد بھی ، اُس میں خاصا خلط مبحث ہے - اس بحث میں وطنیت اور قومیت کے الفاظ کبھی مختلف مفہوموں میں استعمال کیے جاتے ہیں اور کبھی ایک ہی مفہوم میں - کبھی حبِ وطن اور وطن پرستی کو ہم معنی سمجھ کر ہم کہتے ہیں کہ اقبال کی شاعری میں حبِ وطن کا تصور اُن کی شاعری کے ابتدائی دور میں تو موجود تھا ، لیکن اگلے ادوار میں اقبال کے کلام میں وطن کی محبت کی جگہ بعض اور چیزوں کی محبت نے لے لی - بحث میں انتشار پیدا ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ لکھنے والوں نے ''نیشنلزم'' کا لفظ استعمال کیا جو کہیں قومیت کے معنی

---

* اقبالیات کا تنقیدی جائزہ : کراچی ، نقشِ ثانی ، جون ۱۹۶۵ء ، ص ۶۵ -

** ایضاً ، ص ۱۴۱ - ۱۴۲ -

دیتا ہے اور کہیں وطنیت کے - لیکن اقبال کے کلام کو غور سے پڑھا جائے تو اُن کے تصورات کے متعلق صحیح رائے قائم کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی -

اس موضوع پر پچھلے چند برس میں جس تحقیقی انداز میں بحث کی گئی ہے ، اُس کا تجزیہ کرنے سے پہلے ہم اُن خیالات پر بھی ایک نظر ڈال لیں جو اس سلسلے میں اُن کی زندگی میں ظاہر کیے گئے تو ایک سیدھی سادی لیکن واضح تصویر بنانے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی - مختلف مضامین میں* اس ضمن میں جو کچھ کہا گیا ہے اُس کا خلاصہ کیا جائے تو کچھ باتیں واضح طور پر ہمارے سامنے آتی ہیں :

''اقبال یورپ جانے سے پہلے ہندوستان میں وطنیت کے غلغلوں سے بہت متأثر تھا -[۱] (انھوں نے) جب یورپ کا سفر اختیار کیا تو اُسے معلوم ہوا کہ نیشنلزم نے اقوامِ خدا کو بے شمار اقوام میں تقسیم کر دیا ہے -[۲] اقبال نیشنلزم کی مخالفت اس لیے نہیں کرتے کہ اُنھیں آزادی پسند نہیں یا وہ غلامی کو محبوب سمجھتے ہیں -[۳] وہ نیشنلزم کے ہر اُس تصور کا

---

*ایسے اہم مضامین کے لیے جو اقبال کی زندگی میں لکھے گئے رجوع کیجیے : ''اقبال معاصرین کی نظر میں'' مرتبہ : سید وقار عظیم مطبوعہ : مجلسِ ترقیِ ادب ، لاہور ، دسمبر ۱۹۷۳ء ، صفحات : ۵۴۳ -

۱ - سید زبیر : اقبال اور سیاستِ عالیہ ، مشمولہ : اقبال معاصرین کی نظر میں ، ص ۴۳ -

۲ - ایضاً ، ص ۵۰ -

۳ - ڈاکٹر سید عبداللہ : اقبال اور سیاسیات ، مشمولہ : اقبال معاصرین کی نظر میں ، ص ۱۴۲ -

شدید مخالف ہے جس کا معیار وطن، رنگ، نسل اور زبان ہو۔[۴] اور اس کے نزدیک دورِ جدید کی اکثر لڑائیوں کا اصلی سبب نیشنلزم ہی ہے۔[۵] اقبال وطنیت اور ملت اسلامی کی جغرافیائی حد بندی کا دشمن ہے۔[۶] اس لیے کہ ملتِ اسلامیہ کے لیے ''وطنیت'' کا ماکیافیلی تصور کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔[۷] وہ وطن پرستی اور قوم پرستی کا سخت مخالف ہے، لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں کہ وہ حبِ وطن کا بھی مخالف ہے۔''[۸]

اقبال کے انتقال کے بعد آن کے فلسفۂ حیات کے مختلف پہلوؤں کے متعلق جو بحثیں کی گئیں، آن کا خلاصہ بھی یہی ہے کہ اقبال ''وطنیت'' کے آس سیاسی تصور کے خلاف ہیں جسے اہلِ مغرب نے اختیار کیا اور اپنے مخصوص سیاسی مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنایا۔ اس اختلاف کو وطن کی محبت کی مخالفت سمجھنا درست نہیں۔ اس موضوع پر بحث کرنے والوں نے کبھی تو محض کلامِ اقبال کے حوالے سے اور کبھی نثر اور نظم دونوں میں کہی ہوئی باتوں کو یک جا کر کے آن سے منطقی استدلال کیا ہے۔ پھر یہ بھی ہوا ہے کہ بحث میں کبھی اقبال کے پورے نظامِ فکر کو استدلال کی بنیاد

---

۴ - ایضاً، ص ۱۴۳ -

۵ - ایضاً، ص ۱۴۳ -

۶ - قاضی عبدالغفار: پیامِ اقبال، مشمولہ: اقبال معاصرین کی نظر میں، ص ۶۴ -

۷ - ممتاز حسن: اقبال ایک پیغمبر کی حیثیت سے، مشمولہ: اقبال معاصرین کی نظر میں، ص ۳۴ -

۸ - راغب احسن: اقبال پر ایک محققانہ نظر، مشمولہ: اقبال معاصرین کی نظر میں، ص ۹۲ -

بنایا گیا ہے اور کبھی اس نظامِ فکر کے کسی ایک پہلو کو اساس بنا کر نتائج اخذ کیے گئے ہیں - یہ بحث مختلف تصانیف میں جو جو صورتیں اختیار کرتی رہی ہے ، اس کا اندازہ ذیل کی کتابوں کے مطالعے سے ہو سکتا ہے :

۱ - تصوراتِ اقبال از : صلاح الدین احمد

۲ - مسائلِ اقبال از : ڈاکٹر سید عبداللہ

۳ - اقبال ، نئی تشکیل ، از : عزیز احمد

۴ - حکمتِ اقبال ، از محمد رفیع الدین

نیز انگریزی کی کتاب: Iqbal, Poet Philosopher of Pakistan
مرتبہ : حفیظ ملک -

''تصوراتِ اقبال'' میں اس موضوع پر جو کچھ لکھا گیا ہے، اس کا عنوان ہے ''فکرِ اقبال میں وطن و ملت کی کشمکش''—— لیکن مضمون نگار نے اس کشمکش کا جائزہ لیتے ہوئے صرف اقبال کی اردو شاعری کو پیشِ نظر رکھا ہے اور اپنی بات یہ کہہ کر شروع کی ہے کہ :

''ہم اقبال کی ابتدائی شاعری کا جائزہ لیتے ہیں تو قدرت اور عورت کے حسن کی پرستش کے بعد جو جذبہ ہمیں سب سے زیادہ نمایاں نظر آتا ہے وہ وطن کی پرستش ہے اور . . . . شاعر کی جبلت میں اس جذبے کی تخلیق اور فروغ دونوں ایک فطری اور وہبی حیثیت رکھتے ہیں . . . . وطن کی محبت کا فروغ اور ارتقا اس کی شاعری میں انہی خطوط کے متوازی ہوا جن خطوط پر اس کے اظہارِ محبت کی قوت اور محسوسات کی شدت بڑھتی چلی گئی اور حبِ وطن کا انداز بھی اسی نسبت

سے وسعت و جمال حاصل کرتا چلا گیا ، جس نسبت سے اُس کے احساس کا اُفق پھیلتا اور رنگین تر ہوتا چلا گیا[۹] . . . . اقبال کا عالمگیر جذبۂ محبت ہے جس نے پہلے وطن اور بعد میں ملت کے عشق کی صورت اختیار کی ۔ از بسکہ عشق ہی وہ قدرِ مطلق ہے جسے شاعر کے نظامِ فکر و احساس میں اولین عنصر کی حیثیت حاصل ہے[۱۰] . . . . اس رجحان کی انتہا یہ ہے کہ جب شاعر وطن کی محدود فضا سے کائنات کی غیر محدود فضا کی طرف بڑھتا ہے اور اس کے ضمیر میں ملت کے جمیل تر تصور کی تشکیل ہوتی ہے ، اُس وقت وہ عشق ہی کے بازوئے ہمت کا سہارا لیتا ہے[۱۱] . . . . اقبال وطنیت اور قومیت کے مغربی تصورات سے اس درجہ خائف اور متنفر ہوا کہ اُس کی شاعری کا دھارا دیکھتے ہی دیکھتے وطن اور قوم کی تنگنائے سے نکل کر ملت کی وسعتوں میں رواں اور آفاق کی پہنائیوں میں گم ہوگیا''۔[۱۲]

جو بات ''تصوراتِ اقبال'' کے مصنف نے عشق کے حوالے سے کہی ہے وہ ''حکمتِ اقبال'' کے مصنف کے یہاں خودی کے حوالے سے آتی ہے ۔ ''حکمتِ اقبال'' میں ایک باب ''خودی اور فلسفۂ سیاست''[۱۳] کے عنوان سے قائم کیا گیا ہے ۔ اس باب میں پہلے ''ریاست'' کی منطقی تعریف کی گئی ہے اور فرد و جماعت کے باہمی رشتے کے مختلف پہلوؤں کو زیرِ بحث لاتے ہوئے وطنیت کا مفہوم

---

۹ ۔ صلاح الدین احمد : تصوراتِ اقبال ، ص ۲۳۹ ۔ ۲۴۰ ۔
۱۰ ۔ ایضاً ، ص ۲۴۳ ۔
۱۱ ۔ ایضاً ، ص ۲۴۴ ۔
۱۲ ۔ ایضاً ، ص ۲۴۸ ۔ ۲۴۹ ۔
۱۳ ۔ محمد رفیع الدین : حکمت اقبال ، ۳۲۵ تا ۳۷۶ ۔

واضح کیا گیا ہے - اس سلسلے میں اقبال کے کلام کی روشنی میں اُن کے نظریۂ وطنیت پر روشنی ڈالی گئی ہے - اس ضمن میں بحث کو جو مربوط صورت دی گئی ہے ، اُس کا خلاصہ کیا جائے تو اُس کی شکل کم و بیش یہ ہوگی :

''نظریۂ وطنیت کی بنیاد یہ عقیدہ ہے کہ سیاست کو مذہب سے الگ رہنا چاہیے - اقبال اس دور کا پہلا مفکر ہے جس نے مذہب اور سیاست کی دوئی کی مخالفت کی ہے اور اس کے نقصانات واضح کر کے اُس کی نامعقولیت کا پردہ چاک کیا ہے - اُنھوں نے اس اعتبار سے دوئی کے اصول کو خطرناک قرار دیا ہے کہ یہ انسان کے قومی اور بین الاقوامی اخلاق کو بگاڑتی ہے اور انسانیت کی وحدت کو پارہ پارہ کر کے تباہ کن بین الاقوامی جنگوں کا باعث بنتی ہے -[۱۴] نظریۂ وطنیت کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ وہ ایک ایسے ملک کی والہانہ محبت پر زور دیتی ہے جس میں ایک زبان بولنے والے اور ایک خاص نسل اور رنگ رکھنے والے لوگ بستے ہیں ، جنھیں صرف اپنا مفاد عزیز ہوتا ہے ، اس لیے وطنیت پرست قومیں اپنے مفاد کے حصول کے لیے دوسری قوموں کے مفاد کو پامال کرتی اور جنگ و جدل کا راستہ اختیار کرتی ہیں - یہ قومیں کسی ضابطۂ اخلاق کی پابند نہیں ہوتیں -[۱۵] اقبال پر اس نظریۂ وطنیت کے خوفناک نتائج واضح ہوگئے تھے اس لیے اُن کے نظامِ فکر میں اس تصور کے لیے کوئی جگہ نہیں -[۱۶]

---

۱۴ - ایضاً ، ص ۳۶۰ -
۱۵ - ایضاً ، ص ۳۶۴ -
۱۶ - ایضاً ، ص ۳۶۵ -

لادینی قومی یا وطنی ریاست میں رہ کر مسلمان خدا کی رضا جوئی کی زندگی بسر نہیں کر سکتا ۔'' قومیت کا اسلامی تصور اس لحاظ سے اصولی طور پر مختلف ہے کہ اس کا اصل اصول نہ اشتراک زبان ہے نہ اشتراک وطن نہ اشتراک اغراض اقتصادی ۔ بلکہ ہم لوگ اس برادری میں جو جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے قائم فرمائی تھی اس لیے شریک ہیں کہ مظاہر کائنات کے متعلق ہم سب کے معتقدات کا سرچشمہ قرآن حکیم ہے''۔[۱۸]

---

۱۷ - ایضاً ، ص ۳۶۶ -
۱۸ - ایضاً ص ۲۶۸ -

اقبال اور اشتراکیت

''اقبال کا نظریۂ ادب جس کو ترقی پسند اپنا ورثہ بتاتے ہیں، دراصل ''تجدید مذہب اور احیائیت'' ہی کی بنیاد پر قائم ہے۔ اس کو اشتراکیت، آزاد خیالی اور مطلق العنانی سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ اقبال کے نزدیک ہر وہ ادب قابل اعتنا نہیں ہے جو آزاد خیالی، مذہب سے بیگانگی اور اخلاقی قدروں سے روگردانی کا حامل ہو۔''*

—قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی

اشتراکیت اور مارکسیت کے سلسلے میں اقبال کا جو رویہ تھا، اس کا ذکر نقادوں نے ان کی زندگی ہی میں کرنا شروع کر دیا تھا۔ ''اقبالیات کا تنقیدی جائزہ'' (قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی) کی طبع اول اور نقش ثانی** میں ایسی تحریروں کا حوالہ نہیں، جو بظاہر ضروری ہے۔ (رسالہ) ''نیرنگ خیال'' (لاہور) کے ''اقبال نمبر'' (مطبوعہ ۱۹۳۲ء) کے دو حوالے اس جگہ بر محل ہوں گے:

''وسعت تصور اور ہمہ گیری کے لحاظ سے اسے (اقبال کو) انٹرنیشنلزم اور سوشلزم سے ضرور دلچسپی ہے، کیونکہ اس کے نزدیک ان دونوں چیزوں سے اسلام کو کوئی زیادہ

---

* اقبالیات کا تنقیدی جائزہ، کراچی، نقش ثانی جون ۱۹۶۵ء، صفحہ ۶۰، ۶۱۔

** طبع اول: ۱۹۵۵ء، نقش ثانی: جون ۱۹۶۵ء

بعد نہیں" ۔[۱]

''سوشلزم کے متعلق اقبال کا رویہ ہمدردانہ ہے ۔ اس نے اپنے بے شمار اشعار میں مزدوروں کی حالتِ زار اور سرمایہ داروں کے مظالم کا تذکرہ کیا ہے'' ۔[۲]

''اقبال ابھی سوشلزم کا مطالعہ کر رہا ہے اور ابھی تک اس کے متعلق کوئی ناطق رائے نہیں پیش کی ، البتہ امید ہے کہ اپنی نئی تصنیف ''جاوید نامہ'' میں ان تمام مسائل پر سیر حاصل بحث کرے گا ۔ جہاں تک سرمائے اور محنت کا تعلق ہے اس کے عقائد بالکل واضح ہیں''۔[۳]

''آئندہ انقلابات سیاسی کے متعلق اقبال نے جو پیش گوئیاں کی ہیں ، ان میں بھی محنت کی فتوحات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے''۔[۴]

اسی شمارے (نیرنگِ خیال ، لاہور ، اقبال نمبر ۱۹۳۲ء) کے ایک اور مضمون میں ''سوشلزم اور سرمایہ داری'' کے عنوان کے تحت اقبال کے رجحانات کی وضاحت یہ کہہ کر کی گئی ہے کہ اقبال نے ''مزدور کی محکومی اور مجبوری کا اظہار اس بلیغ پیرائے میں کیا ہے کہ ایک شخص بادی النظر میں اقبال کو سوشلسٹ سمجھنے لگتا ہے''۔[۵] حالانکہ بعض باتوں میں ان سے اتحادِ خیال

---

۱ - سید زبیر : اقبال اور سیاست عالیہ ، مشمولہ : اقبال معاصرین کی نظر میں مرتبہ : پروفیسر سید وقار عظیم ، صفحہ ۵۲ ۔
۲ - ایضاً ، ص ۵۴ ۔
۳ - ایضاً ، ص ۵۵ ۔
۴ - ایضاً ، ص ۵۶ ۔
۵ - ڈاکٹر سید عبداللہ : اقبال اور سیاسیات ، مشمولہ : اقبال معاصرین کی نظر میں ، ۱۴۴ ، ۱۴۵ ۔

رکھتے ہوئے بھی ، وہ یہ رائے رکھتے ہیں کہ روس کی تہذیب لاکھ مدح کے قابل سہی لیکن چونکہ اس میں ''ذکرِ حق'' کی کمی ہے ، اس لیے اس سے احتراز لازم ہے ۔[۶] اقبال سوشلزم کو بھی روحانیت کے بغیر ناقص خیال کرتے ہیں'' ۔[۷]

۱۹۳۱ء کے لکھے ہوئے ایک مضمون میں سرعبدالقادر نے رائے ظاہر کی کہ اقبال نے ''کارل مارکس کے نظریات کا مطالعہ کیا تھا اور اس سے خاصے متأثر ہوئے تھے ۔ ان کی بہت سی نظمیں ہیں جن میں مزدور اور کسان کی زبوں حالی پر ہمدردی اور سرمایہ دار کے خلاف غم و غصے کا اظہار کیا گیا ہے ۔[۸] لیکن اس موضوع پر تفصیل سے بحث کرنے والی پہلی کتاب عزیز احمد کی ''اقبال--نئی تشکیل'' ہے ۔ اس کتاب کے مختلف حصوں میں کسی قدر سرسری انداز میں اقبال اور اشتراکیت کے تعلق سے بعض ایسی باتیں کہہ دی گئی ہیں جن میں ابہام بھی ہے اور جن کی کوئی منطقی اساس نہیں مثلاً :

''بنیادی طور پر اسلام کی تعلیم بھی تقریباً وہی ہے جو مارکسی نظریوں کی ہے''۔[۹]

''طلوعِ اسلام ، دراصل اشتراکی اسلام کا طلوع ہے''۔[۱۰]

البتہ کتاب کا ایک حصہ ایسا ہے جس میں اشتراکیت اور

---

۶ - ایضاً ، ص ۱۴۶ -

۷ - ایضاً ، ص ۱۴۶ -

۸ - Sir Muhammad Iqbal - The Great Poet of Islam, Included in : 'Great Men of India", 1939.

۹ - عزیز احمد : اقبال--نئی تشکیل ، ص ۱۸ -

۱۰ ایضاً ، ص ۱۸۶ -

اشتمالیت کے بنیادی تصورات کی وضاحت کرتے ہوئے اقبال کے کلام میں عہد بہ عہد اُن تصورات کے عکس اور اثر کی نشاندہی کی گئی ہے اور اُن اختلافات کے حوالے سے جو اقبال کو کارل مارکس کے نظریات سے ہیں ، اقبال کے تصورات کے لیے اسلامی اشتراکیت کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے ۔ کتاب کے ساٹھ پینسٹھ صفحوں" میں اس موضوع پر جو باتیں کہی گئی ہیں ان کا خلاصہ کیا جائے تو کم و بیش اس کی صورت یہ ہوگی :

معاشی سطح پر اقبال ، کارل مارکس کی اشتمالیت کے بنیادی تصورات کو قریب قریب ، پوری طرح مانتے ہیں ۔ کارل مارکس سے ان کے اختلافات دو ہیں ۔ ایک تو وہ بحیثیت فلسفہ ، مادی جدلیت کو رد کرتے ہیں ۔ دوسرے یہ کہ تاریخ کے معاشی تطبیق کے بعض اصول سے انھیں اتفاق نہیں ۔[۱۲] ''پیامِ مشرق'' کے دور میں اُن پر اشتمالی تصورات کا اثر کافی گہرا ہو چکا ہے ۔[۱۳] ''محبت رفتگاں'' میں کئی قسم کے اشتراکی جمع ہیں جن میں سے ایک عینی اور اٹوپائی اشتراکیت کا اہم ترین مشرقی نمائندہ مزدک ہے جس کی ایران سے اقبال نے کوہ کن کو اپنا عینی مسلک ترک کرکے پرویز سے اپنا حق طلب کرنے کی دعوت دی ہے ۔[۱۴] اٹوپیائی اشتراکیت سے اقبال کو اس لیے دلچسپی ہے کہ اس میں بعض اہم رومانی اور عینی تصورات ملتے ہیں جن کے رد کرنے میں اقبال کو لطف محسوس ہوتا ہے ۔

---

۱۱ - ایضاً ، ص ۴۸۱-۵۴۶ -
۱۲ - ایضاً ، ص ۴۸۱ -
۱۳ - ایضاً ص ۴۸۱ -
۱۴ - ایضاً ، ص ۴۸۳ -

اٹوپیائی اشتراکیت میں جن حکماء کی طرف اقبال توجہ کرتے ہیں ، وہ یورپ کے آن اشتراکیئین سے بالکل مختلف ہیں[۱۵] جنھوں نے یورپ وغیرہ میں جدید اشتمالیت سے پہلے اشتراکی تجربے کیے - اٹوپیائی اشتراکیت پر اقبال کی تنقید اینگلز کی تنقید سے باعتبارِ موضوع اور نتائج بہت مختلف ہے - جرمن فلسفی ہیگل نے تاریخ انسانی کو ایک ارتقائی عمل کہہ کر تاریخ کے جس جدلیاتی نظریے کو رواج دیا ، آس نے عینی فلسفے پر کاری ضرب لگائی اور آس کا رخ مادیت کی طرف پھیر دیا -[۱۶] یہی وہ مقام ہے جہاں اقبال نے اشتمالیت سے اپنے اختلاف کی بنیاد رکھی ہے - انھیں مارکس کے معاشی نظریوں سے پورا اتفاق ہے ، مگر ہیگل کے جدلیاتی نظام سے اتفاق نہیں ، جس نے مارکس کی معاشیات کو فلسفیانہ طور پر جنم دیا ہے -[۱۷]

''پیام مشرق'' کے دور میں اقبال کا اشتراکی شعور زیادہ تر فلسفے کے مختلف نظاموں سے الجھا ہوا ہے - وہ اگرچہ ہیگل کی جدلیت پر بے روح اور بے احساس عقلیت کا الزام عائد کرتے ہیں ، لیکن وہ کسی ایسے فلسفے کے سرمایہ دار محرک کو ایک لمحے کے لیے بھی برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں جو مارکس کی اشتراکیت کے ماحصل یعنی مزدور کی بیداری اور آس کے انقلابی شعور کو پھر سے خواب اور افیون میں تبدیل کرنا چاہے -[۱۸] چنانچہ اقبال نے ثبوتیت کے فلسفے کے سرمایہدار محرک کومٹ کو بڑی

---

۱۵ - ایضاً ، ص ۴۸۴ -
۱۶ - ایضاً ، ص ۴۸۶ -
۱۷ - ایضاً ، ص ۴۸۷ -
۱۸ - ایضاً ، ص ۴۸۹ -

خوبی سے بے نقاب کیا ہے ۔[۱۹]

اسی دور میں اقبال کی کئی فارسی نظموں اور بعض فارسی اور اردو کی غزلوں کا موضوع ہی محنت و سرمایہ کی کشمکش اور انقلاب ہے ۔ کہنہ نظام کو مٹانا اور اس کی جگہ نئے نظامِ انسانیت کی تعمیر نہ صرف ضروری ہے بلکہ قانون قدرت کا یہی تقاضا ہے ۔ قیامت موجودہ انسان کا اپنا حرکی عمل ہے جس کا کام فرسودہ بنیادوں کو ڈھانا اور نئی بنیادیں قائم کرنا ہے ۔[۲۰] مذہب میں بھی انقلاب کی ضرورت ہے ۔[۲۱]

اشتمالیت کے جدید رہنماؤں سے اقبال کو بڑی دلچسپی تھی ۔ کارل مارکس کے معاشی تجزیے سے وہ بالکل متفق تھے ۔ لیکن مادی جدلیات اور تاریخ کی معاشی تطبیق سے انھیں اختلاف تھا ۔[۲۲]

روسی اشتمالیت اور اسلام کا تقابل کرتے ہوئے عزیز احمد نے لکھا ہے کہ احترامِ انسانیت اگر کسی جدید تصورِ سیاست میں ملتا ہے تو صرف اشتمالیت میں ۔ اقبال ، اسلام اور اشتراکیت میں بہت سی اساسی قدریں مشترک سمجھتے ہیں ۔ اصل فرق لا اور الا کے مقامات کا ہے ۔[۲۳] اشتمالیت اور اقبال کی اسلامی اشتراکیت میں معاشی نظام کا تصور یکساں ہے ۔ مگر ساتھ ساتھ بعض بڑے اہم اور بنیادی اختلافات ہیں ۔[۲۴] ان بنیادی اختلافات کی نشاندہی کے لیے

---

۱۹ ۔ ایضاً ، ص ۴۸۹ ۔
۲۰ ۔ ایضاً ، ص ۴۹۳ ۔
۲۱ ۔ ایضاً ، ص ۴۹۸ ۔
۲۲ ۔ ایضاً ، ص ۴۹۹ ۔
۲۳ ۔ ایضاً ، ص ۵۰۸ ۔
۲۴ ۔ ایضاً ، ص ۵۱۷ ۔

مولانا حفظ الرحمان سیہواروی کی کتاب ''اسلام کا اقتصادی نظام'' کے حوالے سے عزیز احمد نے ''اسلامی اشتراکیت'' کے تصورات کی وضاحت کرکے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اقبال کے کلام میں اور آن کے خطبات میں جس ''اسلامی اشتراکیت'' کے تصورات نظم کیے گئے ہیں یا زیر بحث لائے گئے ہیں، وہ بہت سی باتوں میں روسی اشتمالیت کی نفی و تردید کرتے ہیں۔[۲۵]

خلیفہ عبدالحکیم نے اشتراکیت کے متعلق اقبال کے خیالات کا ذکر اور تجزیہ دو حیثیتوں سے کیا ہے۔ ''فکر اقبال'' کے ایک باب کا عنوان ہے ''مغربی تہذیب و تمدن پر علامہ اقبال کی تنقید''[۲۶] اس باب میں مغربی تہذیب کے مختلف پہلوؤں کے ذکر کے ساتھ جا بجا اشتراکیت کا اور اس ضمن میں اقبال کے خیالات کا تذکرہ آ گیا ہے۔ مثلاً :

''اشتراکیت نے مغربی تہذیب و تمدن کے خلاف جو بغاوت کی اس کے وجوہ زیادہ تر وہی ہیں جن سے اقبال بھی متفق ہیں''۔[۲۷]

''مغربی مادیت اور حاضر پرستی کی معراج روسی اشتراکیت میں نظر آتی ہے۔ لیکن اقبال اس کا بھی مداح ہے کہ اس نے سلبی کام اچھا کیا ہے اور اس نے کلیسا و سرمایہ داری اور امتیازِ رنگ و نسل اور تفوقِ طبقات کے بہت سے جھوٹے معبودوں کا قلع قمع کر دیا ہے''۔[۲۸]

---

۲۵ - ایضاً، ص ۵۲۹—۵۴۶ -
۲۶ - خلیفہ عبدالحکیم، فکر اقبال، ص ۱۹۳—۲۴۰ -
۲۷ - ایضاً، ص ۲۰۹ -
۲۸ - ایضاً، ص ۲۱۸ -

کتاب کا ایک اور باب ''اشتراکیت''[۲۹] البتہ اس موضوع پر مفصل فاضلانہ تبصرہ ہے - خلیفہ صاحب نے آن گوناگوں فکری میلانات کا تجزیہ کر کے جن میں اشتراکی نظریات نے جنم لیا، اقبال کے سلسلے میں یہ کہا ہے کہ :

''اقبال نے جب مذہب و تہذیب کے تمام مسائل کو اپنا موضوعِ سخن بنایا تو لازم تھا کہ اشتراکیت کے نظری اور عملی پہلوؤں پر غور کر کے اپنے نتائجِ فکری سے ملت کو آگاہ کرے - سب سے پہلے ''پیامِ مشرق'' میں اس کے متعلق رائے زنی شروع کی -''[۳۰]

''پیامِ مشرق'' کی نظموں کا تجزیہ کر کے خلیفہ صاحب نے بڑے واضح انداز میں یہ بات دکھائی ہے کہ اقبال ہر حال میں محنت کش کے وکیل اور سرمایہ و مزدور کی کشمکش میں مزدور کے حامی اور ہم‌نوا ہیں اور آسے طلبِ حق کی راہ پر گامزن ہونے کی دعوت دیتے ہیں -

زمین کی ملکیت کا مسئلہ استحصال کی بدترین صورت ہے - ہر قسم کے سوشلسٹ اور کمیونسٹ اس معاملے میں ہم خیال ہیں - اقبال ''جسے مسلم سوشلسٹ کہنا چاہیے ، ہر قسم کی سوشلزم اور کمیونزم سے اس مسئلے پر اتفاق رکھتا ہے کہ زمین خدا کی پیدا کی ہوئی ہے اور اس کی حیثیت ہوا اور پانی کی سی ہے جس پر کسی کی کوئی شخصی ملکیت نہیں -''[۳۱] اقبال اشتراکیت کے تمام معاشی پہلوؤں سے اتفاقِ رائے رکھتے تھے، سوا اس کے کہ اس تمام تنظیمِ جدید

---

۲۹ - ایضاً ، آٹھواں باب : صفحات ۲۴۱ - ۳۰۰ -
۳۰ - ایضاً ، ص ۲۴۷ -
۳۱ - ایضاً ، ص ۲۵۵ -

نے انسان کے دل و دماغ پر یہ غلط عقیدہ مسلط کر دیا ہے کہ تمام زندگی مادی اسباب کی عادلانہ یا مساویانہ تقسیم سے فروغ اور ترقی کر سکتی ہے۔

علامہ اقبال انسانی زندگی کامقصودجسمانی ترقی نہیں بلکہ روحانی ترقی سمجھتے تھے۔[۳۲] جس قسم کا انقلاب روس میں ہوا، اُس سے ملتا جلتا انقلاب اقبال ملتِ اسلامیہ میں بھی دیکھنا چاہتے تھے، لیکن اس کا محرک اسلام ہونا چاہیے نہ کہ الحاد۔[۳۳] عام مغربی تہذیب کے ساتھ اقبال کو اسلام کا اتصال مشکل معلوم ہوتا ہے لیکن زاویۂ نگاہ کی ذرا سی تبدیلی سے اشتراکیت اسلام بن سکتی ہے یا اسلام اشتراکی ہو سکتا* ہے۔[۳۴] اقبال کے نزدیک اشتراکیت میں حق و باطل کی آمیزش ہے۔[۳۵] اسلام کے انقلاب کے بعد روسی اشتراکیت تک مشرق میں کوئی ایسی حرکت پیدا نہ ہوئی جسے انقلابی کہہ سکیں، لیکن اشتراکیت کا لایا ہوا انقلاب ادھورا ہے، اس کی تکمیل صرف اسلام کر سکتا ہے۔[۳۶]

اقبال اور اشتراکیت کے تعلق کے سلسلے میں بنیادی نکتہ یہی ہے کہ اشتراکیت انقلاب آفرین ہے لیکن اس کی تکمیل اسلام کے تصورات کو شامل کیے بغیر ممکن نہیں۔ اس بنیادی نکتے میں ایک اور بات کا اضافہ بعض ناقدین نے خالصتاً پاکستانی نقطۂ نظر

۳۲۔ ایضاً، ص ۲۵۸۔

۳۳۔ ایضاً، ص ۲۶۱۔

*خلیفہ صاحب کی عبارت کا دوسرا ٹکڑا اقبال کے خیالات اور عقائد کا جزو نہیں، یہ غالباً انشا پردازی کی رو میں لکھا گیا ہے۔ [و۔ع]

۳۴۔ خلیفہ عبدالحکیم: فکرِ اقبال، ص ۲۶۳۔

۳۵۔ ایضاً، ص ۲۶۸۔

۳۶۔ ایضاً، ص ۲۷۱۔۲۷۸۔

سے کیا ہے ۔ ''حیات اقبال کا ایک جذباتی دور'' کے مصنف محمد عثمان صاحب نے ''اقبال اور روس''[۳۷] کے عنوان کے تحت جن پانچ باتوں پر زور دیا ہے اور جن کی تائید میں کلامِ اقبال کی موزوں مثالیں بھی پیش کی ہیں ، وہ یہ ہیں :

اول : ۱۹۱۷ء کے روسی انقلاب کا اقبال نے ایک خاص جوش و خروش اور شاعرانہ خلوص کے ساتھ خیر مقدم کیا تھا ۔

دوم : انقلاب کے بعد سے اور شاید اس کی بدولت اقبال کے معاشی شعور میں مزید گہرائی اور نظر پیدا ہوئی اور آنھوں نے بندۂ مزدور کے تلخ اوقات اور سرمایہ و محنت کی آویزش پر کھل کر زیادہ صحت کے ساتھ لکھا ،

سوم : کارل مارکس ، لینن اور اشتراکی تحریک کے بارے میں اقبال نے ایک منفرد اندازِ نظر اختیار کیا جو ہمدردی اور اختلاف کا بے مثل امتزاج تھا ،

چہارم : عالمِ اسلام اور روس کے جغرافیائی قرب و تعلق کی بنا پر اقبال کا ذہن بار بار روس کی طرف جاتا رہا اور مستقبل کے ہر خاکے میں انھوں نے اسلامی دنیا بالخصوص اسلامی ہند اور روس کے باہمی تعلق کو ملحوظ و مدِ نظر رکھا اور :

پنجم : یہ کہ روس اور اشتراکیت کی طرف اقبال کا نقطۂ نظر پاکستان کا نہایت قیمتی[۳۸] ورثہ ہے جس سے ہمیں فائدہ آٹھانا چاہیے ۔

---

۳۷ - محمد عثمان : حیاتِ اقبال کا ایک جذباتی دور ، ص ۱۵۹ - ۱۷۸ ۔
۳۸ - ایضاً ، ص ۱۵۹ ۔

عزیز احمد ، خلیفہ عبدالحکیم اور محمد عثمان ، شعر اقبال کے مبصر بھی ہیں اور ان کے افکار کے مفسر بھی ، اس فرق کے باوجود کہ ان تینوں مبصرین یا مفسرین کا لہجہ ایک دوسرے سے مختلف ہے اور مطالب کے بیان میں آن کی تاکیدوں میں بھی جا بجا نمایاں اختلاف ہے ، تینوں اس بات پر متفق ہیں کہ اشتراکیت انقلاب کی داعی ہونے کے باوجود اس لیے انسان کی صحیح رہنمائی نہیں کر سکتی کہ آس کی بنیاد لادینی پر ہے -

پاکستان کی زندگی کے پچھلے چند سال ہمارے لیے اس لحاظ سے بہت اہمیت رکھتے ہیں کہ ہم ان میں مختلف سطحوں پر اپنے معاشی منصوبوں کی تنظیم میں مصروف رہے ہیں اور یہ عمل اب بھی جاری ہے - ظاہر ہے کہ اس طرح کی قومی منصوبہ بندی کے لیے کسی نہ کسی فکری اساس کی موجودگی ضروری ہے - اس اساس کے لیے ہمیں سب سے پہلے قرآنِ حکیم کی طرف توجہ کرنی چاہیے تھی ، لیکن اس کے لیے بھی ایک باقاعدہ منصوبہ بندی لازمی تھی- اس منصوبہ بندی کی عدم موجودگی میں ہماری نظر اقبال کی طرف گئی جن کی نثری اور شعری تخلیقات میں جا بجا ایسے اشارے موجود تھے جن سے معاشرتی اور معاشی مسائل کی منصوبہ بندی میں رہنمائی حاصل کرنے کی توقع کی جا سکتی تھی - اسی توقع کی بنا پر ہم نے اشتراکیت کے متعلق اقبال کے تصورات کا جائزہ لیا اور اپنے معاشی مسائل کے حوالے سے ان پر بحث و تمحیص شروع کی -

علمی سطح پر اس طرح کی کوشش کا اظہار ''اقبال اور سوشلزم''* نام کی کتاب کی صورت میں ہوا - کتاب میں ''اقبال اور

---

*مرتبہ : محمد حنیف رامے ، مطبوعہ : لاہور جنوری ۱۹۷۰ء ، صفحات ۲۰۶ -

اشتراکیت" کے موضوع پر چھ مقالات شامل ہیں جن میں سے تین کے عنوان ہیں :

۱ - اقبال اور روس (محمد عثمان)

۲ - اقبال اور اشتراکیت (خلیفہ عبدالحکیم)

۳ - اقبال اور اسلامی اشتراکیت (عزیز احمد)

یہ تینوں مضمون وہی ہیں جنھیں ابھی زیر بحث لایا جا چکا ہے - باقی تین مضامین کے عنوانات ہیں :

۱ - اقبال اور اشتراکیت (محمد ذاکر)

۲ - اقبال اور سوشلزم—مودودیت کے حوالے سے
(محمد صفدر میر)

۳ - اقبال اور سوشلزم—اقتصادی ترقی کے حوالے سے
(محمد حنیف رامے)

کتاب کی ترتیب کا مقصد یہ ہے کہ اقبال نے سوشلزم کے تجربے سے جو دلچسپی لی تھی اور اس کے امکانات کی طرف جو اشارے کیے تھے اُن سے "اُمت مسلمہ" کو آگاہ کیا جائے -

ظاہر ہے کہ اس مقصد سے کسی کو اختلاف نہیں ہوگا اور اس میں شبہ نہیں کتاب کے کئی مضامین کلامِ اقبال کے حوالے سے یہ بات پڑھنے والوں کے ذہن تک پہنچانے میں کامیاب بھی ہوئے ہیں ، لیکن مجموعے کے ایک مضمون کے مناظرانہ لہجے سے مجموعے کی علمی حیثیت متأثر ہوتی ہے اور باقی مضامین میں بھی کہیں اپنے نقطۂ نظر کی تائید میں اور کہیں محض جوشِ بیان کی بدولت بعض اوقات ایسے جملے آ گئے ہیں جن سے پڑھنے والوں کے

عقائد کو ٹھیس لگتی ہے اور نیک نیتی سے کہی ہوئی بات بھی شدید غلط فہمی کا سبب بن جاتی ہے - اس جگہ صرف دو مثالوں کی طرف اشارہ کافی ہے - کتاب ''اقبال اور سوشلزم'' کے آخری مضمون* کے پہلے ہی صفحے پر ملک برکت علی کا یہ جملہ حوالے کے طور پر پیش کیا گیا ہے :

''اقبال فوت ہو گئے - وہ فنا فی الاسلام اور پکے سوشلسٹ تھے -''[۳۹]

ایک اور مثال خلیفہ عبدالحکیم کے مضمون کی ہے ، جہاں ایک خاص موضوع پر بحث کرتے کرتے انہوں نے لکھ دیا کہ :

''اقبال ، جسے مسلم سوشلسٹ کہنا چاہیے . . . .''[۴۰]

اس کے باوجود کہ مضمون میں آگے چل کر ''پکے سوشلسٹ'' کی جو تشریح کی گئی ہے ، وہ ہر طرح کی غلط فہمی رفع کرنے کے لیے کافی ہے ، عبارت کے ایک ٹکڑے کو اس کے سیاق سے علیحدہ کر کے اس میں ہر طرح کی تاویل کی گنجائش نکالنے کا امکان موجود ہوتا ہے - اس مخصوص مثال سے قطع نظر ہمارے بعض مارکسی نقادوں کی تحریروں کے بعض جملے بھی اس اشتباہ کو تقویت دینے کا باعث ہوئے کہ اقبال کے بعض معاشی تصورات کی بنا پر انہیں ''مارکسی'' ــ ''اشتراکی'' یا ''سوشلسٹ'' مشہور کیا جا رہا ہے -

خلیفہ صاحب نے نہیں جس موقع پر یہ جملہ استعمال کیا ہے اس کے آگے پیچھے کی عبارت کو پڑھا جائے تو صاف ظاہر ہو جاتا

---

*''اقبال اور سوشلزم ــ اقتصادی ترقی کے حوالے سے''
از : محمد حنیف رامے

۳۹ - محمد حنیف رامے : اقبال اور سوشلزم ، ص ۱۹۹ -
۴۰ ایضاً ، ص ۶۳ -

ہے کہ اقبال کو ''مسلم سوشلسٹ'' کہہ دینا جوشِ بیان کے سوا اور کچھ نہیں، لیکن مسلمانوں کے لیے ''اشتراکیت'' کا مسئلہ معاشی نظام کے مسئلے سے زیادہ آن کے عقائد سے ٹکراؤ کا مسئلہ بن گیا ہے۔ اس لیے بعض اہلِ علم نے اقبال اور اشتراکیت کے تعلق کو قومی اور دینی مسئلہ سمجھ کر اسے بحث اور تجزیے کا موضوع بنایا ہے۔

اس کوشش کی سب سے نمایاں مثال ڈاکٹر سید عبداللہ کا مضمون ''کیا اقبال اشتراکی تھے؟''[۴۱] اقبال کے بعض بیانات کے حوالے سے کلامِ اقبال کے مختلف حصوں کی معنوی وضاحت کر کے مختلف عنوانات کے تحت اقبال کے اقتصادی تصورات سے بحث کی گئی ہے اور یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ: ''اقبال کے اقتصادی خیالات اسلام کے تابع ہیں اور اسلام کے معاشی احکام محض معاشیات کے مسائل نہیں، بلکہ کل زندگی کا جزو ہیں، یعنی یہ معاشیات، ایک خاص اخلاقی و روحانی دستورالعمل کے تابع ہیں۔''[۴۲] نیز یہ بات بھی بڑی تاکید سے کہی گئی ہے کہ ''. . . . اقبال، اشتراکی نہ تھے اور جو شخص انھیں اشتراکی کہتا ہے، غلط الزام لگاتا ہے۔''[۴۳] ڈاکٹر سید عبداللہ نے ایک سوال اٹھایا اور اس کا مدلل جواب دیا۔

ایک دوسری نوعیت کا سوال ''حکمت اقبال'' کے مصنف[۴۴] نے اپنی کتاب کے آخر میں اٹھایا ہے۔ یہ کتاب ''کلام اقبال کی روشنی میں، اقبال کے فلسفۂ خودی کی مفصل اور منظم تشریح'' کی غرض سے لکھی گئی ہے۔ کتاب کے سولہ ابواب میں سے ایک

۴۱۔ مشمولہ: مسائل اقبال، ص ۲۴۱ - ۲۵۶۔
۴۲۔ ڈاکٹر سید عبداللہ، مسائلِ اقبال، ص ۲۵۲۔
۴۳۔ ایضاً، ص ۲۵۵۔
۴۴۔ محمد رفیع الدین۔

باب کا عنوان ''خودی اور سوشلزم'' ہے - اشتراکیت کے متعلق فاضل مصنف کا نظریہ یہ ہے کہ وہ دورِ حاضر کے سب سے زیادہ مقبول اور با اثر اور سب سے زیادہ گمراہ کرنے والے ، یعنی آدمی کو اپنے مقصد سے ہٹانے والے غلط اور ناپائیدار نظریات''[۴۵] میں سے ایک ہے - چنانچہ اُنھوں نے خودی اور سوشلزم کے رشتے سے بحث کرتے ہوئے کہا ہے کہ ''سوشلزم کی خرابی یہ ہے کہ وہ اصل انسان یا خودی کی ضرورت ، یعنی خدا کی محبت کو نظر انداز کرکے - - - - جسم کے قیام اور بقا کی ضرورت کو پورا کرنے کی کوشش کرتی ہے -[۴۶] سوشلزم خدا کے انکار پر مبنی ہے ، اس لیے سوشلسٹوں کی اقتصادی مساوات کی کوششوں میں خدا کی رضا طلبی کی نیت شامل نہیں - اس لیے یہ کوششیں خودی کے اصل مقصود کو انسان کی نظروں سے اوجھل کر دیتی ہیں -[۴۷] سوشلزم کے نظام کے پیرو جس چیز کو نیکی کہتے ہیں - وہ بظاہر نیکی معلوم ہونے کے باوجود سچی نیکی نہیں ، اس لیے کہ وہ ایک غلط نصب العین کی محبت سے پیدا ہوتی ہے -[۴۸]

اقبال ، جس طرح کا ''اسلامی سوشلزم'' لانا چاہتے ہیں ، اُس کا امتیاز یہ ہے کہ وہ سب سے پہلے خدا کی شدید محبت سے پیدا ہوتا ہے ، جبر یا خارجی قانون سے پیدا نہیں ہوتا - اقبال کا سوشلزم اقبال کے پورے نظام کے ساتھ ہی لایا جا سکتا ہے -[۴۹] ''اسلامی

---

۴۵ - محمد رفیع الدین : حکمتِ اقبال ، ص ۳۷۷ -
۴۶ . ایضاً ، ص ۳۷۹ -
۴۷ - ایضاً ، ص ۳۹۸ -
۴۸ - ایضاً ، ص ۳۹۹ -
۴۹ - ایضاً ، ص ۴۰۸ -

سوشلزم'' سے اقبال کی مراد اسلام ہے۔[۵۰] اس ''اسلامی سوشلزم'' کے تین واضح امتیازات ہیں :

۱ - ''اسلامی سوشلزم'' بنیادی طور پر خدا کی شدید محبت سے پیدا ہوتا ہے -

۲ - ''اسلامی سوشلزم'' بجائے خود اسلامی معاشرے کا مقصود و مطلوب نہیں ، بلکہ خدا کی محبت کی تشفی اور تسکین کا ذریعہ اور اس کا ضمنی نتیجہ ہے اور :

۳ - ''اسلامی سوشلزم'' کی مکمل ترین صورت یہ ہے کہ زندگی کے ہر شعبے پر اسلام کی حکمرانی ہو -

اس کا مطلب یہ ہے کہ جس چیز کو ''اسلامی سوشلزم'' کہا گیا ہے وہ حقیقت میں اسلام ہے -[۵۱] پھر اگر ''اسلامی سوشلزم'' سے مراد اسلام ہی ہے تو پھر اس مقدس نام کے ساتھ سوشلزم ایسی کافرانہ اصطلاح جوڑنے کی کیا ضرورت ہے - اگر وہ اسلام اور سوشلزم کا ایک نیا مرکب ہے تو مردود ہے کیونکہ اس کی سند نہ دین سے ملتی ہے ، نہ دنیا سے -''[۵۲]

فاضل مصنف نے باب کے آخر میں کارل مارکس کے برپا کیے ہوئے روسی انقلاب کو ایک ''مہلک راہ نمائی'' اور ''نوع انسانی کی سب سے بڑی بدخدمتی'' کہتے ہوئے یہ سوال کیا ہے کہ ہم اس نظام کو ''دانائی کی بات'' کہہ سکتے ہیں ؟[۵۳]

---

۵۰ - ایضاً ، ص ۴۰۹ -
۵۱ - ایضاً ، ص ۴۰۹ -
۵۲ - ایضاً ، ص ۴۱۰ -
۵۳ - ایضاً ، ص ۴۴۸ -

دینی نقطۂ نظر سے ایک مختصر لیکن فکر انگیز کتاب خالد علوی کی ''اقبال اور احیائے دین'' ہے ۔ کتاب کے جس حصے میں تہذیب جدید کے متعلق اظہار خیال کیا گیا ، وہیں اشتراکیت کے عنوان کے تحت ، بات اس قصے سے شروع کی گئی ہے :

''مغربی تہذیب ہی کا مشہور فکری اور منطقی مغالطہ اشتراکی تحریک ہے ۔''[۵۴]

اس کے بعد اقبال کے بعض معروف اور واضح بیانات کے حوالے سے بڑے اختصار کے ساتھ استدلال کیا گیا ہے کہ اقبال کا اصل عقیدہ یہ ہے کہ اقتصادی امراض کا علاج قرآن حکیم کے پاس ہے ۔'' ان حالات میں اقبال کو اشتراکیت کا ہم نوا سمجھنے والا ہماری دعائے خیر کا محتاج ہے ۔[۵۶]

غیر محتاط بیانات اور شدید احتجاجات کی اس فضا میں بے حد ضروری تھا کہ اقبال اور اشتراکیت کے رشتے کا ایک معروضی ، مدلل اور متوازن جائزہ لیا جاتا تاکہ یہ اہم مسئلہ شکوک و شبہات کے دھندلکوں سے نکل کر ایک بین اور روشن حقیقت کی طرح اقبال کے قارئین کے سامنے آ جاتا ۔ یہ خدمت ایس ۔ اے ۔ رحمان صاحب نے انجام دی اور مسئلے کو ایک بار پھر اسی علمی بصیرت کے ساتھ پیش کیا جیسے برسوں پہلے اسے پیش کرنے کی کوشش کی گئی تھی اور مطالب جا بجا الجھ کر رہ گئے تھے ۔

---

۵۴ ۔ خالد علوی : اقبال اور احیائے دین ، ص ۳۸ ۔
۵۵ ۔ ایضاً ، ص ۴۳ ۔
۵۶ ۔ ایضاً ، ص ۴۴ ۔

''اقبال اور سوشلزم''[۵۷] کے ابتدائی سولہ صفحات ''کمیونزم'' اور ''سوشلزم'' کی اصطلاحات کی وضاحت کے لیے وقف ہیں ۔ بات افلاطون (۴۲۷-۳۴۷ق م) سے شروع ہوئی ۔ پھر مزدک (۴۸۷ء) کے ذکر کے بعد اُن تصورات کا ارتقاء اور تغیر بیان کیا گیا ہے جو اس لفظ (سوشلزم) کے مفہوم میں اولاً ۱۸۴۰ء تک پیدا ہوئے اور پھر دوسری جنگ عظیم کے بعد مختلف ملکوں میں بعض بنیادی تغیرات کے ساتھ اختیار کیا گیا ۔

مارکس ، اینگلز اور لینن کے علاوہ بعض اہم سیاسی مفکرین اور ماخذ کی مدد سے مقالے میں Communist Manifesto کے بنیادی مطالب کی تشریح بھی کی گئی ہے ۔ اس میں استعمال ہونے والی اصطلاحوں اور بعض بنیادی فقروں کو منطقی تجزیے اور بحث کا موضوع بھی بنایا گیا ہے ۔ مقالے میں ایک جگہ یہ بات کہی گئی ہے کہ اشتراکی فلسفے اور عمل کے محاسن و قبائح کا تفصیلی تجزیہ اس مقالے کا مقصد نہیں ۔ لیکن ایک بات ذہن نشین کرانا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ اشتراکیت بدیہی طور پر ملحدانہ ، عدیم الاخلاق اور جارحانہ طور پر لادینی فلسفہ ہے ۔[۵۸] مقالے کا یہ حصہ اس سوال پر ختم ہوتا ہے کہ نہ جانے وہ وقت کب آئے گا اور کیسے آئے گا کہ اشتراکیت اکسیر اعظم بن کر مزدور کے کام کو اس کے لیے راحت و سکون کا وسیلہ بنا سکے ۔[۵۹]

مقالے کے اگلے حصے میں اقبال کے خطبات ، مکاتیب ، بیانات اور تقاریر کے حوالوں سے جن کا سلسلہ ۱۹۰۹ء سے شروع ہو کر

---

۵۷ - Iqbal and Socialism by: Dr. S.A. Rehman with Presidential remarks by : Mr. A.K. Brohi, Karachi, 1974.

۵۸ - ایضاً ، ص ۲۶ -

۵۹ - ایضاً ، ص ۲۸ -

آن کی یکم جنوری ۱۹۳۸ء کی ایک تقریر پر ختم ہوتا ہے ، یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ اشتراکیت کے متعلق اقبال کے خیالات واضح طور پر معترضانہ ہیں ۔[۶۰]

مقالے کے تیسرے حصے میں بانگِ درا ، بال جبریل ، ضربِ کلیم ، ارمغان حجاز، اسرارِ خودی، پیام مشرق ، زبور عجم ، جاوید نامہ ، گلشنِ رازِ جدید ، مسافر اور پس چہ باید کرد کے حوالوں سے اشتراکیت اور متعلقہ تصورات کے متعلق اقبال کے خیالات کی وضاحت کی گئی ہے اور یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ اشتراکیت کے تصورات اور اقبال کے افکار کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تو جو نقشہ مرتب ہوتا ہے ، اس میں اساسیات کے معاملے میں موافقت کے بجائے اختلاف کا رنگ ابھرتا ہے ۔[۶۱] ایک بات جس میں اقبال اشتراکی فلسفے سے اتفاق رکھتے ہیں ، وہ مطلق العنان سرمایہ داری کی کلی تردید ہے ۔[۶۲]

ڈاکٹر ایس - اے - رحمان کے اسی خطبے کے آخر میں مسٹر اے - کے - بروہی نے اسلامی اشتراکیت یا اسلامک سوشلزم کی اصطلاح کو بے معنی قرار دیتے ہوئے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اس اصطلاح کو قبول کرنے اور رواج دینے کے معنی یہ ہیں کہ اسلام ہمارے مسائل کے حل اور زندگی کی تنظیم نہ کرسکا اس لیے ہم اس کے بجائے ''اسلامک سوشلزم'' کو اختیار کر رہے ہیں[۶۳] - ہم نے اگر اس پریشان خیالی کو اپنے جسد سیاسی میں داخل ہونے کا

---

۶۰ - ایضاً ، ص ۲۸ -
۶۱ - ایضاً ، ص ۴۷ -
۶۲ - ایضاً ، ص ۴۹ -
۶۳ - ایضاً ، ص ۵۸ -

موقع دے دیا اور اسلامک سوشلزم کے نعرے کو غیر مشروط طریق پر قبول کر لیا تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ بجائے اس کے کہ اسلام ، سوشلزم کا رہبر بنے ہوگا یہ کہ اسلام کی باگ ڈور سوشلزم کے ہاتھ میں آ جائے گی[۶۴] ، اور جو شخص آج اسلامی اشتراکیت کے تصور کو قبول کر رہا ہے - وہ کل اسلام کی آواز پر کان دھرنے کے بجائے سوشلزم کی آواز کی طرف توجہ دے گا ، اس لیے کہ اسلامی اشتراکیت کی ترکیب میں اصل لفظ ''اشتراکیت'' ہے - اسلام کی حیثیت تو محض ایک توصیفی کلمے کی ہے[۶۵] اور بالآخر اس صورت حال کا نتیجہ نکلے گا کہ سوشلزم اور کمیونزم جو آج محض انسان کی معاشی زندگی کی تنظیم کی دعویدار ہے ، کل ہمارے سیاسی، معاشرتی ، تعلیمی اور تہذیبی اداروں کو ماضی کے طاقِ نسیاں پر بٹھا دے گی -[۶۶]

---

۶۴ - ایضاً ، ص ۵۸-۵۹ -
۶۵ - ایضاً ، ص ۶۱ -
۶۶ - ایضاً ، ص ۶۱ -

متفرقات :

۱ - اقبال—خطوں کی روشنی میں

۲ - خودی : بحرِ بے کنار

۳ - اقبال : حقیقت شناس

۴ - اقبال اور عشقِ رسول

۵ - غزل گو اقبال

۶ - IQBAL : Poet & Philosopher

اقبال : خطوں کی روشنی میں

۱۹۶۶ء میں ریڈیو پاکستان لاہور نے یونیورسٹی میگزین پروگرام کے تحت مباحثوں کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا جس کا عنوان تھا ''خطوں کی روشنی میں''— اس سلسلے کا مقصد یہ تھا کہ اردو کے چند نامور اور معروف ادیبوں اور شاعروں کے مکاتیب پر اس لحاظ سے بحث کی جائے کہ اُن کی شخصیت اور ان کے افکار کی ایک جھلک سامنے آ جائے۔ مباحثوں کے اس سلسلے کے لیے غالب ، سر سید ، نذیر احمد ، شبلی ، اکبر اور اقبال کے مکاتیب منتخب کیے گئے—طریقِ کار یہ تھا کہ پہلے سید وقار عظیم صاحب خطوں کے متعلق مختصر طور پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے تھے، اس کے بعد طلبہ اور طالبات ان خیالات سے پیدا ہونے والے نکات کے متعلق سوالات کرتے تھے اور پروفیسر وقار عظیم صاحب ان کے جواب دیتے تھے اور یوں، جو باتیں سات یا آٹھ منٹ کی تقریر میں نہیں کہی جا سکتی تھیں وہ باہمی گفتگو ، تبادلۂ خیال اور بحث و تمحیص سے سامنے آ جاتی تھیں—ذیل میں اقبال کے خطوں سے متعلق سید وقار عظیم صاحب کی مختصر تقریر درج کی جا رہی ہے - اس بحث میں وقار عظیم صاحب کے ساتھ جن طلبا و طالبات نے شرکت کی اُن کے اسماء یہ ہیں : زہرا معین ، ناز کاظمی ، امجد اسلام امجد اور معراج نیر -

[م-ا-ر]

غالب سے اقبال تک ہمارے شاعروں اور ادیبوں کی کاوش نے

علم و فضل اور علم و ہنر کی جو دنیا آباد کی ہے ، آس کی رونق ، آب و تاب اور جلوہ گری میں خطوں کو بھی ایک اہم مقام حاصل ہے کہ اس کے آئینے میں ہمیں صاحبِ فن کی خارجی اور داخلی شخصیت کی ، اس کے جسم و جان کی ، آس کے قلب و ذہن کی اور اکثر اوقات آس کی مضطرب روح کی ایسی زندہ اور جیتی جاگتی تصویر نظر آتی ہے کہ آس تصویر کے سہارے سے ہمیں بات کہنے والے کی بات تک پہنچنے میں بھی مدد ملتی ہے اور آس کے گرد و پیش کی زندگی کا مفہوم سمجھنے میں بھی -

اب تک ہم غالب ، سر سید ، نذیر احمد ، شبلی اور اکبر کے خطوں کی روشنی میں آن کے کاتب کی شخصیت کو سمجھنے کی کوشش میں مصروف رہے ہیں اور اس کوشش میں جہاں ایک طرف یہ نتیجہ نکالنے میں کامیاب ہوئے ہیں کہ علمی ، ادبی اور قومی و تہذیبی زندگی کے ان اکابر نے ہمیں اپنے مکاتیب کے ذریعے اپنے متعلق اور اپنے عہد کے متعلق جو کچھ بتایا ہے ، آس سے ہم پر زندگی کے بہت سے بھید کھلے اور بہت سے اسرار و رموز منکشف ہوئے ہیں - لیکن دوسری طرف ہم نے یہ بھی دیکھا ہے کہ ان خطوں میں سے ہر ایک کے خط میں ایک نمایاں انفرادیت بھی ہے اور وہی انفرادیت غالب ، سر سید ، نذیر احمد ، شبلی اور اکبر کا امتیاز ہے - غالب کے خطوں کا گہرا شخصی اور تہذیبی رنگ ، سر سید کا بے مثال قومی احساس ، نذیر احمد کی واضح مقصدیت ، شبلی کی دل نشین رومانی شیفتگی اور اکبر کی افسردہ دلی ، بے چینی اور اضطراب میں ان شاعروں ، ادیبوں ، مؤرخوں اور مصلحوں کی منفرد اور ممتاز شخصیتوں کا عکس ہے -

یہی صورت اقبال کے خطوں کی بھی ہے - اس فرق کے ساتھ کہ ان کے مکاتیب میں معانی کی بے شمار سطحیں ہیں - ان خطوں کے

مطالب کا مد و جزر ایک بحر بے پایاں کا مد و جزر ہے - اقبال کی شخصیت تہہ دار اور پہلو دار ہے اور زندگی کے اتنے گوشوں کا احاطہ کرتی ہے اور اس کے اتنے رمتوں پر حاوی ہے کہ ہمارے ادب کی کوئی شخصیت آن کی نظیر اور آن کی ثانی نہیں -

اقبال فلسفی ہیں اور ایسے فلسفی جنھیں مشرق اور مغرب کے فلسفوں پر یکساں عبور ہے - وہ عالمِ دین ہیں اور ایسے عالم جنھوں نے دین کی صحیح روح کو اپنے اندر جذب کیا ہے - وہ سیاست دان ہیں اور دنیا کی سیاست کے پیچ و خم آن کی نظر کے سامنے ہیں - وہ تاریخ دان ہیں اور تاریخ کی روشنی میں حال کا جائزہ لیتے اور مستقبل کی زندگی کا تصور کرتے ہیں - وہ شاعر ہیں اور آن کی حکمت جذبے کے اضطراب کو اپنے اندر سمیٹتی اور سموتی ہے - اقبال کی جامع ذات علم کی شیدائی ہے - آنھیں زندگی کے جس گوشے میں علم کی کوئی کرن دکھائی دیتی ہے ، بے تابانہ آس کی طرف لپکتے ہیں -

اقبال کے مزاج میں مشرق و مغرب کی علمی و اخلاقی قدروں کا ایسا رچاؤ ہے کہ شاذ دیکھنے میں آتا ہے ، لیکن اس مزاج میں مشرق کی دی ہوئی اور اسلام کی پھیلائی ہوئی قدروں کا غلبہ ہے - علم کی کبھی نہ بجھنے والی پیاس ، حق کی تلاش ، عجز ، انکسار ، وضع داری ، خلوص ، حق گوئی ، بے باکی ، دردمندی ، گداز ، خود شناسی ، فقر اور درویشی اس مزاج کے اہم اجزا ہیں اور اقبال کے مکاتیب آن کی ہمہ گیر شخصیت کا عکس اور یوں گویا آن کی نگاہِ بلند ، دلِ غیور اور ذہنِ رسا کا عکس ہیں اور اسی لیے کسی نے اقبال کے خطوں کو اپنے عہد کی علمی اور معنوی یادگار کہا ہے اور کسی نے فلسفے ، شعر اور وعظ کا امتزاج -

ان خطوں کے موضوعات کا دامن بہت وسیع ہے۔ ان میں فلسفہ ہے ، سیاست ہے ، دین ہے ، تاریخ ہے ، اخلاق ہے اور ان میں سے ہر ایک میں اقبال کی غیر معمولی بصیرت کی عظمت کے آثار نمودار ہیں ۔ لیکن ان خطوں میں اقبال کے کلام کی تشریح اور توضیح کے ایسے نکات ملتے ہیں جن میں بحث ، تجزیے ، تاویل اور توجیہہ نے فکر و خیال کی پیچیدگیوں کی عقدہ کشائی کی ہے ۔

ان خطوں میں ہمیں اقبال کے علاوہ جو فلسفیِ عصر، حکیمِ امت مبصرِ سیاست اور مفسرِ اخلاق ہے اور اپنی بات حکیمانہ ، حقیقت پسندانہ اور متوازن اور دھیمے لہجے میں کہتا ہے ، وہ اقبال بھی ملتا ہے جس نے ذہن کی بات کے ساتھ بڑا گہرا جذباتی رشتہ قائم کیا ہے اور جس نے اپنے خطوں کو اپنے نادیدہ اور نامعلوم اضطراب کا آئینہ بنایا ہے ۔

ان خطوں میں ہمیں ذہن کی دنیا میں رہنےوالے اقبال کے علاوہ اس اقبال سے بھی قریب آنے کی سعادت حاصل ہوتی ہے جو ہماری طرح گوشت پوست کا ایک معمولی انسان ہے اور اپنے غم میں دوسروں کو شریک کرنے کے علاوہ دوسروں کے غم پر رونے کا حوصلہ بھی رکھتا ہے ۔ وہ بھی دوستوں کے خطوں کو غالب ، شبلی اور اکبر کی طرح زندگی کا سرمایہ جانتا اور زندگی کے بہترین لمحے آن کے انتظار میں بسر کرتا ہے ۔ اس میں سر سید کی عالمانہ شان اور نذیر احمد کی اعلیٰ مقصدیت کے ساتھ ساتھ غالب کی بے چینی، شبلی کی والہانہ شیفتگی اور اکبر کی افسردگی بھی ہے ، اس لیے اس کے خط اپنے عہد کی سیاسی ، دینی ، معاشرتی ، فکری اور ذہنی کیفیت کی دستاویز ہونے کے ساتھ ساتھ ایک انسان ، زمین پر رہنے والے انسان کے شب و روز کے معمولات کی سرگذشت اور روداد بھی

ہیں . . . . خواہ ویسی روداد نہ سہی جیسی غالب ، شبلی اور اکبر کے خطوں میں یا اس سے کم تر درجے پر سر سید اور نذیر احمد کے خطوں میں ملتی ہے -

[سالنامہ ''اوراق'' لاہور جنوری ۱۹۶۷ ، صفحہ ۵۶-۵۸]

خودی : بحرِ بے کنار

[ریڈیائی فیچر]

''خودی وہ بحر ہے ، جس کا کوئی کنارہ نہیں ۔ ۔ ۔ ۔'' خودی کے جس بحرِ بیکراں کی طرف اقبال نے اس مصرعے میں اشارہ کیا ہے ۔ اس کے سفر کی داستان کا خلاصہ ''ساقی نامہ'' کے یہ شعر ہیں :

خودی کیا ہے ؟ رازِ درونِ حیات !
خودی کیا ہے ؟ بیداریِ کائنات !

ازل اس کے پیچھے ، ابد سامنے !
نہ حد ، اس کے پیچھے نہ حد سامنے !

زمانے کے دریا میں بہتی ہوئی
ستم اس کی موجوں کے سہتی ہوئی

ازل سے ہے یہ کشمکش میں اسیر
ہوئی خاکِ آدم میں صورت پذیر[1]

---

۱ - ساقی نامہ ، بالِ جبریل ، لاہور جنوری ۱۹۷۵ء ، ص ۱۲۷-۱۲۸ ۔

خودی کا خاکِ آدم میں صورت پذیر ہونا قرآنِ حکیم میں بیان کیے ہوئے قصۂ آدم کی رو سے حقیقت میں آدم کی تخلیق بھی ہے اور انسانی خودی کی تخلیق بھی - اس خودی کے بہت سے نام ہیں :

"یہ وحدتِ وجدانی یا شعور کا وہ روشن نقطہ ہے جس سے تمام انسانی تخیلات و جذبات و تمنیات مستنیر ہوتے ہیں - یہ ایک پر اسرار شے ہے جو فطرتِ انسانی کی منتشر اور غیر محدود کیفیتوں کی شیرازہ بند ہے - یہ خودی "انا" یا "میں" تمام مشاہدات کی خالق ہے ـــ یہ ایک لازوال حقیقت ہے -"

یہ سب الفاظ ، اقبال کے ہیں اور ان الفاظ میں جس لازوال حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ انسان کی وہ بے پایاں صلاحیتیں ہیں جن کی بنا پر اسے نیابتِ الٰہی کا اعلیٰ منصب عطا ہوا - - - - اللہ تعالیٰ نے انسان کو وہ علم الاشیاء عطا کیا جس سے فرشتے محروم ہیں - اللہ نے انسان کی ذات میں اپنی روح پھونک کر اسے اپنے لازوال اوصاف کا مظہر ٹھہرایا - جنت میں آدم کا شجرِ ممنوعہ کی طرف بڑھنا بھی مشیت ایزدی ہے کہ یہ اختیار اور ارادے کو برتنے کی طرف پہلا قدم ہے -

اختیار کی یہی آزادی اور اسی آزادی کا احساس انسان کا "ایغو" - - - - اس کی "انا" اور اس کی "خودی" ہے - خودی کے اس احساس میں ان تمام اوصاف اور صلاحیتوں کا احساس شامل ہے جن کی بدولت انسان کو نیابتِ الٰہی کے تقاضوں سے عہد برآ ہونا ہے - یہ منصب تسخیرِ فطرت کا منصب ہے جس کی طرف قرآنِ حکیم میں اشارے ہیں اور جن اشاروں کی بڑی دلکش تفسیر "بالِ جبریل" اور "پیامِ مشرق" کی کئی نظموں میں ملتی ہے - اللہ تعالیٰ نے ایک جہانِ رنگ و بو تخلیق کیا اور تخلیق کے اس

عمل کو جاری رکھنے اور ''مقامِ رنگ و بو'' کو تسخیر کرکے فطرت کے مقاصد کی تکمیل کرنے کی اعلیٰ خدمت انسان کے سپرد ہوئی ۔

اقبال کے حکیمانہ تصور اور شاعرانہ تخیل نے انسان کو تسخیرِ فطرت کے اس منصبِ اعلیٰ کی تکمیل کے سلسلے میں جن مرحلوں سے گزرتے دیکھا ہے اپنے نگارخانۂ شعر کی تعمیر و تزئین انھیں کے نقوش سے کی ہے اور یوں اُن کی شاعری انسان کے مراحلِ شوق کا مرقع ہونے کے علاوہ اُس سفر کی روداد بھی بن گئی ہے جسے انسانی خودی کا سفر کہنا چاہیے ۔

اس سفر کا پہلا مرحلہ وہ ہے جب انسان ایک عظیم بارِ امانت اپنے کندھوں پر رکھ کر جنت سے رخصت ہوتا ہے ۔ اس کی سرشت کی کوکبی و مہتابی اور اس کے گریۂ سحرگاہی کی اثر انگیزی کا ترانہ فرشتوں کی زبان پر ہے ۔ سفر کا دوسرا مرحلہ وہ ہے جب انسان فرشِ زمین پر قدم رکھتا ہے ۔ مشرق سے اُبھرتے ہوئے سورج کی شعاعیں اُسے دعوتِ نظارہ دیتی ہیں اور روحِ ارضی اس کا خیر مقدم کرتے ہوئے اس صداقتِ ابدی کا اعلان کرتی ہے کہ یہ بادل ، یہ گھٹائیں ، یہ گنبدِ افلاک ، یہ کوہ و صحرا ، یہ سمندر ، یہ ہوائیں اور یہ خاموش فضائیں سب تیری حلقہ بگوش ہیں تو اسے اپنے تصرف میں لا ۔

انسان اپنے کام میں مصروف ہو جاتا ہے اور اپنی لامحدود صلاحیتوں سے جن کا دوسرا نام ''خودی'' ہے ، وہ مقام حاصل کرتا ہے کہ زمانہ اُس کی آنکھوں کے اشاروں کا پابند ہو جاتا ہے ۔ انسان نے خودی کی تکمیل کے سفر میں تسخیرِ کائنات کو اپنی آرزو بنایا ہے ۔ تسخیر کا یہ عمل جاری رہتا ہے اور ہر تسخیر

ایک نیا علم اپنے ساتھ لاتی ہے اور ہر نیا علم ایک نئی تسخیر کا راستہ دکھاتا ہے - ہر روز نیا طور اور نئی برقِ تجلی اور ہر نئے طور اور نئی برقِ تجلی کے ساتھ دل میں اٹھنے والی یہ آرزو کہ اللہ کرے یہ مرحلۂ شوق کبھی طے نہ ہو -

انسانی آرزوؤں کے اس سفر میں جسے ایک بار پھر میں انسانی خودی کا سفر کہہ رہا ہوں ایک مرحلہ وہ آتا ہے جب انسان اپنے علم ، اپنے تخیل ، اپنے جوش اور اپنی کشمکشِ پیہم سے اللہ کی بنائی ہوئی راتوں میں اجالا پھیلا دیتا ہے اور اس کے بنائے ہوئے بیابان و کہسار و راغ کو خیابان و گلزار و باغ میں بدلتا اور سنگ و خارا میں چھپے ہوئے آئینے کے انکشاف سے نئے انکشافات کے دروازے کھولتا ہے - لیکن اس کی کچھ اور کرنے اور برابر کچھ کرتے رہنے کی آرزو زندہ و تابندہ ہے اور یہ آرزو اللہ تعالٰی کے حضور میں ایک للکار بن کر ظاہر ہوتی ہے :

کارِ جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر !

لیکن معبود حقیقی کی بارگاہ میں اپنے کارناموں پر فخر کرنے والے انسان کی ایک خلش بھی ہے جو سوال بن کر ابھرتی ہے :

زوالِ آدمِ خاکی ، زیاں تیرا ہے یا میرا

یہ سوال اس مفکر اقبال کا سوال ہے جس نے انسان اور اداروں کی تاریخ کا مطالعہ کرکے اپنے عہد کے انسان کو زوال کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا ہے -

اقبال کی نظروں کو انسان کی تمام تر کاوشوں کا یہ نتیجہ دکھائی دیا ہے کہ زندگی کی شبِ تاریک اب بھی سحر سے محروم

ہے - اقبال نے تجزیے اور تفکر کے بعد ''نفیِ خودی'' کو اس زوال اور ظلمت کا سبب قرار دیا ہے اور عرب و عجم و عراق سب کو ''نفیِ خودی'' کے اس مرض میں مبتلا پایا ہے - تجزیے کی اس منطق کا تقاضا اقبال کے نزدیک یہ ہے کہ انسان اپنی کھوئی ہوئی خودی کی جستجو کرے اور اثبات خودی کو نفیِ خودی کے زہر کا تریاق بنائے -

اقبال کے دل میں آگہی کی یہ شمع روشن ہوئی تو انھوں نے ایک بار پھر انسان کو خودی کی جستجو کی دعوت دی :

تو اپنی خودی کو کھو چکا ہے
کھوئی ہوئی شئے کی جستجو کر !

اور اس کھوئی ہوئی شئے کی جستجو کا راستہ اقبال نے ایک مرتب اور منظم صورت میں 'اسرار و رموز' میں دکھایا ہے اور فکر اور شعر کی آمیزش سے وجود میں آئی ہوئی ان بے شمار تخلیقی اکائیوں کی صورت میں جو ان کے کلام فارسی اور کلام اردو میں قدم قدم پر اپنا جلوہ دکھا رہی ہیں - جو لامحدود صلاحیتیں اور قوتیں انسان کو ودیعت ہوئیں ان میں سب سے اہم اور سب سے بڑی قوت علم ہے جو خودی کی ابتدا بھی ہے اور انتہا بھی -

خودی کا یہی آئینہ ہے جس میں انسان کو اپنے ماضی ، حال اور مستقبل کا جلوہ نظر آتا ہے - انسانی خودی کا سفر کسی آرزو ، مقصد یا نصب العین کے احساس سے شروع ہوتا ہے - آرزو کی تکمیل اور حصول مقصد کی تمنا انسان کو سعی و عمل کی راہ پر گامزن کرتی ہے - سعی و عمل کی راہ میں حوائل و شدائد آتے

ہیں - لیکن مقصد کی لگن جس کا دوسرا نام عشق ہے ، ہر سنگ گراں کو توڑتی اور ہر خار راہ کو روندتی ہوئی آگے بڑھتی رہتی ہے -

تسخیر کا عمل جاری رہتا ہے اور عالمِ رنگ و بو کا ذرہ ذرہ انسان کا مسخر اور تابع فرمان بن جاتا ہے - لیکن اس خاکدان کی تسخیر ، خودی کی آخری منزل نہیں کہ ابھی بہت سے عالم بےنمود ہیں اور خودی کی یلغار کے منتظر - - - حال اس کا صید بن چکا ہے لیکن مستقبل کے صید کو ابھی دام میں لانا باقی ہے -

خودی کے صیاد کو تو اُس آہو کا شکار کرنا ہے جو عالمِ وجود میں نہیں آیا - جو سبزہ ابھی زیرِ زمین ہے ، اس کے چمن کی زینت اور جو گل ابھی پردۂ شاخ میں مستور ہے ، اس کی دستار کی فضیلت بنے گا ، بشرطیکہ خودی خوف و مایوسی کی بجائے 'لاتقنطوا' اور 'لاتحزنوا' کو اپنا شریک سفر بنائے اور اپنے بحرِ ناپیدا کنار میں تلاطم برپا رکھے -

---

اقبال : حقیقت بیں، حقیقت شناس !

[ریڈیائی فیچر]

راوی :

اقبال شاعر ہے اور مفکر ہے ، اقبال مصلح ہے اور مدبر ہے۔ اس شاعر ، مفکر ، مصلح اور مدبر کو قسامِ ازل نے چشمِ بینا کی دولت عطا کی اور دل دانا کی نعمت ارزانی فرمائی ۔ ۔ ۔ ۔ وہ چشمِ بینا جو تخیلات خداوندی میں خلل ڈالنے کی جسارت کر سکتی ہے اور وہ دل بینا جو رازہائے درون میخانہ کا محرم ہونے کا دعویدار ہے۔ اقبال کی نظر حقیقت بیں ہے اور اس کا دل حقیقت شناس۔ یہ نظر آفق مغرب پر ابھرنے والی شفق میں رنگِ خوں کی جھلک دیکھتی ہے اور یہ دل دوش و امروز کو فسانہ کہہ کر طلوع فردا کی نوید سناتا ہے۔

[روایت ختم ہونے کے فوراً بعد ترنم کے ساتھ مندرجہ ذیل اشعار پڑھے جائیں :]

"شفق نہیں مغربی آفق پر، یہ جوے خوں ہے! یہ جوے خوں ہے
طلوع فردا کا منتظر رہ کہ دوش و امروز ہے فسانہ !
وہ فکر گستاخ جس نے عریاں کیا ہے فطرت کی طاقتوں کو
اسی کی بے تاب بجلیوں سے خطر میں ہے اس کا آشیانہ !

ہوائیں آن کی ، فضائیں آن کی ، سمندر ان کے ، جہاز ان کے
گرہ بھنور کی کھلے تو کیوں کر ؟ بھنور ہے تقدیر کا بہانہ !
جہانِ نو ہو رہا ہے پیدا ، وہ عالمِ پیر مر رہا ہے[1]

راوی :

[رک رک کر ایک ایک لفظ پر زور دے کر] :

جہانِ نو ہو رہا ہے پیدا ، وہ عالم پیر مر رہا ہے

[نظم ــ تحت اللفظ :]

زمانے کے انداز بدلے گئے
نیا راگ ہے ، ساز بدلے گئے

ہوا اس طرح فاش رازِ فرنگ
کہ حیرت میں ہے شیشہ باز فرنگ !

پرانی سیاست گری خوار ہے
زمیں میر و سلطاں سے بیزار ہے

گیا دورِ سرمایہ داری گیا
تماشا دکھا کر مداری گیا !

گراں خواب چینی سنبھلنے لگے
ہمالہ کے چشمے ابلنے لگے !

---

۱ - زمانہ ، بال جبریل ، لاہور جنوری ۱۹۷۵ء ، صفحہ ۱۳۰ -

دلِ طورِ سینا و فاراں دو نیم
تجلی کا پھر منتظر ہے کلیم !

مسلماں ہے توحید میں گرم جوش
مگر دل ابھی تک ہے زنار پوش !

تمدن ، تصوف ، شریعت ، کلام
بتانِ عجم کے پجاری تمام !

حقیقت ، خرافات میں کھو گئی
یہ اُمت روایات میں کھو گئی !

مجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے[1]

راوی :

اقبال کی نگاہِ تیز ، فرد کے ظاہر و باطن کا مشاہدہ کرکے جماعت ، قوم اور ملّت کی زندگی کے حقائق پر نظر ڈالتی ، اس کی موجودہ صورت حال کے رخ سے پردہ اُٹھاتی ، اور اپنا کام اقبال کی ہمہ گیر اور ہمہ جہت شخصیت کے ایک اور رخ - - - - شاعر اور حکیم اقبال نہیں ، بلکہ مصلح اقبال کے سپرد کرکے مشاہدے کے کبھی ختم نہ ہونے والے سفر پر روانہ ہو جاتی ہے اور مصلح کے دل سے نکلا ہوا نغمہ فضائے بسیط میں گونجتا ہے :

---

۱ - ساقی نامہ ، بال جبریل ، صفحہ ۱۲۳ -

[ذیل کے اشعار ترنم کے ساتھ پڑھے جائیں :]

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر !
نیا زمانہ ، نئے صبح و شام پیدا کر !

خدا اگر دلِ فطرت شناس دے تجھ کو
سکوتِ لالہ و گل سے کلام پیدا کر!

اٹھا نہ شیشہ گرانِ فرنگ کے احساں
سفالِ ہند سے مینا و جام پیدا کر !

میں شاخِ تاک ہوں، میری غزل ہے میرا ثمر
مرے ثمر سے مئے لالہ فام پیدا کر !

مرا طریق امیری نہیں ، فقیری ہے !
خودی نہ بیچ ، غریبی میں نام پیدا کر[1]!

راوی :

خودی نہ بیچ ، غریبی میں نام پیدا کر - - - - خودی اقبال کے فلسفۂ حیات کی اساس اور انسان کے فکر و عمل اور یقین و محبت کا سرچشمہ ہے - خودی رازِ درونِ حیات بھی ہے اور بیداری کائنات بھی :

خودی کیا ہے ؟ رازِ درونِ حیات !
خودی کیا ہے ؟ بیداریِ کائنات !

---

۱ - جاوید کے نام (لندن میں اس کے ہاتھ کا لکھا ہوا پہلا خط آنے پر) بال جبریل ، لاہور جنوری ۱۹۷۵ء ، صفحہ ۱۴۷ -

خودی جلوہ بدمست و خلوت پسند !
سمندر ہے اک بوند پانی میں بند !

اندھیرے اجالے میں ہے تابناک !
من و تو میں پیدا ، من و تو سے پاک!

ازل اس کے پیچھے ، ابد سامنے !
نہ حد ، اس کے پیچھے نہ حد سامنے !

زمانے کے دریا میں بہتی ہوئی
ستم اس کی موجوں کے سہتی ہوئی

تجسس کی راہیں بدلتی ہوئی
دما دم نگاہیں بدلتی ہوئی

سبک اس کے ہاتھوں میں سنگِ گراں!
پہاڑ اس کی ضربوں سے ریگِ رواں !

سفر اس کا انجام و آغاز ہے
یہی اس کی تقویم کا راز ہے !

کرن چاند میں ہے ، شرر سنگ میں !
یہ بے رنگ ہے ، ڈوب کر رنگ میں

خودی کا نشیمن ترے دل میں ہے
فلک جس طرح آنکھ کے تل میں ہے !

خودی کے نگہباں کو ہے زہرِ ناب
وہ ناں جس سے جاتی رہے اس کی آب

وہی ناں ہے اس کے لیے ارجمند
رہے جس سے دنیا میں گردن بلند

فرو فالِ محمود سے درگذر
خودی کو نگہ رکھ ، ایازی نہ کر

یہ عالم ، یہ ہنگامۂ رنگ و صوت
یہ عالم کہ ہے زیرِ فرمانِ موت

خودی کی یہ ہے منزلِ اولیں
مسافر ! یہ تیرا نشیمن نہیں

تری آگ اس خاکداں سے نہیں
جہاں تجھ سے ہے تو جہاں سے نہیں

بڑھے جا یہ کوہِ گراں توڑ کر
طلسمِ زمان و مکاں توڑ کر

خودی شیرِ مولا جہاں اس کا صید !
زمیں اس کی صید ، آسماں اس کا صید !

جہاں اور بھی ہیں ، ابھی بے نمود
کہ خالی نہیں ہے ضمیرِ وجود

ہر اک منتظر تیری یلغار کا
تری شوخیِ فکر و کردار کا

یہ ہے مقصدِ گردشِ روزگار
کہ تیری خودی تجھ پہ ہو آشکار

تو ہے فاتحِ عالمِ خوب و زشت !
تجھے کیا بتاؤں تری سرنوشت !

حقیقت پہ ہے جامہ حرف تنگ !
حقیقت ہے آئینہ ، گفتار زنگ !

فروزاں ہے سینے میں شمعِ نفس
مگر تابِ گفتار کہتی ہے بس[1]

راوی :

جہاں انسان کی تاب گفتار جواب دیتی ہے وہاں فرشتے اس فریضے کی ادائیگی کا منصب ادا کرتے ہیں اور جنت سے رخصت

---

۱ - ساقی نامہ ، بال جبریل ، ص ۱۲۷-۱۲۹ -

ہوئے ہوئے انسان کو یہ نوید سناتے ہیں :

[ذیل کے اشعار دو تین آوازیں مل کر ترنم کے ساتھ پڑھے جائیں]

عطا ہوئی ہے تجھے روز و شب کی بے تابی
خبر نہیں کہ تو خاکی ہے یا کہ سیمابی !

سنا ہے خاک سے تیری نمود ہے ، لیکن
تری سرشت میں ہے کوکبی و مہتابی !

تری نوا سے ہے بے پردہ زندگی کا ضمیر
کہ تیرے ساز کی فطرت نے کی ہے مضرابی[1]

راوی :

انسان دھڑکتے ہوئے دل ، پر شوق اور چمکتی ہوئی چشم آرزو کے زادِ راہ کے ساتھ جب اپنے فکر و عمل کی جولانگاہ میں قدم رکھتا ہے تو روح ارضی اس کا استقبال کرتی اور اس پر اس کی عظمت کا انکشاف کرتی ہے :

[ذیل کی نظم تحت اللفظ میں پڑھی جائے :]

کھول آنکھ، زمیں دیکھ، فلک دیکھ فضا دیکھ!
مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ !
اس جلوۂ بے پردہ کو پردوں میں چھپا دیکھ
ایامِ جدائی کے ستم دیکھ ، جفا دیکھ !
بے تاب نہ ہو ، معرکۂ بیم و رجا دیکھ !

---

۱ - فرشتے آدم کو جنت سے رخصت کرتے ہیں ، بال جبریل ، ص ۱۳۱-

ہیں تیرے تصرف میں یہ بادل ، یہ گھٹائیں
یہ گنبدِ افلاک ، یہ خاموش فضائیں
یہ کوہ ، یہ صحرا ، یہ سمندر ، یہ ہوائیں
تھیں پیشِ نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں
آئینۂ ایام میں آج اپنی ادا دیکھ !

سمجھے گا زمانہ تری آنکھوں کے اشارے !
دیکھیں گے تجھے دور سے گردوں کے ستارے
ناپید ترے بحرِ تخیل کے کنارے
پہنچیں گے فلک تک تری آہوں کے شرارے
تعمیرِ خودی کر ، اثرِ آہِ رسا دیکھ !

خورشیدِ جہاں‌تاب کی ضو تیرے شرر میں
آباد ہے اک تازہ جہاں تیرے ہنر میں
جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں
جنت تری پنہاں ہے ترے خونِ جگر میں
اے پیکرِ گل کوششِ پیہم کی جزا دیکھ !

نالندہ ترے عود کا ہر تار ازل سے
تو جنسِ محبت کا خریدار ازل سے

تو پیرِ صنم خانۂ اسرار ازل سے
محنت کش و خونریز و کم آزار ازل سے
ہے راکبِ تقدیر جہاں تیری رضا دیکھ[1] !

راوی :

اقبال کی شاعری شروع سے آخر تک جنسِ محبت کے اس خریدار ، صنم خانۂ اسرار کے اس دانائے راز ، اس محنت کش و کم آزار انسان کی داستان ہے جس کی رضا راکبِ تقدیرِ جہاں ہے اور اقبال کی انسان شناسی اسے یہ درسِ حکمت دیتی ہے کہ :

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے ؟

---

۱ - روح ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے ، بال جبریل ، ص ۱۳۲-۱۳۳ ۔

اقبال اور عشقِ رسولؐ

[تحریر : یکم مارچ ۱۹۷۵ء ، پاکستان ٹیلی ویژن سنٹر ، لاہور
سے یہ فیچر ۲۶ مارچ ۱۹۷۵ء کو ٹیلی کاسٹ ہوا ، پیش کش :
نجم الحسن خواجہ]

اقبال شاعر ہیں اور اقبال فلسفی ہیں اور آن کے فلسفہ و شعر کا مرکز و محور ذاتِ انسانی کی فضیلت کی تفسیر و تعبیر ہے ۔ اس تفسیر و تعبیر کی اساس کلامِ الٰہی کے اس ارشاد پر ہے کہ انسان کائنات کا بلند ترین مظہر ہے اور اپنے اسی وصف کی بنا پر آسے نیابتِ الٰہی کے اعلیٰ منصب کا اہل قرار دیا گیا ہے ۔ لیکن نیابتِ الٰہی کے اس منصبِ اعلیٰ تک رسائی صرف اس طرح ممکن ہے کہ وہ صفاتِ الٰہیہ کا مظہر بنے ۔ ۔ ۔ ۔ صفاتِ الٰہیہ کا مظہر بن کر ہی وہ ''انسانِ کامل'' بنتا ہے ۔ اقبال کی شاعری میں ''کمالِ انسانی'' کا یہ اعلیٰ ترین مظہر رسولِ کریمؐ کی زندگی ہے ۔ حضور کا اسوۂ حسنہ انسان کے لیے بہترین شمع ہدایت ہے ۔ اقبال کی پوری شاعری اپنے ارتقا کے ہر دور میں اسی شمع کے اجالے سے روشن ہے ۔

اقبال کو رسول پاکؐ کی ذاتِ اقدس سے جو والہانہ عشق ہے ، آس کا اظہار آن کی اردو اور فارسی شاعری کے ہر دور میں ہوتا رہا ہے ۔ اردو میں ''بانگِ درا'' اور ''ارمغانِ حجاز'' تک

اور فارسی میں ''اسرار و رموز'' سے ''پس چہ باید کرد'' اور ''ارمغانِ حجاز'' کے حصۂ فارسی تک کوئی مجموعۂ کلام ایسا نہیں جہاں اس عشق کا جلوہ نظر نہ آتا ہو ۔ اس جلوے کے انداز اور رنگ البتہ ہر جگہ ایک سے نہیں ۔

''بانگِ درا'' کے دور اول میں کہ یہاں اقبال کی شاعری کا موضوع وطن اور وطنیت ہے ، اپنی ایک نظم ''بلال''* میں اقبال نے بڑی حسرت سے یہ بات کہی ہے :

خوشا وہ وقت کہ یثرب مقام تھا اس کا
خوشا وہ دور کہ دیدار عام تھا اس کا

یورپ سے واپسی کے بعد شاعری میں کہ یہاں ملت اسلامیہ کے احوال و کوائف ، اقبال کا موضوع ہیں ، انھوں نے ایسی نظمیں بھی لکھیں جو فنی اعتبار سے نعتیں تو نہیں ہیں ، لیکن ان میں رسول اللہ ؐ کی محبت شعر کا موضوع بنی ہے اور ایسی نظمیں بھی جو اپنے مزاج میں روایتی نعتوں سے مماثل ہیں اور ان میں وہی مضامین نظم کیے گئے ہیں جو ہماری نعتوں میں عام ہیں ، لیکن ان مضامین میں بھی جذبۂ محبت کی سرشاری ہر جگہ موجود ہے - اسی طرح کی ایک نعت سنیے :

[یہ نعت گائی جائے :]

حشر میں ابر شفاعت کا گہربار آیا
دیکھ اے جنسِ عمل تیرا خریدار آیا

---

*بانگ درا ، لاہور ، جون ۱۹۷۵ء ، ص ۸۰ - ۸۱ -

لطف آنے کا تو جب ہے کہ کسی پر آئے
ورنہ دل اپنا بھی آنے کو تو سو بار آیا

میں نے سو گلشنِ جنت کو کیا اس پہ نثار
دشتِ یثرب میں اگر زیرِ قدم خار آیا

لیں شفاعت نے قیامت میں بلائیں کیا کیا
عرقِ شرم میں ڈوبا جو گنہ گار آیا

ہے ترے عشق کا مے خانہ عجب مے خانہ
یعنی ہشیار گیا اور میں سرشار آیا

اس نعت کے مضامین آپ نے ملاحظہ کیا کہ رسمی سے ہیں، لیکن اسی دور میں ایسی نعتیں بھی ہیں، جن میں محبت کی سرشاری نے تخاطب کا انداز اختیار کیا ہے اور اللہ کے اس رسول ؐ کو جو رحمت اللعالمین ؐ ہے، اپنی امیدوں کا آخری سہارا سمجھ کر، امت کے ہر دکھ کے لیے نسخۂ کیمیا طلب کیا ہے:

[اس جگہ یہ نعت گائی جائے]

قوم کو جس سے شفا ہو وہ دوا کون سی ہے
یہ چمن جس سے ہرا ہو وہ صبا کون سی ہے

جس کی تاثیر سے یک جان ہو امت ساری
ہاں بتادے ہمیں وہ طرزِ وفا کون سی ہے

جس کے ہر قطرے میں تاثیر ہو یک رنگی کی
ہاں بتادے وہ مئے ہوش ربا کون سی ہے

قافلہ جس سے رواں ہو سوئے منزل اپنا
ناقہ وہ کیا ہے ، وہ آوازِ درا کون سی ہے

سب کو دولت کا بھروسا ہے زمانے میں مگر
اپنی اُمید یہاں تیرے سوا کون سی ہے

اقبال کے لیے عشقِ رسول ؐ کی اگلی منزل وہ ہے جب اقبال کو کائنات کی ہر چیز میں عشق کی کارفرمائی نظر آتی ہے اور وہ یقین کے لہجے میں یہ اعلان کرتے ہیں کہ :

عشق دمِ جبرئیل ؑ ، عشق دلِ مصطفٰی ؐ
عشق خدا کا رسول ، عشق خدا کا کلام

یہی دور ہے جس میں اقبال نے نامِ مصطفٰی ؐ کو آبروئے مسلم کہا ہے :

در دلِ مسلم مقامِ مصطفٰی ؐ است
آبروئے ما زِ نامِ مصطفٰی ؐ است

اور اسی لیے اقبال کا پیغام یہ ہے کہ اپنے آپ کو مصطفٰی تک پہنچاؤ کہ یہی سچی دین داری ہے :

بمصطفٰی ؐ برساں خویش را کہ دین ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی ست

اس دور میں اقبال نے جتنی نظمیں لکھیں وہ اُن کی حکمتِ دینی کا خلاصہ ہیں - ان نظموں میں جس طرح اقبال نے زندگی کے رازہائے سربستہ کے رخ سے پردے اُٹھائے ہیں ، عشقِ رسول ؐ کا جو پیرایہ اختیار کیا ہے ، وہ سر تا سر حکمت و فلسفہ ہونے کے علاوہ ہمہ شوق اور ہمہ جذب و مستی ہے - ''بالِ جبریل'' کی مقبول و معروف نظم ''ذوق و شوق'' کا ایک بند یوں ہے :

[اس جگہ نظم کا یہ بند تحت اللفظ پڑھا جائے]

لوح بھی تو ، قلم بھی تو ، تیرا وجود الکتاب
گنبدِ آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب
عالمِ آب و خاک میں تیرے ظہور سے فروغ
ذرۂ ریگ کو دیا تو نے طلوعِ آفتاب

شوکتِ سنجر و سلیم تیرے جلال کی نمود
فقرِ جنید و بایزید تیرا جمالِ بے نقاب
شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام
میرا قیام بھی حجاب ، میرا سجود بھی حجاب

تیری نگہِ ناز سے دونوں مراد پا گئے
عقل غیاب و جستجو ، عشق حضور و اضطراب

''تیری نگہِ ناز سے دونوں مراد پا گئے'' - - - - یہی نگہِ ناز ہے کہ جب اقبال زمانے کو کشمکش میں مبتلا دیکھتے ہیں تو اسی نگہِ ناز

کے اشاروں کے منتظر ہوتے ہیں۔ ایک ایسی دنیا میں کہ دیدۂ امکان اپنے نور سے محروم ہوگیا ہے اور اقوامِ عالم میں شورش برپا ہے، اقبال ایک مردِ منتظر کو آواز دیتے ہیں۔ اُس مردِ منتظر کو جو عالم کے لیے رحمت بن کر آنے والا ہے اور اُس مردِ منتظر کو جس نے رسولِ مقبول ؐ کے اسوۂ حسنہ کو اپنا شعار بنایا ہے۔ مستقبل کے اسی انسان کو اقبال نے یہ کہہ کر آواز دی ہے:

اے سوارِ اشہبِ دوراں بیا
اے فروغِ دیدۂ امکاں بیا

[اس شعر کے ساتھ ساتھ آواز ملاتے ہوئے
یہ نظم ترنم سے گائی جائے]

اے سوارِ اشہبِ دوراں بیا
اے فروغِ دیدۂ امکاں بیا

رونقِ ہنگامۂ ایجاد شو
در سوادِ دیدہ‌ہا آباد شو

شورشِ اقوام را خاموش کن
نغمۂ خود را بہشتِ گوش کن

خیز و قانونِ اخوت ساز دہ
جامِ صہبائے محبت باز دہ

باز در عالم ببار ایامِ صلح
جنگجویان را بده پیغامِ صلح

نوعِ انسان مزرع و تو حاصلی
کاروانِ زندگی را منزلی

[نظم کے آخری شعر کی موسیقی کے ساتھ پہلا شعر پس منظر
میں آہستہ آہستہ پڑھا جائے اور اس کے ساتھ fade out ہو]

غزل گو اقبال

(۱)

[۱۲ نومبر ۱۹۷۵ء کو لاہور ٹیلی ویژن سے قومی نشریاتی رابطے پر ٹیلی کاسٹ ہوا ۔]

اقبال بلا شبہ ہمارے عہد کے واحد شاعر ہیں جن کے فکر و فن کا عکس عہدِ حاضر کے اکثر غزل گو شاعروں کی غزل میں نمایاں ہے ، لیکن اقبال کی غزل نے امتیاز کا یہ اعلیٰ مقام سفر کے کئی مرحلے طے کر کے حاصل کیا ہے ۔ غزل کے اس دلکشا سفر کا پہلا مرحلہ وہ ہے جب اقبال نے تقلید اور روایت پسندی کو اپنا مسلک بنایا ، اور انیسویں صدی کے آخر میں غزل کا جو عاشقانہ رنگ مقبول اور محبوب تھا ، اُسی کی پیروی میں غزلیں لکھیں :

تمھارے پیامی نے سب راز کھولے
خطا اس میں بندے کی سرکار کیا تھی

اور ''یہ عاشق کون سی بستی کے یارب رہنے والے ہیں'' جیسی غزلیں اسی مرحلے کی نشانیاں ہیں ۔ اس سے بالکل قریب سفر کا وہ مرحلہ ہے جب غزل کے روایتی مضامین میں کہیں کہیں قومی اور اصلاحی رنگ نمایاں ہونے لگا اور غزل نے خطابت کے لہجے میں باتیں کی ہیں اور دیارِ مغرب کے رہنے والوں سے مخاطب ہو کر

اُن کے مستقبل کے متعلق یہ پیش گوئی کی کہ :

تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خود کشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ، ناپائیدار ہوگا

لیکن جلد ہی وہ مرحلہ بھی آیا ، جب غزل میں ایسے مضامین ، نظم ہونے لگے جو بالآخر اقبال کے مستقل نظامِ فکر کی اساس بنے:

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

جیسے شعر، اقبال کی غزل کے ارتقائی سفر کے اس تیسرے مرحلے کی نشاندہی کرتے ہیں - - - - سفر کا یہ تیسرا مرحلہ ''بانگِ درا'' کے تیسرے دور پر ختم ہوا اور اس کے بعد خاموشی کا ایک طویل مرحلہ آیا جس کا سلسلہ اُس وقت ختم ہوا جب رسالہ ''کاروان'' کے مرتبین کی فرمائش پر اقبال نے اپنی وہ غزل دی جس کے شعر عرصے تک فضا میں گونجتے رہے - وہ غزل یہ تھی :

[اس جگہ یہ غزل گائی جائے]

اپنی جولاں گہ زیرِ آسماں سمجھا تھا میں
آب و گل کے کھیل کو اپنا مکاں سمجھا تھا میں

بے حجابی سے تری ٹوٹا نگاہوں کا طلسم
اک ردائے نیلگوں کو آسماں سمجھا تھا میں

کارواں تھک کر فضا کے پیچ و خم میں رہ گیا
مہر و ماہ و مشتری کو ہم عناں سمجھا تھا میں

عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام
اس زمین و آسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں

تھی کسی درماندہ رہرو کی صدائے دردناک
جس کو آوازِ رحیلِ کارواں سمجھا تھا میں

''سمجھا تھا میں'' والی غزل کا آہنگ ''بانگ درا'' کے تینوں ادوار کی غزلوں کے آہنگ سے مختلف ہے اور یہی آہنگ ہے جس سے اقبال کی غزل کو ہمارے عہد میں ایک منفرد مقام ملا ہے - غزل کی ایمائیت نازک حکیمانہ مطالب کی طرف اشارہ کر رہی ہے اور بیان کے رواجی اسالیب میں کشادگی کے جو امکانات پوشیدہ ہیں وہ آبھر آبھر کر اپنے وجود کی طرف متوجہ کر رہے ہیں - ''بالِ جبریل'' کی سب غزلیں ، جن میں ''سمجھا تھا میں'' والی غزل بھی شامل ہے، حکمت اور تغزل کے اسی امتزاج کی گوناگوں صورتیں ہیں -

اس مرحلے کی ابتدائی غزلوں کا ایک مخصوص موضوع معبود سے عبد کا وہ تخاطب ہے جس میں شاعر انسان کا وکیل بن کر طرح طرح کی شکایتوں کے دفتر کھولتا ہے اور اس سے ''آسماں تیرا ہے یا میرا ؟'' ــ ''اب مرا انتظار کر'' اور ''ترا خرابہ فرشتے نہ کر سکے آباد'' جیسی غزلیں لکھواتا ہے ، لیکن یہی درد ہے جب اقبال انتہائے عجز و نیاز کے عالم میں معبود حقیقی سے یوں مخاطب ہوتے ہیں :

تری بندہ پروری سے مرے دن گزر رہے ہیں
نہ گلا ہے دوستوں کا ، نہ شکایتِ زمانہ

جس غزل میں یہ شعر آیا ہے ، اسے سنیے :

[اس جگہ یہ غزل گائی جائے]

تجھے یاد کیا نہیں ہے مرے دل کا وہ زمانہ
وہ ادب گہِ محبت ! وہ نگہ کا تازیانہ

نہیں اس کھلی فضا میں کوئی گوشۂ فراغت
یہ جہاں عجب جہاں ہے ! نہ قفس نہ آشیانہ

مرے ہم صفیر اسے بھی اثرِ بہار سمجھے
انہیں کیا خبر کہ کیا ہے یہ نوائے عاشقانہ

مری خاک وخوں سے تو نے یہ جہاں کیا ہے پیدا
صلۂ شہید کیا ہے ؟ تب و تابِ جاودانہ

تری بندہ پروری سے مرے دن گزر رہے ہیں
نہ گلہ ہے دوستوں کا ، نہ شکایتِ زمانہ

اقبال کی غزل نے ارتقائی سفر کے اس مرحلے میں جن مضامین کو اپنایا ، ان کے بیان سے تخلیقِ آدم ، شرفِ انسانی اور کائنات میں اس کے مقاصد و مناصب کی داستان مرتب ہوتی ہے ، اور غزل پہلی مرتبہ صحیح معنوں میں انسان اور خدا ، اور انسان اور کائنات

کے رشتوں کو اپنا موضوع بناتی ہے ، لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ ایک خدمت اور بھی انجام دیتی ہے - اس غزل نے ، غزل کی ایمائیت کو ایک نیا مفہوم اور استعارے کو وسعتِ بے پایاں عطا کی - لفظوں کو معنویتِ تازہ بخشی اور معنی و بیان کے ایک نئے رشتے کی طرف اشارہ کیا - چھوٹی بحروں کی غزلیں معنی و بیان کے اس اعجاز کی مثالیں ہیں :

[اس جگہ یہ غزل گائی جائے]

فطرت کو خرد کے روبرو کر
تسخیرِ مقامِ رنگ و بو کر

تو اپنی خودی کو کھو چکا ہے
کھوئی ہوئی شے کی جستجو کر

تاروں کی فضا ہے بیکرانہ
تو بھی یہ مقام آرزو کر

عریاں ہیں ترے چمن کی حوریں
چاکِ گل و لالہ کو رفو کر

بے ذوق نہیں اگرچہ فطرت
جو اس سے نہ ہو سکا ، وہ تو کر

اور یہ معجزہ غیر مردف غزلوں میں اور بھی زیادہ نمایاں ہے :

[اس جگہ یہ غزل گائی جائے]

ہر چیز ہے محوِ خودنمائی
ہر ذرہ شہیدِ کبریائی

بے ذوقِ نمود زندگی موت
تعمیرِ خودی میں ہے خدائی

رائی ، زورِ خودی سے پربت
پربت ، ضعفِ خودی سے رائی

تارے آوارہ و کم آمیز
تقدیرِ وجود ہے جدائی

یہ پچھلے پہر کا زرد رو چاند
بے راز و نیازِ آشنائی

ہیں عقدہ کشا ، یہ خارِ صحرا
کم کر گلۂ برہنہ پائی

خودی کا احساس ، فطرت اور رموزِ فطرت سے انسان کے رشتے کی صحیح نوعیت ، عقل پر عشق کا تفوق ، جدائی کی حقیقت اور آشنائی کی لذت ، وہ چند موضوعات ہیں جنھیں ہمارے دور کے غزل گو نے

اقبال کے اشارے پر اپنایا ہے اور غزل کی رہ و رسم کی منزلوں کی پابندی کرتے ہوئے اسے بہت سی قیدوں سے آزادی دلائی ہے اور ان دونوں چیزوں کی گونج ہمیں فیض ، ندیم ، منیر ، ناصر ، دانش اور حفیظ کی غزلوں میں سنائی دیتی ہے ۔

(۲)

[تحریر : ۲۸ - ۲۹ اکتوبر ۱۹۷۶ء ، پاکستان ٹیلی وژن سنٹر لاہور سے ۹ نومبر ۱۹۷۶ء کو قومی نشریاتی رابطے پر ٹیلی کاسٹ ہوا]

راوی نمبر ۱ :

اقبال مفکر بھی ہیں اور شاعر بھی اور بلاشبہ عظیم مفکر اور عظیم شاعر—اور اردو کے کسی ایک شاعر کو بہ یک وقت ''مفکر شاعر'' اور ''شاعر مفکر'' کے لقب زیب دیتے ہیں ، تو وہ اقبال ہیں ۔ اقبال نے اپنی حکیمانہ فکر کی عظمت سے ہمیں زندگی کا جو مہتم بالشان فلسفہ دیا اس کی بدولت انھیں ''حکیم الامت'' بھی کہا گیا ، ''شاعرِ مشرق'' اور ''شاعرِ انسانیت'' بھی کہ ان کے ہمہ گیر فکر نے امتِ مسلمہ کی رہنمائی بھی کی ، مشرق کو بیداری کا سبق بھی دیا اور انسان کو انسان کے مقام اور مرتبے سے آگاہ کرنے کی خدمت بھی انجام دی ۔

راوی نمبر ۲ :

انسان کو انسان کی عظمت سے آگاہ کرنے کی خدمت ہی ان کے فلسفۂ حیات کی اساس ہے کہ اس اساس کو اقبال نے خودی کا

نام دیا ہے - ''خودی'' کے مفہوم کی تشریح میں اب تک ہزاروں صفحے لکھے جا چکے ہیں - خود اقبال نے بھی اپنے خطبات میں اس کے مطالب کی تشریح و توضیح کی ہے ، لیکن شاعر اقبال ، فلسفی اقبال کا شارح بنا ہے اور جب یہ صورت پیش آئی ہے تو فضا دلکش اور دل نشین نغموں کی گونج سے معمور ہو گئی ہے - اقبال کی ایک غزل میں فلسفہ ، شعر اور نغمے کے سانچے میں ڈھل کر آیا ہے :

خودی وہ بحر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں
تو آبجو اسے سمجھا تو کوئی چارہ نہیں

خودی میں ڈوبتے ہیں ، پھر ابھر بھی آتے ہیں
مگر یہ حوصلۂ مردِ ہیچ کارہ نہیں

ترے مقام کو انجم شناس کیا جانے
کہ خاکِ زندہ ہے تو تابعِ ستارہ نہیں

یہیں بہشت بھی ہے حور و جبرئیل بھی ہے
تری نگہ میں ابھی شوخیِ نظارہ نہیں

مرے جنوں نے زمانے کو خوب پہچانا
وہ پیرہن مجھے بخشا کہ پارہ پارہ نہیں

راوی نمبر ۱ :

اقبال نے جس چیز کو جنوں کہا ہے ، اسی کا دوسرا نام آن کی شاعری میں ''عشق'' ہے کہ وہ طلب ، آرزو اور جستجو کا

محرک ہے - وہ حیات بخش بھی ہے اور حیات نما بھی - عشق ہی ہے کہ وہ خود شناسی اور خود آگہی کی راہ دکھاتا ہے اور خودی کے احساس کو تقویت پہنچا کر اسے ہر آن ایک جہانِ تازہ کی تخلیق کی دعوت دیتا ہے - غلاموں کے سینے میں بھی عشق کا یہ شعلہ روشن ہو تو نگاہیں کاشفِ اسرار بن جاتی ہیں :

جب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگہی
کھلتے ہیں غلاموں پر اسرارِ شہنشاہی !

نومید نہ ہو ان سے اے رہبرِ فرزانہ
کم کوش تو ہیں لیکن بے ذوق نہیں راہی

دارا و سکندر سے وہ مردِ فقیر اولیٰ
ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد اللہی

آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی !
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

راوی نمبر ۲ :

عشق ، خودی اور خود آگہی کی راہ دکھاتا ہے تو فقر میں شانِ اسد اللہی پیدا ہو جاتی ہے اور خودی کے نشے سے سرشار ہو کر حق کے یہ دیوانے حق گوئی اور بے باکی کو اپنا شعار اور وظیفہ بناتے ہیں ، اور آن کی نظر میں رہ و رسم کجکلاہی بے حقیقت بن جاتی ہے اور طریقِ خانقاہی اس کی نکتہ چینی کا نشانہ بن جاتا ہے - ایک غزل میں اقبال نے بادِ صبح گاہی کو ایک پیغام کا

وسیلہ بناتے ہوئے ، دل نشیں شاعرانہ زبان میں بہت سے اسرار کے رخ سے پردہ اٹھایا ہے :

یہ پیام دے گئی ہے مجھے بادِ صبح گاہی
کہ خودی کے عارفوں کا ہے مقام پادشاہی

تری زندگی اسی سے ، تری آبرو اسی سے
جو رہی خودی تو شاہی ، نہ رہی تو روسیاہی

مرے حلقۂ سخن میں ابھی زیرِ تربیت ہیں
وہ گدا کہ جانتے ہیں رہ و رسمِ کجکلاہی

یہ معاملے ہیں نازک جو تری رضا ہو تو کر
کہ مجھے تو خوش نہ آیا یہ طریقِ خانقاہی

راوی نمبر ۱ :

اقبال کا فلسفہ زندگی کا ہمہ جہت فلسفہ ہے - ان کا فلسفۂ خودی ، تصورات کا ایک سلسلہ ہے ، جو خودشناسی ، خود آگاہی اور عرفانِ ذات کے اس سفر میں اس طرح چلتا رہتا ہے کہ حکیمانہ تصورات ہمارے شب و روز کے معمولات کا احاطہ کر لیتے ہیں ، اور خودی ، عشق ، آرزو ، سخت کوشی اور عمل کے سیدھے سادھے لفظوں سے ایک ایسا جہانِ معنی تعمیر ہوتا ہے جو ہمارے قلب اور ذہن کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے - سیدھے سادھے لفظوں میں جادو کی یہ تاثیر ، اقبال کے اس ذوقِ نغمہ نے پیدا کی ہے جو غزل کی روایت کا ایک جزو ہے :

مجھے آہ و فغانِ نیم شب کا پھر پیام آیا
تھم ، اے رہرو کہ شاید پھر کوئی مشکل مقام آیا

یہ مصرع لکھ دیا کسی شوخ نے محرابِ مسجد پر
یہ ناداں گر گئے سجدوں میں جب وقتِ قیام آیا

چل اے میری غریبی کا تماشا دیکھنے والے
وہ محفل آٹھ گئی جس دم ، تو مجھ تک دورِ جام آیا

دیا اقبال نے ہندی مسلمانوں کو سوز اپنا
یہ اک مردِ تن آساں تھا ، تن آسانوں کے کام آیا

اسی اقبال کی میں جستجو کرتا رہا برسوں
بڑی مدت کے بعد آخر وہ شاہیں زیرِ دام آیا

راوی نمبر ۲ :

وہی لفظ ، وہی علامت ، وہی استعارہ اور وہی رمزیت جس نے غزل کو اردو کی سب سے مقبول صنف بنایا ، جب اقبال کے ہاتھ میں آئی تو ان میں سے ہر ایک کو نیا مفہوم ملا - یہ سیدھی سادھی چیزیں زندگی کے اس فلسفے کی ترجمان بنیں جو انسان کی عظمت ، فضیلت اور برتری کا فلسفہ ہے ، طلب آرزو اور جستجو کا فلسفہ ہے ، بیداری اور انقلاب کا فلسفہ ہے اور انفرادی اور اجتماعی زندگی میں بہترین اقدار کی پیروی اور فروغ کا فلسفہ - اس فلسفے کو اقبال نے غزل کے اس سارے حسن و جمال اور دل آویزی کے ساتھ پیش کیا ہے جس کا خواب غالب اور حالی نے دیکھا تھا -

لیکن اردو غزل کو وہ مقام دے کر جو اُسے کبھی نہیں ملا تھا ، اس انکسار سے کام لیا ہے ، جس سے اُن کی عظمت کا نقش اور بھی اُبھر کر سامنے آتا ہے :

نگاہِ فقر میں شانِ سکندری کیا ہے
خراج کی جو گدا ہو وہ قیصری کیا ہے

فقط نگاہ سے ہوتا ہے فیصلہ دل کا
نہ ہو نگاہ میں شوخی تو دلبری کیا ہے

اسی خطا سے عتابِ ملوک ہے مجھ پر
کہ جانتا ہوں مآلِ سکندری کیا ہے

خوش آ گئی ہے جہاں کو قلندری میری
وگرنہ شعر مرا کیا ہے ، شاعری کیا ہے

اضافات

۱ - ”اقبال کی شخصیت اور شاعری“ پر ایک نظر

۲ - اقبال اور سوزِ غمِ ملت

۳ - انیس اور اقبال

۴ - شذرات ــــ متعلق بہ اقبال

۵ - Iqbal : Poet and Philosopher

''کتاب کا بیشتر حصہ چھپ چکا تھا کہ اقبال سے متعلق وقارعظیم صاحب کی بعض اور نگارشات دسترس میں آئیں۔ انھیں کتاب کے متعلقہ حصوں میں کھپانے کا وقت نکل چکا تھا اس لیے ''اضافات'' کا عنوان قائم کر کے انھیں آخرِ کتاب میں یک جا کر دیا گیا ہے۔''

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن

''اقبال کی شخصیت اور شاعری''

''علامہ اقبال کی شخصیت اور شاعری'' پر پروفیسر حمید احمد خاں کے مقالات کو مجموعے کی صورت میں شائع کر کے[1] ''بزم اقبال'' نے اقبالیات میں ایک نئی جہت کا اضافہ کیا ہے اور وہ نئی جہت یہ ہے کہ اقبال کے کلام اور پیغام پر متوازن اور منصفانہ اظہارِ رائے کے لیے پروفیسر حمید احمد خاں کا ما علمی تبحر ناگزیر تھا ۔ یہ کہہ کر میں اقبال کی تنقید اور تحقیق پر کوئی پابندی عائد نہیں کر رہا ہوں ، میں سمجھتا ہوں کہ یہ سبھی کا حق ہے کہ وہ اقبال کے مطالعے کے بعد اپنے تأثرات کا اظہا کریں ۔

میں صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اگر اقبال کے ساتھ انصاف کرنا مقصود ہو تو اُن علوم پر حاوی ہونا ضروری ہے جن میں اقبال کو شغف تھا اور جو اُس کے کلام کے دکھائی نہ دینے والے مگر بہت شدت سے محسوس ہونے والے پس منظر کا کام دیتے ہیں ، اور اس سے اقبال کے ہاں الفاظ کے مروجہ مفاہیم تک بدل جاتے ہیں ۔ یہ ایک سبب ہے کہ روایت کے پرستاروں کو اقبال کی تفہیم اور تحسین میں دقت محسوس ہوتی ہے ۔

---

۱ ۔ ''اقبال کی شخصیت اور شاعری'' (مجموعہ مقالات) پروفیسر حمید احمد خاں ۔
مطبوعہ : بزمِ اقبال ، لاہور ، اکتوبر ۱۹۷۳ء صفحات ۱۹۳ ۔

پروفیسر حمید احمد خاں کے بعض ارشادات اور نتائج سے اختلاف بھی کیا جا سکتا ہے، مگر اس حقیقت سے کسی کو مجالِ انکار نہیں ہو سکتی کہ خاں صاحب مرحوم نے ادبی تنقید اور تحسین کے معاملے میں دیانتِ فکر، اور صرف دیانتِ فکر کو اپنا معیار ٹھہرایا ہے۔ مجموعے میں کوئی بھی مقام ایسا نہیں ہے جہاں قاری یہ سوچ کر ٹھٹھکے کہ مصنف اس پر اپنی رائے مسلط کر رہا ہے۔ کوئی بھی نکتہ ہو خاں صاحب اسے اپنے علم اور ذوق کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں اور نتائج کو غیر مبہم انداز میں اور اتنی وضاحت سے بیان کرتے ہیں کہ جیسے وہ قاری کو سامانِ غور و فکر اور تعقل مہیا کرنے کے بعد ایک طرف ہٹ کر کھڑے ہوگئے ہیں۔

یہ اندازِ تنقید ابھی ہمارے ہاں رواج نہیں پا سکا کہ ادب پارے کو ناوابستگی (detatchment) سے پرکھا جائے۔ بلاشبہ اس میں مصنف کے اپنے نظریات و تعصبات اس سے الگ نہیں کیے جا سکتے کہ ہر شخص کا اپنا ایک نقطۂ نظر ہوتا ہے اور ہونا بھی چاہیے مگر اس نظریے کو قاری کے سر پر گرز کی طرح دے مارنے اور اسے قاری کے سامنے ایک کلی کی طرح چٹکا دینے میں بڑا فرق ہے اور پروفیسر حمید احمد خاں تنقید میں کلیاں ہی چٹکاتے ہیں، گرز نہیں چلاتے!

اس کتاب کے دو حصے ہیں۔ پہلا حصہ، علامہ اقبال کی شخصیت کے بعض پہلوؤں سے متعلق ہے۔ اس سے قبل پروفیسر حمید احمد خاں نے غالب کی شخصیت کے بارے میں تلاش اور تحقیق کا جس طرح حق ادا کیا تھا، اس سے سب واقف ہیں۔ اس مقصد کے لیے انھیں طویل سفر اختیار کرنے پڑے اور انھوں نے

بعض ایسے افراد کو ڈھونڈ نکالا جنھوں نے غالب کے روز و شب پر نئی روشنی ڈالی[1] مگر علامہ اقبال کی شخصیت کے بارے میں خاں صاحب مرحوم کی تحقیق کی خصوصیت یہ ہے کہ جو کچھ انھوں نے لکھا ہے وہ علامہ کے ساتھ بالمشافہ گفتگو کر کے اور ان کے بالکل قریب بیٹھ کر ان کے خصائل اور ان کے افکار کے گہرے اور عقیدت مندانہ مطالعے کا نتیجہ ہے ۔

ان مضامین میں علامہ کی سیرت پر بالکل نئی روشنی پڑتی ہے ، کیوں کہ یہ مقالات لکھنے والا علامہ کا نہ صرف ایک عقیدت مند ہے بلکہ ایک ایسی شخصیت ہے جسے اپنے دور کے اہل علم اکابر میں شمار کرتے ہیں ۔

کتاب کا دوسرا حصہ علامہ کی شاعری کے متعلق ہے ۔ ان تنقید نگاروں کو ان چھ مقالات[2] کا مطالعہ نہایت غور اور تأمل سے

---

۱ - ان طویل سفروں کی تفصیل کے لیے دیکھیے پروفیسر حمید احمد خاں کے بعض مکاتیب مشمولہ :
(i) نقوش ، لاہور ، خطوط نمبر ۳ ، ص ۳۱۳ -
(ii) فاران ، مجلہ اسلامیہ کالج سول لائنز ، لاہور ، یادگار نمبر مارچ ۱۹۷۵ع ، ص ۱۸۸-۱۹۹ -

۲ - اقبال کی شاعری سے متعلق پروفیسر حمید احمد خاں کے محولہ چھ مقالات کے عنوانات یہ ہیں :
(۱) اقبال کا شاعرانہ ارتقا ، مشمولہ : اقبال کی شخصیت اور شاعری، ص ۶۵-۸۰ -
(۲) علامہ اقبال کا انتخابِ بیدل ، ایضاً ، ص ۸۱-۱۰۴ -
(۳) اقبال اور انگریزی شعراء ، ایضاً ، ص ۱۰۵-۱۲۰ -
(۴) شعر اقبال میں فنکاری کا عنصر ، ایضاً ، ص ۱۲۱-۱۴۰ -
(۵) اقبال کا نظامِ فکر ، ایضاً ، ص ۱۴۱-۱۵۶ -
(۶) The Universal Note in Iqbal's Poetry ، ایضاً ، ص ۱۵۷-۱۷۷ -

کرنا چاہیے جو اقبال پر قلم برداشتہ لکھنے کے عادی ہیں اور جو اقبال کے فنی پہلو یا کسی نظریاتی نکتے پر لکھنے سے پہلے اس موضوع پر ایک عبور حاصل کرنا ایسا ضروری نہیں سمجھتے - خان صاحب مرحوم نے اقبال کے فکر و فن اور خاص طور پر اقبال کی آفاقیت پر جو کچھ لکھا ہے وہ اس نابغہ روزگار کے کلام اور پیام کی صحیح تحسین کے لیے اہم ہی نہیں ، بلکہ ناگزیر ہے - اب اقبال کا کوئی بھی مطالعہ پروفیسر حمید احمد خاں مرحوم کے ان مقالات کے حوالے کے بغیر نامکمل قرار پائے گا -

ہمارے ہاں یہ رسم چل پڑی ہے کہ ہم اقبال کو صرف آن کے خطبۂ الٰہ آباد کے حوالے سے مفکرِ پاکستان قرار دیتے ہیں حالانکہ ان کے پورے اردو فارسی کلام بلکہ ان کے خطبات میں بھی نظریۂ پاکستان کی رو یہاں سے وہاں تک چلتی نظر آتی ہے -

خان صاحب مرحوم کے ان مقالات میں علامہ کے کلام کے حوالے سے نظریۂ پاکستان کا جس طرح ذکر آیا ہے وہ آج کے محبِ وطن نقادوں کو دعوتِ فکر و تحسین دیتا ہے - امید کرنی چاہیے کہ مرحوم کے ان مقالات سے جو چراغ روشن ہوئے ہیں ، ان سے نئی مشعلیں جلائی جائیں گی اور اس طرح علامہ اقبال کے فکر و فن کی نئی پرتیں کھلیں گی - بڑا شاعر ہر دور میں سچا ثابت ہوتا ہے ، لیکن ہم نے علامہ اقبال کے پیغام کو اس دور میں بھی ، یعنی علامہ کے اپنے دور میں بھی ، ابہام اور الجھن کا ہدف بنا رکھا ہے - پروفیسر حمید احمد مرحوم کی اس تصنیف سے اس ابہام اور ان الجھنوں کو حتمی طور پر ختم کر دینے کا نہایت مبارک آغاز ہوا ہے -

اقبال اور سوزِ غمِ ملت

اقبال نے اپنے ایک خط میں مولانا سلیمان ندوی کو یہ الفاظ لکھے تھے :

''دنیائے اسلام اس وقت ایک روحانی پیکار میں مصروف ہے - اس پیکار و انقلاب کا رخ متعین کرنے والے قلوب و اذہان پر شک و ناامیدی کی حالت کبھی کبھی پیدا ہو جاتی ہے''-

یہ خط ستمبر ۱۹۲۴ء میں لکھا گیا تھا ، لیکن اس میں دنیائے اسلام کی جس پیکار کی طرف اشارہ ہے اس کا آغاز حقیقت میں انیسویں صدی کے آخر میں ہو چکا تھا ، اور انیسویں صدی کے آخر ہی سے ایسی شخصیتیں ظاہر ہونی شروع ہو گئی تھیں جنھوں نے شک اور ناامیدی کے اندھیروں میں یقین اور امید کی شمعیں روشن کرنے کی خدمت اپنے ذمے لی - اقبال بھی دنیائے اسلام کے ان برگزیدہ افراد کے سلسلے کی ایک کڑی ہیں جنھوں نے ''پیکار'' اور ''انقلاب'' کا رخ متعین کرنے کو اپنا وظیفۂ حیات بنایا - دنیائے اسلام کا غم ، جسے دوسرے لفظوں میں ملت کا غم کہنا چاہیے ، اس وقت بھی اقبال کے فکر و احساس کا شریک تھا ، جب انھوں نے پہلے پہل مسلمانوں کی دنیا کو موضوع سخن بنایا تھا - بانگ درا کے حصہ سوم کی پہلی نظم ''بلاد اسلامیہ'' کے پہلے ہی شعر سے غم کی یہ کرن پھوٹتی دکھائی دیتی ہے :

سرزمیں دلی کی مسجودِ دلِ غم دیدہ ہے
ذرے ذرے میں لہو اسلاف کا خوابیدہ ہے

اور دلی سے دور بغداد ، حجاز ، قرطبہ ، قسطنطنیہ ، فارس اور شام کہ جو اب عظمت اسلام کی خانقاہیں ہیں ، اُن کی آنکھوں میں پھر جاتے ہیں اور پھر اس نظم کے چند صفحوں بعد آنے والی نظم ''گورستان شاہی'' اقوام کی زندگی کی بے اعتباری کے نقشے دکھا کر دل کو غم ملت میں مبتلا کرتی ہے اور قلم دل گداختہ کے احساس کی ترجمانی یوں کرتا ہے :

اس نشاط آباد میں گو عیش بے اندازہ ہے
ایک غم ، یعنی غمِ ملت ہمیشہ تازہ ہے

اس غمِ ملت نے اور آگے چل کر زیادہ واضح صورت اختیار کی اور اقبال نے یاد ماضی کے حرم سے باہر قدم رکھ کر حال کی زندگی کو اپنے فکر و تخیل کی جولانگاہ بنایا اور تدبیر کی عقدہ کشائی زخم دل کا مداوا بن کر سامنے آئی - ضرب کلیم کی ایک نظم ''دام تہذیب'' میں اقبال نے غم ملت کی خلش کا حال یوں بیان کیا ہے :

جلتا ہے مگر شام و فلسطیں پہ مرا دل
تدبیر سے کھلتا نہیں یہ عقدۂ دشوار

ترکانِ جفا پیشہ کے پنجے سے نکل کر
بے چارے ہیں تہذیب کے پھندے میں گرفتار

غم کا یہ احساس حقیقت پسندانہ ہے اور اس غم سے مختلف

جس میں ایک خاص طرح کی رومانی سرشاری ہے - ماضی کی مدح سرائی یا مرثیہ‌خوانی میں جو لذت اور گداز ہے ، اقبال اس کا رشتہ حال کی صداقتوں سے جوڑنا چاہتے ہیں کہ صرف اسی طرح احساس کو پیکار اور پیکار کو انقلاب کی صورت دی جا سکتی ہے - ان کی نظر صرف شام و فلسطین پر نہیں ، ان کی چشم نگراں نے دنیائے اسلام کے چپے چپے کا جائزہ لیا اور پردوں میں چھپی ہوئی حقیقت کو آشکارا کیا ہے - ''پیام مشرق'' کی پہلی نظم ''پیش کش'' میں اقبال امیر امان اللہ خان کے سامنے اسلامی دنیا کا نقشہ یوں پیش کرتے ہیں :

دیدہ ای اے خسروِ کیوان جناب
آفتاب ما توارت بالحجاب

ابطحی در دشتِ خویش از راہ رفت
از دمِ او سوزِ الا اللہ رفت

مصریان افتادہ در گردابِ نیل
سست رگ تورانیانِ ژندہ پیل

آلِ عثمان در شکنجِ روزگار
مشرق و مغرب ز خونش لالہ‌زار

عشق را آئینِ سلمانی نماند
خاکِ ایران ماند و ایرانی نماند

سوز و سازِ زندگی رفت از گلش
آن کہن آتش فسرد اندر دلش

مسلمِ ہندی شکم را بندۂ
خود فروشے ، دل ز دین بر کندۂ

در مسلماں شانِ محبوبی نماند
خالد و فاروق و ایوبی نماند

یہی خیال کبھی کبھی شاعری کے پیکر میں جلوہ گر ہوتا ہے تو اس کا یہ رنگ ہوتا ہے :

ساقیِ دیرینہ را ساغر شکست
بزمِ رندانِ حجازی بر شکست

(اسرار ؛ ۷۹)

ہوائے تند کی موجوں میں محصور
سمرقند و بخارا کی کفِ خاک

(تاتاری کا خواب ، بال جبریل)

در عجم گردیدم و ہم در عرب
مصطفٰی نایاب و ارزاں بولہب

(پس چہ باید کرد . . .)

اور پھر روحِ محمد (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) سے مخاطب ہو کر ،

غم ملت سے پیدا ہونے والے درد کی کیفیت بیان کرنے کا یہ دل گداز انداز :

شیرازہ ہوا ملتِ مرحوم کا ابتر
اب تو ہی بتا ، تیرا مسلماں کدھر جائے

وہ لذتِ آشوب نہیں بحرِ عرب میں
پوشیدہ جو ہے مجھ میں وہ طوفاں کدھر جائے

ہر چند ہے بے قافلہ و راحلہ و زاد
اس کوہ و بیاباں سے حدی خواں کدھر جائے

اس راز کو اب فاش کر اے روحِ محمدؐ!
آیاتِ الٰہی کا نگہباں کدھر جائے!
(ضرب کلیم)

اور کبھی کبھی یہ درد آہ بن کر نکلتا ہے اور ہر طرف ایک دل دوز چیخ سنائی دیتی ہے :

ملتِ ختمِ رسلؐ شعلہ بہ پیراہن ہے

اقبالؒ نے مصر و شام و عراق اور ہند و ایران و توران کے نام لے لے کر ان کی ابتری اور پریشاں روزگاری پر جو اشک افشانی کی ہے اس کی تحریک اس احساس کے تحت ہوئی ہے کہ ملتِ اسلامی کا شیرازہ ابتر ہے اور یہ ابتری اور پراگندگی فنا کا پیش خیمہ ہے اور اس لیے اقبال کی آرزوؤں کا مرکز و محور ملت کی

شیرازہ بندی ہے - یہی آرزو ہے جس نے ان کی زبان سے یہ بات نکلوائی :

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاک کاشغر

لیکن اقبال کے دل کی آواز محض حرفِ آرزو بن کر مطمئن نہیں ہو جاتی - اقبال کی بصیرت نے اسے آگاہ کیا ہے کہ یہ حرفِ آرزو ، یہ جذبہ اور یہ احساس جب تک کسی منطق کا پابند نہ ہو نتیجہ خیز نہیں اور منطق کا تقاضا ہے کہ آرزو کے حصول کی راہ متعین کرنے سے پہلے یہ فیصلہ کرے کہ غم آرزو کا سبب کیا ہے ؟ کہ جب تک سبب کا سراغ لگا کر اس کی بیخ کنی نہ کی جائے سفر آرزو کی راہیں مسدود رہیں گی - اقبالؒ نے یہ سفرِ آرزو جن مرحلوں سے گزر کر طے کیا ان کی نشان دہی ان کے کلامِ نثر و نظم سے ہوتی ہے -

اقبال نے اپنے ایک مضمون (جغرافیائی حدود اور مسلمان) میں مسلمانوں کی ملی ابتری اور انتشار کے اسباب کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :

''مجھ کو یورپین مصنفوں کی تحریروں سے ابتدا ہی سے یہ بات اچھی طرح معلوم ہو گئی تھی کہ یورپ کی ملوکانہ اغراض اس امر کی متقاضی ہیں کہ اسلام کی وحدتِ دینی کو پارہ پارہ کرنے کے لیے اس سے بہتر کوئی حربہ نہیں کہ اسلامی ممالک میں فرنگی نظریۂ وطنیت کی اشاعت کی جائے''۔

(مقالاتِ اقبال ، صفحہ ۲۲۲)

یہی بات شعروں میں اس طرح کہی گئی ہے :

مردِ مغرب آن سراپا فکر و فن
اہلِ دین را داد تعلیمِ وطن
(فلک عطارد ، جاوید نامہ)

تفریقِ ملل حکمتِ افرنگ کا مقصود
اسلام کا مقصود فقط ملتِ آدم[۴]
(مکہ اور جینوا - ضرب کلیم)

دوسرے شعر میں جو چیز ''حکمتِ فرنگ'' ہے پہلے شعر میں اس کا نام ''فکر و فن'' ہے اور اس حکمت نے اپنی فلاح اس میں دیکھی ہے کہ ''اہل دین'' کو اس روش سے برگشتہ کیا جائے جو ان کے درمیان وجہِ اشتراک و اتحاد ہے - مسلمانوں کا اتحاد مغربی سیاست کے پیروں کی کڑی زنجیر ہے کہ جب تک یہ زنجیر نہ کٹے سفر کی ہر منزل کھوٹی ہے - مغربی سیاست نے اس اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کے لیے جو جال بچھایا ہے اس کا نام 'وطن' رکھا ہے - اس جال کے روپہلے سنہرے حلقوں میں ایسی کشش ہے کہ جو ان حلقوں کو دیکھتا ہے ان کی طرف کھنچا چلا جاتا ہے - یہی صورت مسلمان کے ساتھ پیش آئی - جال نے اسے اپنی طرف کھینچا ، صید اس کی طرف کھنچتا چلا گیا اور دام نے صید کو اپنی گرفت میں لے لیا - مسلمان کی زندگی اس دام بلا میں پھنسنے سے پہلے جس کشمکش میں گزری اس کی طرف اقبال نے یوں اشارہ کیا ہے :

در ضمیرِ ملتِ گیتی شکن
دیدہ‌ام آویزشِ دین و وطن

اور گرفتاری کی زندگی کے آغاز کے بعد اس کی جو کیفیت ہے اس کا نقشہ اس شعر میں کھینچا گیا ہے :

مردِ حر افتاد در بندِ جہات
با وطن پیوست و از یزدان گسست

دین اور وطن کی اس آویزش میں 'وطن' کے دو مفہوم ہیں : ایک مفہوم وہ جس کی سند ارشاد نبی کریم (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) ہے اور دوسرا مفہوم وہ جو ''گفتار سیاست'' نے اس لفظ کو دیا ہے :

گفتارِ سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
ارشادِ نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے

اور ''گفتار سیاست'' کے دیے ہوئے اس خاص مفہوم نے 'وطن' کے لفظ کو ایک ایسے صنم کی علامت بنا دیا جس کی پرستش کرنے والے اللہ کی راہ سے بھٹک جاتے ہیں اور اس صنم کے پجاری اپنے آپ کو جس پیرہن میں ملبوس کرتے ہیں وہ مذہب کا کفن بن جاتا ہے :

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

مغربی سیاست جس کا دوسرا روپ تہذیب نوی ہے ، جب اپنا جلوہ عام کرتی ہے تو انتشار اور افتراق کی آندھیاں چلتی ہیں اور دین کی جڑیں کھوکھلی ہونے لگتی ہیں :

اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اس سے
قومیتِ اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

اقبال نے مغرب کے نظریۂ وطنیت کے سیاسی مقاصد کی وضاحت کرتے ہوئے اپنے کلام میں ان نتائج کی نشان دہی بھی کی ہے جو اس نظریے کی مقبولیت اور رواج سے ظہور پذیر ہوں گے اور اپنے خیال کا اظہار کرتے وقت بات پیشین گوئی کے انداز میں کہنے کے بجائے اس طرح کہی ہے کہ اُن کے الفاظ میں ایک محکم اور مستقل کلیے کا سا زور پیدا ہو گیا ہے۔ اُن کے لہجے میں نہ تذبذب ہے نہ جھجک۔ وہ حکم لگاتے ہیں کہ:

جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

اور:

قومیتِ اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

اسی طرح کا یقین اور تحکم اس مصرعے میں ہے:

بنا ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے

لہجے کا تیقن و تحکم اس غور و فکر اور غور و فکر سے پیدا ہونے والی اس منطق کا نتیجہ ہے جو حقائق کی اصلیت کا تجزیہ کرکے ان کے درمیان اسباب و علل کا رشتہ جوڑتی اور نتائج اخذ کرتی ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اقبال کی فکری دور بینی اور ان کے منطقی استدلال نے بھی اخذ نتائج کے بعد جو حکم لگائے تھے عملی زندگی میں وہ اسی شکل و صورت میں رونما ہوئے جیسے کہ اقبال کے دور رس تخیل نے انھیں دیکھا تھا۔ اقبال کی شاعری کے ہر دور میں ہمیں اس طرح کے شعر ملتے ہیں جن میں انھوں نے مسلمانوں کی اس حالت کی نقشہ کشی کی ہے جس میں وطنیت کے

مغربی تصور کو اپنا لینے کے بعد وہ مبتلا نظر آتے ہیں۔ اسرار خودی کے دو شعروں میں مسلمانوں کی عام حالت کا بیان یوں ہوا ہے :

آن چنان قطعِ اخوت کردہ‌اند
بر وطن تعمیرِ ملت کردہ‌اند

تا وطن را شمعِ محفل ساختند
نوعِ انسان را قبائل ساختند

پیش گوئی کرتے وقت اور حکم لگاتے وقت اقبال نے اپنی بات فعل حال میں کہی تھی اور اس پیش گوئی کے نتائج کے اعلان و اظہار کے لیے فعل ماضی استعمال کیا ہے اور یہاں تین باتیں کہی ہیں جن کا منطقی ربط یوں قائم ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے اپنی ملت کی تعمیر وطن کے تصور پر کی اور اس طرح انھوں نے دو نقصان اٹھائے : ایک یہ کہ ان کا باہمی رشتۂ اخوت منقطع ہوگیا اور دوسرے یہ کہ نوع انسانی قبیلوں میں تقسیم ہوگئی۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں باتیں مسلمان کے حق میں اچھی نہیں ہیں۔ اس صورت حال کے مضر اور مہلک نتائج و عواقب پوری طرح اقبال کی نظر میں ہیں اور ان کے شاعرانہ مسلک کی طلب اور تقاضا یہ ہے کہ وہ مسلمانوں پر یہ صورت حال منکشف کرکے انھیں پھر اسی راہ پر گامزن ہونے پر آمادہ کریں جو شریعت و طریقت نے ان کے لیے متعین کی ہیں۔ اقبال کی شاعری کے بڑے حصے کی تخلیق اسی طلب اور تقاضے کے تحت ہوئی ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ ان کے شعر میں جو کیفیت اس طلب اور تقاضے کی تکمیل کی خواہش نے پیدا کی ہے اس میں دل آویزی اور دل نشینی بھی ہے اور درد مندی اور ولولہ انگیزی

بھی - کلام کے جس حصے کی طرف میں اشارہ کر رہا ہوں ، اس میں بھی اقبال کے فکر و تخیل نے ایک واضح منطق کی پیروی کی ہے - اس فرق کے ساتھ کہ یہاں منطق پر جذبہ سایہ فگن ہے اور خیالات کے باہمی ربط میں اپنے مخاطب کی نفسیاتی کیفیت کو ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے - مسلمان کو اول تو یہ بتانا مقصود ہے کہ ہم نے اپنی زندگی کی اساس جن چیزوں پر رکھی ہے وہ محض فریب اور محض سراب ہیں - اگلی منزل یہ بتانے کی ہے کہ ہماری ملت کی اساس اس بے بنیاد اساس سے کس لحاظ سے مختلف ہے جس پر ہم نے اس وقت تکیہ کر رکھا ہے - اس کے بعد کی منزل یہ بات دل نشین کرنے کی ہے کہ ہماری فلاح و بہبود اسی میں ہے کہ ہم اپنی اصل کی طرف لوٹیں کہ ہمارا اپنی اصل کی طرف لوٹنا صرف ہماری ذاتی فلاح کے لیے نہیں بلکہ حقیقت میں پوری نوع انسانی کی فلاح کے لیے ہے اور ہمیں فلاح انسانی کے سفر میں رہنما کی خدمت انجام دینی ہے - اقبال نے یہ سب باتیں محل اور موقع کے نفسیاتی مطالبات کے تحت کبھی بالکل سیدھی سادی روزمرہ میں کبھی تشبیہوں اور استعاروں کے حسین پیرائے میں ، کبھی اعلانیہ اور کبھی سرگوشی اور راز داری کے انداز میں ہم تک پہنچائی ہیں اور سیاست ، دین ، تاریخ ، فلسفے اور ادب و شعر کی تمام تر حکمت و دانش کو ایک قالب میں ڈھالا ہے - حکیمانہ اشعار کا یہ قالب جس مرتب اور منظم صورت میں ان کے کلام کے مجموعوں میں موجود ہے وہ امت مسلمہ کے لیے اخوت ، محبت ، یکجائی اور یک رنگی کی دستاویز ہے - یہ حکیمانہ دستاویز جن اجزاء سے مرتب ہوئی ہے ان کا عکس اقبال کے یہ شعر ہیں - سب سے پہلے یہ دیکھیے کہ اقبال نے کن چیزوں کو اپنی ملت کی اساس بتایا ہے - رموز بیخودی میں یہ بات استعجاب و استفہام کی اس ملی جلی کیفیت سے شروع ہوتی ہے :

اصلِ ملت در وطن دیدن کہ چہ
باد و آب و گِل پرستیدن کہ چہ

اور اس کے بعد :

ملتِ ما را اساسِ دیگر است
این اساس اندر دلِ ما مضمر است

حاضریم و دل بغائب بستہ ایم
ہمہ ز بندِ این و آن وارستہ ایم

رشتۂ این قوم مثلِ انجم است
چون نگہ ہم از نگاہِ ما گم است

تیرِ خوش پیکانِ یک کیشیم ما
یک نما ، یک بین، یک اندیشیم ما

مدعائے ما ، مآلِ ما یکے ست
طرز و اندازِ خیالِ ما یکے ست

ما ز نعمت‌ہائے او اخوان شدیم
یک‌زبان و یک دل و یک جان شدیم

ان شعروں میں بظاہر دو نکتے ہیں :

(۱) این اساس اندر دل ما مضمر است

(۲) یک نما ، یک بیں ، یک اندیشیم ما - لیکن حقیقت یہ ہے کہ دوسری بات پہلی کی تشریح و تفسیر ہے کہ ہمارا چیزوں کو ایک خاص انداز سے دیکھنا ، ہمارا ایک طرح محسوس کرنا اور ایک طرح سوچنا اس لیے ہے کہ ہم سب میں ایک ابدی روحانی رشتہ ہے - ہمیں اس ابدی روحانی رشتے کا احساس ہو تو ہمارا انداز نظر، انداز احساس ، انداز تخیل اور اندازِ فکر ایک سا ہو جاتا ہے اور فکر و نظر کی یہی یک رنگی اور وحدت ہے جو ملت کے لیے قوت و استقامت کا باعث بنتی ہے - یہ بات اقبال نے کتنے مختلف پیرایوں میں کہی ہے اور ہر جگہ کتنے مؤثر پیرائے میں کہی ہے اس پر نظر ڈالنے سے پہلے شاعرانہ انداز کی ایک بات سن لیجیے - رموز بے خودی میں بوعبید اور جابان کی حکایت میں شاعری اور تاریخ کے ڈانڈے یوں ملائے گئے ہیں :

گفت اے یاران مسلمانیم ما
تارِ چنگیم و یک آہنگیم ما

نعرۂ حیدر نوائے بوذر است
گرچہ از حلقِ بلال و قنبر است

اب ایک ایک کرکے ملت مسلمہ کی خصوصیات : اقبال نے ایک مرتبہ (۱۹۳۱ء میں) سرڈینی سن راس سے گفتگو کرتے ہوئے یہ الفاظ کہے : ''اسلام کا انتہائے مقصود یہ ہے کہ نوع انسانی ایک گھرانا اور ایک خاندان بن جائے - - - - اسلام نے اس مقصد کے حصول کے لیے ایک عملی اسکیم پیش کر دی - کم از کم

دنیائے اسلام رنگ ، نسل اور قوم کے امتیازات کو بالکل فنا کر چکی ہے ۔''

(گفتار اقبال ، صفحہ ۲۳۵)

* * *

رنگ ، نسل اور قوم کے جن امتیازات کو اسلام نے ختم کیا ، اقبال نے اس کی وضاحت بار بار اپنے شعروں میں کی ہے اور ہر جگہ وضاحت کا ایک جداگانہ پیرایہ اختیار کیا ہے ۔ جداگانہ بھی اور اس لحاظ سے منفرد بھی کہ ہر جگہ کہی ہوئی بات میں ایک نیا لطف اور نئی تاثیر ہے ۔ رموز بے خودی میں لم یلد ولم یولد کی تشریح کے دوران میں ایک جگہ کہتے ہیں کہ :

نیست از روم و عرب پیوندِ ما
نیست پابندِ نسب پیوندِ ما

دل بہ محبوبِ حجازی بستہ ایم
زین جہت با یک دگر پیوستہ ایم

* * *

جس طرح مسلمان اور اسلام رنگ و نسب کی دیواروں کو گراتے ہیں ، اسی طرح وہ اپنے آپ کو مقامات کی قید میں بھی محصور و محبوس نہیں کرتے ۔ ہر ملک مسلمانوں کا ملک ہے کہ وہ ان کے اللہ کا ملک ہے اور اسی لیے مقام کی وابستگی کے سلسلے میں اقبال نے مسلمان کا ترجمان بن کر اس کے عقیدے اور مسلک کا

اعلان ان لفظوں میں کیا ہے :

جوہرِ ما با مقامے بستہ نیست
بادۂ تندش بجامے بستہ نیست

ہندی و چینی سفالِ جامِ ما ست
رومی و شامی گلِ اندامِ ما ست

قلبِ ما از روم و شام نیست
سرزبومِ او بجز اسلام نیست

(رموزِ بے خودی ۱۲۹)

اور یہی بات ایک جگہ یوں کہی گئی ہے :

پاک ہے گردِ وطن سے سرِ داماں تیرا
تو وہ یوسف ہے کہ ہر مصر ہے کنعاں تیرا

یہ صحیح ہے کہ مسلمان کا دامن گردِ وطن سے پاک ہے اور ہر مصر کی حیثیت اس کے لیے ایک کنعان کی ہے - لیکن اس ٹھوس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ دنیائے اسلام مملکتوں میں بٹی ہوئی ہے اور ہر مملکت کے اپنے اپنے حدود اور ان حدود کے اپنے اپنے جغرافیائی ، معاشی اور سیاسی تقاضے ہیں اور حقائق پر نظر رکھنے والے ان تقاضوں کی طرف سے آنکھیں نہیں پھیر سکتے - پھر مملکتوں کے اس وجود کی اس کثرت کو تسلیم کرتے ہوئے بھی ہم وحدت کے رشتوں کو کس طرح استوار کریں - اقبال کے سامنے بھی یہ سوال ہے اور اقبال نے اس کا جواب دیا ہے لیکن وہ جواب دینے

سے پہلے ایک مسلمہ حقیقت ہمارے سامنے رکھی ہے اور وہ حقیقت یہ ہے کہ :

کثرتِ ہم مدعا وحدت شود
پختہ چوں وحدت شود، ملت شود

(رموز ، ۱۱۷)

اور اس کے بعد ایک اور حقیقت یہ ہے کہ :

زندہ ہر کثرت ز بندِ وحدت است
وحدتِ مسلم ز دینِ فطرت است

(رموز ، ۱۱۷)

اور یہ دین فطرت ہم تک قرآن کے وسیلے سے پہنچا ہے اور قرآن آئین ہے ، جس کی روح کو اپنے اندر جذب کرکے ملت کا پیکر قوت ، زندگی اور دوام حاصل کرتا ہے :

از یک آئینی مسلمان زندہ است
پیکرِ ملت ز قرآن زندہ است

* * *

ملت از آئینِ حق گیرد نظام
از نظامے محکمے خیزد دوام

اور استحکام و دوام کے یہی عناصر ہیں جو ملت کو معزز و معتبر بناتے ہیں :

برگ و سازِ ما کتاب و حکمت است
این دو قوت اعتبارِ ملت است

اقبال نے افراد اور اعتبار کی اساس کتاب و حکمت کو بتایا ہے اور کتاب و حکمت کو دو قوتوں سے تعبیر کیا ہے ۔ اس لیے استحکام و دوام قوت کے بغیر ممکن نہیں ۔ یہ قوت اقبال کی منطق کے نزدیک جمعیت سے وجود میں آتی ہے :

اہلِ حق را زندگی از قوت است
قوتِ ہر ملت از جمعیت است

اقبال کی ہمت بلند نے ملت اسلامیہ کی شیرازہ بندی کو اپنا فکری اور شعری نصب العین بنایا اور اس نصب العین کے حصول کے لیے جس کا ایک نام اقبال کی خود ساختہ اصطلاح میں تعمیر حرم بھی ہے ، بعض فکری مرحلے مقرر کیے ۔ ان فکری مرحلوں کی تنظیم و ترتیب ایک واضح منطق کے تحت ہوئی اور یہ منطق اپنے قاری اور مخاطب کو ان سب مرحلوں سے لے کر گزری جن سے اقبال کا تاریخ ساز تفکر خود گزرا تھا ۔ اس فکری سفر کا پہلا مرحلہ یہ احساس ہے کہ دنیائے اسلام میں ہر طرف انتشار ، آشفتگی و برہمی ہے ۔ ملی وحدت کا چمن آندھیوں کی زد میں ہے اور حرم کی دیواروں میں رخنے اور شگاف نظر آ رہے ہیں ۔ دوسرا مرحلہ ان اسباب کی تلاش اور دریافت کا ہے جو اس انتشار ، آشفتگی اور برہمی کا سبب بنے ، اور تیسرا مرحلہ ان قوتوں کی شناخت اور پردہ دری کا جنھوں نے پرویزی حیلوں سے سادہ دل مسلمانوں کو فریب میں مبتلا کیا اور انھوں نے حق کی راہ ترک کرکے باطل کو سینے سے لگایا ۔ اس سے اگلا مرحلہ ان قدروں کی نشان دہی کا جو ملت اسلامی کا امتیاز ہیں ۔ اقبال نے فکر و خیال کے یہ سب منطقی مرحلے حسن بیان کے وسیلے سے طے کیے اور آہوئے بے زمام کو سوئے قطار لائے ۔ راز حرم سے واقف و باخبر ہو کر انداز محرمانہ

میں گفتگو کی اور لاہور سے تا بخاک بخارا و سمرقند دلوں کو ایک ولولۂ تازہ دیا ۔ دلوں کو اس ولولۂ تازہ کی لذت سے آشنا کرنے کے لیے اقبال نے کبھی بیان کا سیدھا سادا انداز اختیار کیا ، کبھی تشریح و توضیح کو اظہار مطالب کا ذریعہ بنایا اور کبھی حقائق کو رمز و کنایے کا پیرایہ دے کر تاثیر کی دولت بخشی ۔ لیکن ان گوناگوں طریقوں میں وہ طریقہ خصوصیت سے دل آویز و پر تاثیر ہے جس میں اقبال اپنے قاری کو تعمیر حرم کے کام کی طرف متوجہ اور مائل کرنے کے لیے اس سے مخاطب ہو کر اپنے دل کی بات کہتے ہیں ۔ یہ بات کبھی خطیب کے براہ راست ناصحانہ انداز میں کہی جاتی ہے :

ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو
اخوت کا بیاں ہو جا ، محبت کی زباں ہو جا

یہ ہندی وہ خراسانی ، یہ افغانی وہ تورانی
تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بیکراں ہو جا

غبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے
تو اے مرغِ حرم اڑنے سے پہلے پر فشاں ہو جا

اور کبھی شاعر کے نیم ایمائی اور ایمائی انداز میں :

شد پریشان برگ گل چون بوئے خویش
اے ز خود رم کردہ باز آ سوئے خویش

اے امینِ حکمتِ اُم الکتاب
وحدتِ گم گشتہ خود بازیاب

مسلمان کو پھر اپنی ذات کی طرف واپس آنے کی دعوت دینے اور اپنی وحدت گم گشتہ کو حاصل کرنے کی تلقین کرنے میں اقبال کی بصیرت آگیں منطق کا عمل کارفرما ہے اور یہ منطق ایک طرف تو ان سے یہ کہلواتی ہے کہ :

''ایک سبق جو میں نے تاریخ اسلام سے سیکھا ہے ، یہ ہے کہ صرف اسلام تھا جس نے آڑے وقتوں میں مسلمانوں کی زندگی کو قائم رکھا ، نہ کہ مسلمان ۔ اگر آج آپ اپنی نگاہیں پھر اسلام پر جما دیں اور اس کے ''حیات بخش'' تخیل سے متاثر ہوں تو آپ کی منتشر اور پراگندہ قوتیں از سرِنو جمع ہو جائیں گی ۔''

اور دوسری طرف یہ کہ :

''مغربی اور وسطی ایشیا کی مسلمان قومیں اگر متحد ہو گئیں تو بچ جائیں گی اور اگر اس اختلاف کا تصفیہ نہ ہو سکا تو اللہ حافظ ہے ۔ مغامین اتحاد کی سخت ضرورت ہے ۔ میرا مذہبی عقیدہ یہی ہے کہ اتحاد ہوگا اور دنیا پھر ایک دفعہ جلال اسلامی کا نظارہ دیکھے گی ۔''

(خط نمبر ۵۹ ۔ اقبال نامہ حصہ دوم)

یہی نظارہ ہے جس کی بشارت اقبال نے اب سے ۶۲ برس پہلے دی تھی :

آ ملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک
بزمِ گل کی ہم نفس بادِ صبا ہو جائے گی

پھر دلوں کو یاد آ جائے گا پیغامِ سجود!
پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہو جائے گی

اور :

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

اور ہماری نظریں آج اقبال کی اس پیشین گوئی کو پورا ہوتا دیکھ رہی ہیں :

(امروز ، لاہور ، اسلامی کانفرنس نمبر ۲۲ فروری ۱۹۷۴ء ، صفحہ ۳ و ۶) ۔

انیس اور اقبال

[تحریر : ۳۰ اپریل ۱۹۷۱ء]

انیس اور اقبال کی شاعری کے میدان ایک دوسرے سے اتنے مختلف ہیں کہ ان کے فکر و خیال میں کسی مشترک عنصر کی موجودگی کا دعویٰ بظاہر بڑا عجیب سا معلوم ہوتا ہے ، لیکن غور کیا جائے تو انیس اور اقبال کی شاعری میں ایک بہت بڑا نصب العینی اشتراک موجود ہے - اقبال کے حکیمانہ تخیل نے انسان کی معاشرتی اور اجتماعی زندگی کا جو مثالی اور عینی نقشہ بنایا ہے اس میں خیر کی قدریں شر پر غلبہ حاصل کر کے ایسے حالات پیدا کرتی ہیں جن میں انسان اپنی فطری اور ودیعتی صلاحیتوں کو پوری طرح بروئے کار لا سکے اور اپنے ماحول پر متصرف اور قابض ہو کر بشریت کے وہ تقاضے پورے کر سکے جن کی بدولت اسے اشرف المخلوقات ہونے کا شرف و امتیاز حاصل ہوا ہے - بشریت کے تقاضوں کو بدرجۂ اتم پورا کرنے والا یہ انسان اقبال کا مردِ مومن ہے جس کی ذات میں ہمیں صفاتِ الٰہیہ ''بہترین اندازے''[1] کے مطابق مجتمع اور مرتکز نظر آتی ہیں -

اقبال کی پوری شاعری انہیں صفاتِ الٰہیہ کی نشان دہی کرتی اور انسان کو ان کی طرف آنے کی دعوت دیتی ہے - اقبال کے فکری نظام نے مکمل انسانی زندگی کا جو نقشہ ہمارے سامنے پیش

---

۱ - اشارہ آیۂ کریمہ کی طرف : ''لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم ○''-

کیا ہے اس کا عکس وہ اسلامی زندگی ہے جس نے مسلمانوں کو حق پر قربان ہونے کی تعلیم دی کہ حق ہی اس مثالی اور عینی زندگی کی اساس ہے - اسی مثالی اور عینی زندگی کی روداد کو اقبال نے ''داستانِ حرم'' کہا ہے جس کا آغاز انتہائی سادہ اور انجام حد درجہ رنگین ہے اور اس ہمیشہ زندہ رہنے والی داستان کے آغاز کی علامت ''اسماعیل'' ہیں اور انجام کی علامت ''حسین''[۴] - اقبال کی نظر میں مقام شبیری ایک حقیقت ابدی ہے[۳] اور یہ حقیقت ابدی اس وقت تک حاصل نہیں ہوتی جب تک کوئی صبر ، عشق اور فقر کے اس اعلیٰ مقام تک رسائی حاصل نہ کرے جس پر جناب حسینؓ فائز ہیں -

صدقِ خلیل بھی ہے عشق ، صبرِ حسینؓ بھی ہے عشق
معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق[۴]

اک فقر ہے شبیری ، اس فقر میں ہے میری
میراثِ مسلمانی سرمایۂ شبیری[۵]

---

۲ - غریب و سادہ و رنگیں ہے داستانِ حرم
نہایت اس کی حسین ابتدا ہے اسماعیل
(بال جبریل ۹۳)

۳ - حقیقتِ ابدی ہے مقامِ شبیری
بدلتے رہتے ہیں اندازِ کوفی و شامی
(بال جبریل ۱۰۵)

۴ - بال جبریل ، صفحہ ۱۵۳ -
۵ - بال جبریل ، صفحہ ۲۱۳ -

انیس کا سارا کلام اول سے آخر تک حسینی صبر، حسینی عشق اور حسینی فقر کی وہ داستان ہے جس کے ہیرو حسین (علیہ السلام) ہیں اور جس کی پوری روداد آغاز تا انجام اس حسنِ عمل کی روداد ہے جس سے انسان کا وجود حقیقتِ ابدی کی شکل اختیار کرتا ہے۔ اقبال نے جس فقر کو شبیری کا نام دیا ہے انیس بھی اسی فقر کے داعی ہیں :

بخشی ہے خدا نے ہم کو یہ دولتِ فقر
برسوں ڈھونڈے تو بادشہ کو نہ ملے[۶]

دولت کا ہمیں خیال آتا ہی نہیں
یہ نشۂ فقر ہے کہ جاتا ہی نہیں

لبریز ہیں یہ دولتِ استغنا سے
آنکھوں میں کوئی غنی سماتا ہی نہیں[۷]

جس طرح فقر اقبال کی شاعری کا موضوع خاص ہے اور ان گنت شاعرانہ پیکر اختیار کر کے ہمارے سامنے آتا ہے، اسی طرح عظمتِ آدم کا اعتراف اور اس کی نشان دہی ان کے شاعرانہ مسلک کا منصب خاص ہے۔ انیس بھی جا بجا اسی عظمت کو موضوع سخن بناتے ہیں :

آدم کو عجب خدا نے رتبہ بخشا
ادنیٰ کے لیے مقامِ اعلیٰ بخشا

---

۶ - مراثی انیس جلد سوم (غلام علی اینڈ سنز، لاہور) صفحہ ۱۵۵ -
۷ - مراثی انیس جلد سوم صفحہ ۲۲۱ -

عقل و ہنر و تمیز و جان و ایماں
اس ایک کفِ خاک کو کیا کیا بخشا[۸]

''اس ایک کف خاک کو کیا کیا بخشا'' کی تفسیر و تشریح انیس کے وہ سب مرثیے ہیں جن میں سے ہر ایک شہدائے کربلا میں سے کسی نہ کسی کے کارناموں اور اوصاف حمیدہ و پسندیدہ کی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ انیس کے مرثیوں میں جا بجا یہ اوصاف دہرائے گئے ہیں :

فاقوں میں صبر و شکر سے دل ان کے سیر تھے
جاں باز تھے، جری تھے، مجاہد تھے، شیر تھے[۹]

* * *

ذی جاہ و ذی جلالت و ذی فہم و ذی شعور[۱۰]

* * *

جرار و بردبار و دلاور، سخی، غیور[۱۱]*

یہی سب اقبال کے مردِ مومن کے اوصاف بھی ہیں اور اقبال نے اپنی شاعری کے ہر دور میں اردو اور فارسی دونوں میں مختلف

---

۸ - مراثی انیس جلد سوم صفحہ ۱۵۵ -
۹ - مراثی انیس جلد اول صفحہ ۴۴ -
۱۰ - مراثی انیس جلد اول صفحہ ۴۴ -
۱۱ - مراثی انیس جلد اول صفحہ ۱۳۶ -
*ایک قلمی یادداشت کے مطابق، اس جگہ وقار عظیم صاحب کچھ اور مثالیں بڑھانا چاہتے تھے، مطبوعہ مضمون سے یہاں دو مثالیں انھوں نے خارج بھی کی ہیں۔ [مرتب]

طریقوں سے ان اوصاف کا ذکر کر کے مسلمان کو ان کی طرف مائل کیا ہے ، لیکن بعض نظموں میں ان کی فہرست اسی طرح مرتب ہوگئی ہے جیسی انیس کے مرثیوں کے بندوں ، شعروں اور مصرعوں میں - مثال کے لیے 'جواب شکوہ' کے چند شعر پیش کیے جا سکتے ہیں :

دمِ تقریر تھی مسلم کی صداقت بے باک
عدل اس کا تھا قوی ، لوثِ مراعات سے پاک

شجرِ فطرتِ مسلم تھا حیا سے نمناک
تھا شجاعت میں وہ اک ہستیِ فوق الادراک

* * *

ہر مسلماں رگِ باطل کے لیے نشتر تھا
اس کے آئینۂ ہستی میں عمل جوہر تھا

جو بھروسا تھا اسے قوتِ بازو پر تھا
ہے تمھیں موت کا ڈر ، اس کو خدا کا ڈر تھا

* * *

حیدری فقر ہے ، نے دولتِ عثمانی ہے
تم کو اسلاف سے کیا نسبتِ روحانی ہے ؟

* * *

تم ہو آپس میں غضبناک ، وہ آپس میں رحیم
تم خطا کار و خطابیں ، وہ خطا پوش و کریم

* * *

خود کشی شیوہ تمھارا ، وہ غیور و خوددار
تم اخوت سے گریزاں ، وہ اخوت پہ نثار

تم ہو گفتار سراپا ، وہ سراپا کردار
تم ترستے ہو کلی کو ، وہ گلستاں بکنار

یوں گویا انیس اور اقبال دونوں اپنے اپنے مخصوص شاعرانہ مسلک کے پابند ہو کر بھی اپنے قاری تک ایک ہی بات پہنچانا چاہتے ہیں - دونوں عظمتِ آدم کے معترف ہیں، دونوں فقر، صداقت، عدل ، شجاعت ، سخاوت ، رحم و کرم اور غیرت و خود داری کو انسانی کردار کی عظمت کی نشانیاں جانتے ہیں - یہی دونوں کے نزدیک سرمایۂ شبیری بھی ہے اور میراث مسلمانی بھی -

انیس اور اقبال نے شبیر کے اس سرمایۂ عزیز کو مسلمانوں کی کھوئی ہوئی دولت اور اس کی میراث سمجھ کر اس تک پہنچانے کا بیڑا اس لیے اٹھایا ہے کہ دینداری کے جس ماحول میں ان دونوں عظیم شاعروں کی پرورش ہوئی ہے اس کا فطری تقاضا ہی یہ ہے - ان دونوں کی نظر ماضی کی اس عظیم روایت پر ہے جس میں ان اعلیٰ انسانی قدروں کی تخلیق ہوئی اور جس کے زیر سایہ انھوں نے پرورش پائی —— بالکل یہی صورت اس وقت پیش آئی جب دونوں شاعروں نے اپنے پیغام کے اظہار و ابلاغ کے لیے کچھ شاعرانہ وسیلے اختیار کیے -

انیس اور اقبال کے سامنے شاعری کی عظیم اور وقیع روایت کا وہ بیش بہا سرمایہ موجود تھا جو تغیر و ارتقا اور ترک و اختیار کے بہت سے پیچ در پیچ مرحلوں اور نشیب و فراز کی بے شمار آزمائشوں میں سے گزر کر ایک خاص شکل میں ان تک پہنچا تھا - شعری روایت

کے اس وافر سرمائے میں سے انیس اور اقبال دونوں نے کچھ چیزیں اپنے لیے منتخب کر لیں اور یہی آگے چل کر ان کے فن کو ایک مخصوص ہیئت اور صورت دینے کا باعث بنیں۔ روایت شعری کے ان گوناگوں اجزا اور عناصر میں سے کچھ تو ایسے ہیں جو ان دونوں فنکاروں کے فن کا امتیازی نشان بنے، لیکن ان میں سے بعض ایسے بھی ہیں جنھیں دونوں شاعروں نے اختیار کیا اور اپنے انفرادی مزاج اور پسند اور اپنے مخصوص شاعرانہ مقصد کے تقاضوں کے اعتبار سے انھیں ایک نئے سانچے میں ڈھالا۔ لیکن نئے سانچے میں ڈھلنے کے بعد بھی روایت کے ان عناصر اور اجزا کی اساسی خصوصیتیں برقرار رہیں۔ انھیں عناصر اور اجزا کو میں نے انیس اور اقبال کے شاعرانہ فن کے مشترک پہلو کہا ہے۔

ڈرامائیت انیس کے مرثیوں اور اقبال کی نظموں کا پہلا مشترک پہلو ہے۔ انیس کے مرثیوں پر ایپک (Epic) اور رزمیہ (Tragedy) کے فنی خصائص کو پیش نظر رکھتے ہوئے جو بحثیں کی گئی ہیں اور مختلف طرح کی دلیلیں پیش کر کے انھیں ایپک اور رزمیہ کی ہمسری کا جو مقام دیا گیا ہے وہ منطقی طور پر اس لیے درست اور قابلِ قبول نہیں کہ انیس ایپک اور المیہ سے اور ان کے فنی خصائص سے قطعاً نا آشنا تھے اور ان کے ذہن میں دور دور بھی مرثیے کو ایپک یا رزمیہ کا مماثل بنانے کا خیال موجود نہیں تھا۔ البتہ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انیس نے اپنی غیر معمولی شاعرانہ صلاحیت کی بدولت واقعات کربلا کے جو مناظر اپنے مرثیوں میں نظم کیے ہیں اور اس عظیم تاریخی واقعے سے تعلق رکھنے والی شخصیتوں کے جذبات، احساسات اور خیالات کے جو نقشے پیش کیے ہیں ان میں واقعہ نگاری اور فضا بندی کی وہ خصوصیتیں موجود ہیں

جنھیں ہم ڈراموں کی فنی قدر و قیمت کا تعین کرتے وقت اپنا معیار بناتے ہیں ۔

انیس کے مرثیوں میں آنے والے سب کردار اپنے طبائع کے اعتبار سے مثالی ہونے کے باوجود منفرد شخصیتوں کے حامل ہیں ۔ ہر کردار کے اقوال و افعال سے ہر جگہ سیرت اور شخصیت کا وہی نقش ابھرتا ہے جو اس کی ذات کے لیے مخصوص ہے ۔ انیس نے ان کرداروں کو اپنی شخصیتوں کی عظمت کے اعتبار سے ایک دوسرے کے مماثل دکھاتے ہوئے بھی ان سب میں باہم ایک نازک فرق ملحوظ رکھا ہے ۔ یہی فرق ان کا وہ امتیاز ہے جس سے ہم انھیں الگ الگ پہچانتے ہیں اور ہماری نظر کبھی دھوکا نہیں کھاتی ۔

اقبال نے بھی انیس کی طرح ڈرامائی انداز تخاطب ، مکالمے اور فضا بندی کی مدد سے اپنے کلام کو مؤثر بنانے میں مدد لی ہے اور کردار اور مکالمے کے باہمی رشتے کے صحیح فنی ادراک سے سیرتوں کے نقش ابھارنے کا کام لیا ہے اور یوں گویا جو بات انیس کے سب مرثیوں کی ساخت میں جاری و ساری ہے ، اس سے اقبال نے اردو اور فارسی نظموں میں موقع اور محل کی مناسبت سے اپنی شاعری کے ہر دور میں کام لیا ہے ۔ بانگ درا کی نظم ''عقل و دل'' ، ''شکوہ اور جواب شکوہ'' سے لے کر بال جبریل کی ''جبریل و ابلیس'' اور ارمغان حجاز کی ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' تک اور فارسی میں پیام مشرق کی نظم ''محاورہ مابین خدا و انسان'' سے جاوید نامے تک چھوٹی بڑی بہت سی نظمیں ایسی ہیں جن کی تاثیر کی بنیاد ہی ڈرامائیت ہے لیکن انیس اور اقبال کے فن کی اس اہم خصوصیت کے متعلق میرا دعویٰ ایسا نہیں کہ اسے تقویت پہنچانے کے لیے مثالیں پیش کرنی ضروری ہوں ۔ انیس اور اقبال دونوں کے کلام کا وافر حصہ اس دعوے پر تصدیق کی مہر ثبت کرتا ہے ۔

اقبال اور انیس کے فن کے جن مشترک پہلوؤں کی طرف مجھے اب اشارے کرنے ہیں ، آن میں سے ایک بحروں کے انتخاب کے معاملے میں دونوں کی پسند اور ذوق کا اشتراک ہے - اردو میں اس وقت بحور کا جو نظام رائج ہے وہ عربی ، فارسی اور ہندی کے ملے جلے اثرات سے ترک ، اختیار ، تصرف ، ایجاد اور اختراع کے گوناگوں مرحلوں سے گزرتا ہوا ہم تک پہنچا ہے - تصرف ، ایجاد اور اختراع کا سلسلہ اب بھی جاری ہے ، لیکن اس فنی عمل کی بنیاد ہمیشہ روایت کے وسیلے سے ہم پہنچنے والے سرمائے پر رکھی جاتی ہے - ہر نئے تصرف ، ایجاد اور اختراع میں روایت کے اجزا ضرور شامل ہوتے ہیں ، گو تبدیلیوں کی اس روش سے شاعرانہ ماحول کا صرف تھوڑا سا حصہ متأثر ہوتا ہے ، ورنہ ہوتا یہی ہے کہ شاعروں کی بڑی تعداد انھیں بحروں کو اختیار کرتی ہے جن کی روایتی اہمیت مسلم ہے - انیس اور اقبال دونوں کی روش اس معاملے میں روایت پسندی کی ہے - گو اقبال نے کبھی کبھی تصرفات سے کام لیا ہے لیکن وہ عام طور سے مروجہ روایتی بحروں ہی کے ذریعہ اپنے خیالات و تصورات دوسروں تک پہنچاتے ہیں - انیس اور اقبال نے اپنے مرثیوں اور نظموں میں جو مشترک بحریں استعمال کی ہیں اس وقت آن پر کسی تفصیلی بحث کی گنجائش نہیں صرف ایک خاص مثال کے ذریعے دونوں کے اشتراک ذہنی کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے - انیس کے دو بہت مشہور مرثیے ہیں—— ''بخدا فارسِ میدانِ تہور تھا حر'' اور ''نمک خوانِ تکلم ہے فصاحت میری'' ان دونوں کی بحر ایک ہے*- اقبال کی دو حد درجہ معروف اور مقبول نظمیں شکوہ اور جواب شکوہ بھی اسی بحر میں ہیں - میرے لیے یہ دعویٰ کرنا ممکن نہیں کہ اقبال نے اپنی دو ایسی

---

* - وقار عظیم صاحب یہاں کچھ اور مثالیں بڑھانا چاہتے تھے - (مرتب)

نظموں کے لیے جن کے مطالب کو وہ ہر ہندی مسلمان کے قلب و گوش تک پہنچانا چاہتے تھے ، انیس کے دو معروف مرثیوں کی بحر ارادتاً اختیار کی ، لیکن اختیار کے اس عمل کو محض اتفاقی بھی نہیں کہا جا سکتا اس لیے کہ اقبال کی نظموں کے بعض مصرعوں اور شعروں میں انیس کے مرثیوں میں آنے والے شعروں کی گونج اور جھنکار سنائی دے رہی ہے - مثال کے طور پر چند مصرعے اور شعر پیشِ خدمت ہیں - پہلے ''شکوہ'' اور ''جواب شکوہ'' کے چند شعر سن لیجیے :

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر[۱۲]

ٹل نہ سکتے تھے ، اگر جنگ میں اڑ جاتے تھے
پاؤں شیروں کے بھی میداں سے اکھڑ جاتے تھے

تجھ سے سرکش ہوا کوئی تو بگڑ جاتے تھے
تیغ کیا چیز ہے؟ ہم توپ سے لڑ جاتے تھے[۱۳]

یہ جہاں چیز ہے کیا ، لوح و قلم تیرے ہیں[۱۴]

---

۱۲ - جواب شکوہ ، بانگ درا صفحہ ۲۲۷ -
۱۳ - شکوہ ، بانگ درا صفحہ ۱۷۹ -
۱۴ - جواب شکوہ ، بانگ درا صفحہ ۲۳۲ -

شان آنکھوں میں نہ جچتی تھی کہانداروں کی
کلمہ پڑھتے تھے ہم چھاؤں میں تلواروں کی[۱۵]

اب تلک یاد ہے قوموں کو حکایت اُن کی
نقش ہے صفحۂ ہستی پہ صداقت اُن کی[۱۶]

کوئی قابل ہو تو ہم شان کئی دیتے ہیں
ڈھونڈنے والوں کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں[۱۷]

مشکلیں امتِ مرحوم کی آساں کر دے
مورِ بے مایہ کو ہمدوشِ سلیماں کر دے[۱۸]

تم ہو آپس میں غضبناک ، وہ آپس میں رحیم
تم خطا کار و خطابیں ، وہ خطاپوش و کریم[۱۹]

اب ذرا چند شعر انیس کے ان دونوں مرثیوں کے سن لیجیے:

گو وہ دنیا میں نہیں عرش مقام ان کے ہیں
آج تک عالمِ ایجاد میں نام اُن کے ہیں[۲۰]

---

۱۵ - شکوہ ، بانگ درا صفحہ ۱۷۹ -
۱۶ - جواب شکوہ ، بانگ درا صفحہ ۲۲۷ -
۱۷ - جواب شکوہ ، بانگ درا صفحہ ۲۲۲ -
۱۸ - شکوہ ، بانگ درا صفحہ ۱۸۵ -
۱۹ - جواب شکوہ ، بانگ درا ۲۲۷ -
۲۰ - مرثیہ نکتہ خوانِ تکلم ہے فصاحت میری ، مراثی انیس جلد اول ص ۳۱۲ -

کبھی بڑھتے تھے وغا کو کبھی رک جاتے تھے
سیدھے ہوتے تھے کبھی اور کبھی جھک جاتے تھے[۲۱]

چین کیا چیز ہے؟ آرام کسے کہتے ہیں
اس پہ شکوہ نہیں کچھ، صبر اسے کہتے ہیں[۲۲]

سنگریزوں میں تب و تاب تھی انگاروں کی
سر پہ یا دھوپ تھی یا چھاؤں تھی تلواروں کی[۲۳]

مثلِ خورشید ہے روشن وہ شرف ان کا ہے
یہ وہ بندے ہیں کہ اللہ پہ حق جن کا ہے[۲۴]

آن سے قطرہ کوئی مانگے تو گہر دیتے ہیں
ہیں سخی ابنِ سخی بات پہ سر دیتے ہیں

پیٹ سائل کا یہ فاقوں میں بھی بھر دیتے ہیں
یاں تو زر دیتے ہیں، فردوس میں گھر دیتے ہیں[۲۵]

---

۲۱ - ایضاً، ص ۲۱۲ -
۲۲ - ایضاً، ص ۲۱۴ -
۲۳ - ایضاً، ص ۲۱۶ -
۲۴ - مرثیہ بخدا فارسِ میدانِ تہور تھا حر، مراثی انیس جلد دوم صفحہ ۱۰۰ -
۲۵ - مرثیہ بخدا فارس میدانِ تہور تھا حر - مراثی انیس جلد دوم ص ۱۰۰ -

پار دریائے خطا سے مری کشتی ہو جائے
دوزخی بھی ترے صدقے میں بہشتی ہو جائے[۲۶]

جب وہ خالق ہمیں دیتا ہے تو ہم دیتے ہیں[۲۷]

تغزل ہماری روایتِ شعری کی اتنی عام خصوصیت ہے کہ شعریت اور تغزل ایک دوسرے کے ہم معنی بن گئے ہیں - غزل تو خیر غزل ہے ہی لیکن رباعی ، قصیدہ ، مثنوی ، حتیٰ کہ مرثیہ لکھنے والے شاعر بھی اپنے کلام کو مؤثر بنانے اور اس میں شعریت کی لطافت پیدا کرنے کے لیے تغزل کی کیفیت کے دست نگر ہوتے ہیں - اقبال جن کی شاعری کی تمام تر اساس حکیمانہ تصورات پر ہے اور انیس جنھوں نے اہل بیت کی نوحہ گری کی بدولت شہرت عام اور بقائے دوام کی بارگاہ میں مقام شرف پایا ہے کلام کو مؤثر بنانے کے لیے جا بجا تغزل کا سہارا لیتے ہیں - اقبال کی حکمت کو تغزل نے کہاں کہاں اور کس کس طرح سہارا دیا ہے اس کا اندازہ چند چیدہ چیدہ مثالوں سے ہو سکتا ہے - یہ مثالیں سب ایسی نظموں سے ماخوذ ہیں جن کا مزاج اساسی طور پر حکیمانہ ہے اور جہاں شاعر اپنے قاری کے ذہن کو تفکر اور تأمل کی دعوت دے رہا ہے :

فلسفہ و شعر کی اور حقیقت ہے کیا
حرفِ تمنا جسے کہہ نہ سکیں روبرو[۲۸]

---

۲۶ - ایضاً ، ص ۱۰۴ -
۲۷ - ایضاً ، ص ۱۰۵ -
۲۸ - نظم 'دعا' بال جبریل صفحہ ۱۲۵ -

راہِ محبت میں ہے کون کسی کا رفیق
ساتھ مرے رہ گئی ایک مری آرزو[۲۹]

عالمِ سوز و ساز میں وصل سے بڑھ کے ہے فراق
وصل میں مرگِ آرزو، ہجر میں لذتِ طلب[۳۰]

وادیِ کہسار میں غرقِ شفق ہے سحاب
لعلِ بدخشاں کے ڈھیر چھوڑ گیا آفتاب[۳۱]

قلب و نظر کی زندگی دشت میں صبح کا سماں
چشمۂ آفتاب سے نور کی ندیاں رواں[۳۲]

عینِ وصال میں مجھے حوصلۂ نظر نہ تھا
گرچہ بہانہ جو رہی میری نگاہِ بے ادب[۳۳]

چمن میں تربیتِ غنچہ ہو نہیں سکتی
نہیں ہے قطرۂ شبنم اگر شریکِ نسیم[۳۴]

ہوائے دشت سے بوئے رفاقت آتی ہے
عجب نہیں ہے کہ ہوں میرے ہم عناں پیدا[۳۵]

---

۲۹ - ایضاً ، ص ۱۲۳ -
۳۰ - 'ذوق و شوق' بال جبریل صفحہ ۱۵۵ -
۳۱ - 'مسجد قرطبہ' بال جبریل صفحہ ۱۳۵ -
۳۰ - نظم 'ذوق و شوق' بال جبریل صفحہ ۱۵۱ -
۳۳ - 'ذوق و شوق' بال جبریل صفحہ ۱۵۶ -
۳۴ - 'علم و دین' ضرب کلیم صفحہ ۱۹ -
۳۵ - نظم ''تخلیق'' ضرب کلیم صفحہ ۹۹ -

ہر لحظہ نیا طور، نئی برق تجلی
اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے[۳۶]

پھر تیرے حسینوں کو ضرورت ہے حنا کی
باقی ہے ابھی رنگ مرے خونِ جگر میں[۳۷]

مری خودی بھی سزا کی ہے مستحق لیکن
زمانہ دار و رسن کی تلاش میں ہے ابھی[۳۸]

مرے دیدار کی ہے اک یہی شرط
کہ تو پنہاں نہ ہو اپنی نظر سے[۳۹]

مجھے رلاتی ہے اہلِ جہاں کی بے دردی
فغانِ مرغِ سحر خواں کو جانتے ہیں سرود[۴۰]

قصاص خونِ تمنا کا مانگیے کس سے؟
گناہ گار ہے کون اور خوں بہا کیا ہے[۴۱]

---

۳۶ - نظم 'شاعر' ضرب کلیم صفحہ ۱۲۶ -
۳۷ - نظم 'ہسپانیہ' بال جبریل صفحہ ۱۴۰ -
۳۸ - نظم 'مشرق' ضرب کلیم صفحہ ۱۴۲ -
۳۹ - نظم 'تصویر و مصور' ارمغان حجاز صفحہ ۲۳۳ -
۴۰ - نظم مسعود مرحوم، ارمغان حجاز ص ۲۴۳ -
۴۱ - ایضاً ص ۲۴۵ -

مری نوائے غم آلود ہے متاعِ عزیز
جہاں میں عام نہیں دولتِ دلِ ناشاد[۴۲]

آخری تیں شعر مرثیے کے ہیں ۔

اب تغزل کی یہ کیفیت انیس کے مرثیوں میں دیکھیے۔ تغزل کے رنگ میں ڈوبے ہوئے یہ شعر اور مصرعے مرثیوں کے مختلف حصوں کے ہیں ۔ ایک شعر تلوار کی تعریف کے موقع پر استعمال ہوا ہے ، دو میں مناظر کی کیفیت کا سماں ہے ، باقی مصرعے اور شعر حضرت علی اکبرؑ کے سراپا سے لیے گئے ہیں :

زیبا تھا دمِ جنگ پری وش اُسے کہنا
معشوق بنی سرخ لباس اس نے جو پہنا[۴۳]

* * *

طاقت نہ رہی شمع میں سوزِ جگری کی
پروانے سے رخصت تھی چراغِ سحری کی[۴۴]

* * *

دشت میں جھوم کے جب باد صبا آتی تھی
صاف غنچوں کے چٹکنے کی صدا آتی تھی[۴۵]

* * *

---

۴۲ - ارمغان حجاز صفحہ ۲۷۶ -

۴۳ - مرثیہ ''یا رب چمن نظم کو گلزار ارم کر'' مراثی انیس جلد اول صفحہ ۲۶ -

۴۴ - مرثیہ ''پھاڑا جو گریباں شب آفت کی سحر نے'' مراثی انیس جلد اول صفحہ ۵۳ -

۴۵ - مرثیہ ''نمک خوان تکلم ہے فصاحت میری'' مراثی انیس جلد اول صفحہ ۴۰۸ -

یہ جلوہ گری مہر کے پرتو میں نہیں ہے
ابرو میں جو خم ہے وہ مہِ نو میں نہیں ہے[۴۶]

* * *

ناخن نے دکھایا جو رخِ جلوہ گر اپنا
شرما کے مہِ نو نے جھکایا ہے سر اپنا[۴۷]

* * *

حیرت ہے مرے دیدۂ دیدار طلب کو
جلوہ ترا دن کو نظر آتا ہے نہ شب کو[۴۸]

* * *

بلبل کی طرح روتے ہیں فریاد و فغاں سے
کچھ بس نہیں چلتا چمن آرائے جہاں سے[۴۹]

* *

تڑپا جو قلب چشم کے ساغر چھلک پڑے
اٹھا دھواں جگر سے کہ آنسو ٹپک پڑے[۵۰]

* * *

---

۴۶ تا ۴۸ - مرثیہ ''یوسف کو عزیزوں نے چھڑایا جو پدر سے'' مراثی انیس جلد اول صفحات ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۱۸ -

۴۹ - مراثی انیس جلد اول صفحہ ۱۲۳ -

۵۰ - مرثیہ ''جب لشکرِ خدا کا علم سرنگوں ہوا'' مراثی انیس جلد اول صفحہ ۱۵۶ -

ہے کجی عیب مگر حسن ہے ابرو کے لیے
سرمہ زیبا ہے فقط نرگسِ جادو کے لیے
تیرگی بد ہے مگر نیک ہے گیسو کے لیے
زیب ہے خالِ سیہ چہرۂ گل رو کے لیے[۵۱]

تغزل کی طرح ترنم بھی ہماری روایت شعری کی ایسی خصوصیت ہے جس کا تحت الشعوری اثر مرثیہ نگار کو بھی ایسے فنی وسائل اختیار کرنے پر مائل کرتا ہے جو ترنم کی کیفیت پیدا کرنے میں ممد ہوں - ترنم لازماً موسیقی نہیں اور نہ ترنم پیدا کرنے کے لیے شعر کا لحن کے ساتھ یا گنگنا کر پڑھنا ضروری ہے - ترنم نغمگی یا غنائیت شعر کی ایک اندرونی کیفیت ہے جو خاموشی سے پڑھنے والے کے ذہن کو متأثر کرتی ہے - یہاں تک کہ یہ خاموش تأثر کبھی کبھی سرور اور وجد کی صورت اختیار کر لیتا ہے - شعر کی یہ اندرونی غنائی کیفیت پیدا کرنے کے بیسیوں فنی وسیلے ہیں - بحر اور اس کے ارکان کی ایک مخصوص ترتیب، ارکان کی اس ترتیب میں حسب ضرورت تحریف اختیار کرنے کا میلان ، موزوں اور متناسب قافیوں کا استعمال ، قافیے اور ردیف کا صوتی قرب اور ان کی باہم پیوستگی ، مصرعوں میں لفظوں اور ترکیبوں کا در و بست ، ترکیبوں کی مرصع کاری اور لفظوں کا صوتی آہنگ - - - - یہ اور اس کے علاوہ بعض اور چیزیں ہیں جن سے شعر میں ترنم ، نغمگی اور غنائیت کی وہ خاموش لہر دوڑتی اور وہ ان سنی جھنکار پیدا ہوتی ہے جو شعر کے پورے پیکر میں جاری و ساری ہو کر شعر کے نغماتی تأثر کا باعث بنتی ہے - اچھا شعر کبھی اس اندرونی موسیقی

---

۵۱ - مرثیہ ''نمک خوان تکلم ہے فصاحت میری'' مراثی انیس جلد اول صفحہ ۳۰۷ -

سے خالی نہیں ہوتا ، خواہ مرثیہ ہی کیوں نہ ہو اور خواہ وہ کسی روحانی کیفیت اور واردات کی روداد ہی کیوں نہ ہو - فرق صرف یہ ہے کہ فن کا صحیح احساس رکھنے والے شاعر اس بات کے رمز شناس ہوتے ہیں کہ موسیقی کی اندر ہی اندر دوڑتی ہوئی لہر اور اس کی بے آواز جھنکار کو کب اتنا ابھار دیں کہ وہ شعر کی پوری فضا پر چھا جائے ، اور کب اور کس حالت میں اسے کس حد تک مخفی اور پوشیدہ رکھیں کہ وہ پس پردہ رہتے ہوئے بھی وہ تأثر پیدا کر سکے جو شاعر کا مطلوب و مقصود ہے - انیس اور اقبال کا نازک اور لطیف فن کارانہ حسن ترنم کے اس خاموش تاثر کے رموز سے پوری واقفیت اور آگاہی رکھتا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان دونوں عظیم ماہرین فن نے ترنم پیدا کرنے کے ایسے وسیلوں سے مدد لی ہے جو محسوس کی سطح پر آئے بغیر اپنا منصب و مقصد پورا کرتے رہتے ہیں -

جن فنی وسائل کا میں ذکر کر رہا ہوں اُن میں سے ایک دوہری اور تہری ردیف کا استعمال ہے - دونوں شاعروں کے چند شعر سن کر دیکھیے کہ یہاں ردیف کے استعمال کا ایک مخصوص طریقہ کس حسن سے اپنا مقصد پورا کرتا ہے - پہلے انیس کے کچھ شعر ملاحظہ کیجیے :

سب قطرے ہیں گر فیض کے دریا ہیں تو ہم ہیں
ہر نقطۂ قرآں کے شناسا ہیں تو ہم ہیں

حق جس کا ہے جامع وہ ذخیرہ ہیں تو ہم ہیں
افضل ہیں تو ہم ، عالم و دانا ہیں تو ہم ہیں"

* * *

---

۵۲ - مرثیہ "یا رب چمن نظم کو گلزار ارم کر" مراثی انیس جلد اول صفحہ ۲۵ -

یہ جلوہ گری مہر کے پرتو میں نہیں ہے
ابرو میں جو خم ہے وہ مہِ نو میں نہیں ہے[۵۳]

* * *

مشہور ہیں جو صاحبِ توقیر وہ ہم ہیں
ہے جن کو شرف عرش پہ تحریر وہ ہم ہیں

بھیجی جنھیں اللہ نے شمشیر وہ ہم ہیں
آئی ہے جنھیں آیۂ تطہیر وہ ہم ہیں[۵۴]

* * *

اللہ نے سب طرح کی دولت ہمیں دی ہے
عزت ہمیں بخشی ہے ، شرافت ہمیں دی ہے
کونین کو بخشیں وہ سخاوت ہمیں دی ہے
قائل ہیں عرب جس کے وہ جرأت ہمیں دی ہے[۵۵]

* * *

اے میرے خوش بیاں ، مجھے اپنی صدا سنا
اے میرے نوجواں ، مجھے اپنی صدا سنا

اے میرے تن کی جاں ، مجھے اپنی صدا سنا
اے میرے قدرداں ، مجھے اپنی صدا سنا[۵۶]

* * *

---

۵۳ - مرثیہ ''یوسف کو عزیزوں نے چھڑایا جو پدر سے'' مراثی انیس جلد اول صفحہ ۱۲۸ -

۵۴ - مرثیہ ''یوسف کو عزیزوں نے چھڑایا جو پدر سے ، مراثی انیس جلد اول ص ، ۱۲۹ -

۵۵ - ایضاً ، ص ۱۳۰ -

۵۶ - مرثیہ ''جب لشکر خدا کا علم سرنگوں ہوا -'' مراثی انیس ، صفحہ ۱۶۰ -

اے پیچدار گیسوؤں والے ترے نثار
اے یادگار گیسوؤں والے ترے نثار

اے مشکبار گیسوؤں والے ترے نثار
اے میرے چار گیسوؤں والے ترے نثار[۵۷]

* * *

ماں باپ کی آسائش و راحت ہے پسر سے
تلخی میں بھی جینے کی حلاوت ہے پسر سے

خود جسم میں، آنکھوں میں بصارت ہے پسر سے
ایامِ ضعیفی میں بھی طاقت ہے پسر سے[۵۸]

* * *

دنیا بھی عجب گھر ہے کہ راحت نہیں جس میں
وہ گل ہے یہ گل بوئے محبت نہیں جس میں

وہ دوست ہے یہ دوست، مروت نہیں جس میں
وہ شہد ہے یہ شہد، حلاوت نہیں جس میں[۵۹]*

* * *

---

۵۷ - ایضاً، ص ۱۶۱ -
۵۸ - مرثیہ ''دولت کوئی دنیا میں پسر سے نہیں بہتر'' مراثی انیس جلد اول صفحہ ۱۸۴ -
۵۹ - مرثیہ ''یا رب چمن نظم کو گلزار ارم کر'' مراثی انیس جلد اول صفحہ ۱۹ -
*وقار عظیم صاحب نے ''مراثی انیس'' سے بہت سی مثالیں منتخب کی تھیں، ان نقل کی ہوئی مثالوں میں سے کچھ وہ اس جگہ کھپانا چاہتے تھے [مرتب] -

اب ردیفوں کی یہی خاموش جھنکار اقبال کے شعروں میں سنیے :

صفحۂ دہر سے باطل کو مٹایا ہم نے
نوعِ انساں کو غلامی سے چھڑایا ہم نے

تیرے کعبے کو جبینوں سے بسایا ہم نے
تیرے قرآن کو سینوں سے لگایا ہم نے[۶۰]

* * *

تھا جنہیں ذوقِ تماشا وہ تو رخصت ہوگئے
لے کے اب تو وعدۂ دیدار عام آیا تو کیا

انجمن سے وہ پرانے شعلہ آشام اٹھ گئے
ساقیا ! محفل میں تو آتش بجام آیا تو کیا

آہ جب گلشن کی جمعیت پریشاں ہو چکی
پھول کو بادِ بہاری کا پیام آیا تو کیا[۶۱]

* * *

پھول بے پروا ہیں، تو گرمِ نوا ہو یا نہ ہو
کارواں بے حس ہے، آوازِ درا ہو یا نہ ہو[۶۲]

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی

* * *

---

۶۰ - "شکوہ" بانگ درا صفحہ ۱۸۱ -
۶۱ - شمع اور شاعر ، بانگ درا ، ص ۲۰۴ -
۶۲ - ایضاً ، ص ۲۰۵ -

اس قدر ہوگی ترنم آفریں بادِ بہار
نکہتِ خوابیدہ غنچے کی نوا ہو جائے گی

آ ملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک
بزمِ گل کی ہم نفس بادِ صبا ہو جائے گی

شبنم افشانی مری پیدا کرے گی سوز و ساز
اس چمن کی ہر کلی درد آشنا ہو جائے گی[۶۳]

جن کو آتا نہیں دنیا میں کوئی فن تم ہو
نہیں جس قوم کو پروائے نشیمن، تم ہو
بجلیاں جس میں ہوں آسودہ، وہ خرمن تم ہو
بیچ کھاتے ہیں جو اسلاف کے مدفن تم ہو[۶۴]

ہو نہ یہ پھول تو بلبل کا ترنم بھی نہ ہو
چمنِ دہر میں کلیوں کا تبسم بھی نہ ہو

یہ نہ ساقی ہو تو پھر مے بھی نہ ہو، خم بھی نہ ہو
بزمِ توحید بھی دنیا میں نہ ہو، تم بھی نہ ہو[۶۵]

دوہری اور تہری ردیف کے علاوہ مصرعوں اور شعروں میں ترنم کی ایک مسلسل لہر دوڑانے کا ایک اور وسیلہ جس سے انیس

---

۶۳ - ایضاً ص ۲۱۵ -
۶۴ - جواب شکوہ، بانگ درا، ص ۲۲۳ -
۶۵ - ایضاً ص ۲۳۱ -

اور اقبال دونوں نے بڑی کثرت سے کام لیا ہے ترکیبوں اور لفظوں کی تکرار ہے جو موقع اور محل کی مناسبت سے گونا گوں صورتیں اختیار کرتی ہے - یہ گونا گوں صورتیں کیا ہیں ، اس کی تفصیل بتانے کے بجائے میں صرف مصرعے اور شعر پیش کروں گا کہ وہ آپ اپنی اور اپنے فنی مقصد کی وضاحت کرتے ہیں - پہلے انیس کے چند مصرعے اور شعر ملاحظہ کیجیے :

- - - - - - - - - - - - - - - - -

وہ گل ہے یہ گل بوئے محبت نہیں جس میں

وہ دوست ہے یہ دوست مروت نہیں جس میں

وہ شہد ہے یہ شہد ، حلاوت نہیں جس میں[۶۶]

* * *

افلاک پہ چمکی کبھی ، سر پر کبھی آئی

کوندی کبھی جوشن پہ ، سپر پر کبھی آئی

گہ پڑ گئی سینے پہ ، جگر پر کبھی آئی

تڑپی کبھی پہلو پہ ، کمر پر کبھی آئی[۶۷]

* * *

جاں باز تھے، جری تھے، مجاہد تھے، شیر تھے[۶۸]

* * *

---

۶۶ - مراثی انیس جلد اول ص ۱۹ -

۶۷ - مراثی انیس جلد اول ص ۲۶ -

۶۸ - مراثی انیس جلد اول ص ۴۴ -

ذی جاہ و ذی جلالت و ذی فہم و ذی شعور[۶۹]

* * *

میں آپ کی ، گھر آپ کا اور آپ کے دلدار[۷۰]

* * *

ہے ہے مرے سعید و رشید و متیں جواں
خوش رو جواں، غریب جواں، مہ جبیں جواں[۷۱]

* * *

صفدر جواں ، شکیل جواں ، نازنیں جواں[۷۲]

* * *

خنجر کہیں ہیں، تیر کہیں ، برچھیاں کہیں[۷۳]

* * *

فاقہ ہے جدا ، پیاس جدا ، ضعف جدا ہے[۷۴]

* * *

کس کا یہ خود ہے ، یہ تیغِ دوسر کس کی ہے؟
کس جری کی یہ کماں ہے یہ سپر کس کی ہے[۷۵]

* * *

نہ وہ آنکھیں، نہ وہ تیور، نہ وہ چتون، نہ مزاج[۷۶]

---

۶۹ - ایضاً ۴۴ -
۷۰ - مراثی انیس جلد اول صفحہ ۱۲۲ -
۷۱ - مراثی جلد اول صفحہ ۱۸۳ -
۷۲ - ایضاً ص ۱۸۳ -
۷۳ - مراثی انیس جلد اول صفحہ ۲۱۶ -
۷۴ - مراثی جلد اول صفحہ ۳۰۰ -
۷۵ - مراثی انیس جلد دوم صفحہ ۹۸ -
۷۶ - ایضاً ص ۱۰۰ -

اب اقبال کے مصرعوں اور شعروں میں تکرار کی مختلف صورتیں اور ان سے پیدا ہونے والی ترنم اور نغمگی کی کارفرمائیاں ملاحظہ کیجیے :

آمتیں اور بھی ہیں ، ان میں گنہگار بھی ہیں
عجز والے بھی ہیں مستِ مے پندار بھی ہیں
ان میں کاہل بھی ہیں، غافل بھی ہیں، ہشیار بھی ہیں
سینکڑوں ہیں کہ ترے نام سے بیزار بھی ہیں[۷۷]

* * *

دردِ لیلیٰ بھی وہی ، قیس کا پہلو بھی وہی
نجد کے دشت و جبل میں رمِ آہو بھی وہی
عشق کا دل بھی وہی ، حسن کا جادو بھی وہی
آمتِ احمدؐ مرسل بھی وہی ، تو بھی وہی[۷۸]

* * *

زندگی قطرے کی سکھلاتی ہے اسرارِ حیات
یہ کبھی گوہر، کبھی شبنم ، کبھی آنسو ہوا[۷۹]

* * *

دانہ بھی تو، کھیتی بھی تو، باراں بھی تو، حاصل بھی تو[۸۰]

* * *

---

۷۷ - بانگ درا صفحہ ۱۸۱ -
۷۸ - بانگ درا صفحہ ۱۸۳ -
۷۹ - بانگ درا صفحہ ۲۰۹ -
۸۰ - ایضاً ص ۲۱۲ -

راہ تو رہرو بھی تو ، رہبر بھی تو، منزل بھی تو[۸۱]

ناخدا تو ، بحر تو، کشتی بھی تو، ساحل بھی تو[۸۲]

قیس تو، لیلیٰ بھی تو ، صحرا بھی تو، محمل بھی تو[۸۳]

* * *

یہ نہ ساقی ہو تو پھر مے بھی نہ ہو، خم بھی نہ ہو
بزمِ توحید بھی دنیا میں نہ ہو ، تم بھی نہ ہو[۸۴]

دشت میں ، دامنِ کہسار میں ، میدان میں ہے
بحر میں ، موج کی آغوش میں ، طوفان میں ہے[۸۵]

میرے لب پر قصۂ نیرنگیِ دوراں نہیں
دل مرا حیراں نہیں ، خنداں نہیں ، گریاں نہیں[۸۶]

تو ہو اگر کم عیار ، میں ہوں اگر کم عیار
موت ہے تیری برات ، موت ہے میری برات[۸۷]

---

۸۱ - ایضاً ، ص ۲۱۲ -
۸۲ - ایضاً ، ص ۲۱۲ -
۸۳ - ایضاً ، ص ۲۱۲ -
۸۴ - ایضاً ، ص ۲۳۱ -
۸۵ - ایضاً ، ص ۲۳۱ -
۸۶ - ایضاً ، ص ۲۵۴ -
۸۷ - بال جبریل صفحہ ۱۲۷ -

اسی کے بیاباں ، اسی کے ببول
اسی کے ہیں کانٹے ، اسی کے ہیں پھول[۸۸]

زمیں شیرِ مولا ، جہاں اس کا صید
زمیں اس کی صید ، آسماں اس کا صید[۸۹]

نغمہ و ترنم کے سلسلے کی ایک کڑی اور آج کی گفتگو میں آخری کڑی ایک لفظی صنعت کا ذکر ہے جسے انیس اور اقبال دونوں نے بڑی مہارت ، چابکدستی سے ، لطیف فن کارانہ انداز میں استعمال کیا ہے - لفظی اور معنوی صنعتوں کو ہماری روایت شعری میں ہمیشہ اہمیت حاصل رہی ہے اور ہم شاعروں کے کلام میں بے ساختگی اور بے تکلفی سے اور بعض اوقات ارادی صناعی کے ساتھ استعمال ہونے والی صنعتوں کی داد دیتے رہے ہیں - حسن تعلیل ، مراعاۃ النظیر ، لف و نشر ، تضاد ، تجنیس ، تلمیح اور ترصیع اور مبالغہ ایسی صنعتیں ہیں جن پر انیس اور اقبال کے کلام کا تجزیہ کرنے والوں نے بھی بحث کی ہے اور یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ان دونوں شاعروں نے جو محامن شاعری کے سلسلے میں بڑی لطیف نازک حس رکھتے ہیں ، ان صنعتوں کے استعمال میں کبھی مبالغے اور افراط سے کام نہیں لیا - صنعتیں کہیں کلام کی بے تکلفی اور بے ساختگی میں فرق نہیں آنے دیتیں - وہ ہمیشہ حسن کلام میں اضافے کا سبب بنتی ہیں ، اور خیال کے اظہار اور ابلاغ کو زیادہ موثر بناتی ہیں ، لیکن جس لفظی صنعت کی طرف میں اشارہ کر رہا ہوں ، اس کے باوجود کہ وہ انیس اور اقبال دونوں کی ترنم پسند شاعرانہ افتاد

---

۸۸ - بال جبریل ، ص ۱۷۰ -
۸۹ - بال جبریل ، ص ۱۷۴ -

سے بڑی مناسبت رکھتی ہے - اس کا ذکر انیس اور اقبال کے محاسن کلام میں بعض اوقات صرف سرسری انداز میں اور بعض اوقات محض ضمنی طور پر آیا ہے - یہ صنعت تکرار کی صنعت ہے جسے انگریزی میں Allitration کہتے ہیں - انیس اور اقبال دونوں بعض دوسری چیزوں کی طرح اس صنعت سے بھی مصرعوں اور شعروں میں وہ خاموش غنائی کیفیت پیدا کرتے ہیں جو شعر کی داخلی اور خارجی سطحوں پر اپنا مؤثر عمل جاری رکھتی ہے - ایسے چند مصرعوں اور شعروں کی مثالیں پہلے انیس کے کلام میں سے سنیے اور پھر اقبال کے کلام میں سے - کلام انیس کی یہ چند مثالیں مراثی انیس کی جلد اول کے ساتویں ، نویں اور چھبیسویں مرثیے سے ماخوذ ہیں :

حیرت ہے مرے دیدۂ دیدار طلب کو

* * *

اولاد والو درد کرو شہ کے دل کا یاد

* * *

درجِ دہن پہ لعل و عقیقِ یمن نثار
غنچے نثار ، پھول تصدق ، چمن نثار

حسنِ بیاں پہ طوطیِ شکر شکن نثار
شورِ نمک پہ شاعرِ شیریں سخن نثار

* * *

دشوار ہے یہ امر کہ رکنِ رکیں ہٹے

* * *

گھر کا خدا کے رکنِ رکیں ہے کہاں ہٹے

* * *

شرما کے شرک و کفر نے سر کو فرو کیا

* * *

خوش‌خو و خوش خرام و خوش اندام و خوش بجام

* * *

گل پوش و تیز ہوش و سمن گوش و سرخ فام

* * *

وہ ساز اور وہ زینِ مرصع کی زیب و زیں

* * *

تلوار رن میں گر کسی فرہنگ سے چلی

اقبال کی مثالیں بھی صرف دو تین نظموں سے ماخوذ ہیں :

عشق کو عشق کی آشفتہ سری کو چھوڑا
رسمِ سلمان و اویسِ قرنی کو چھوڑا

* * *

شمع کو بھی ہو ذرا معلوم انجامِ ستم
صرفِ تعمیرِ سحر خاکسترِ پروانہ کر

* * *

خفتگانِ لالہ زار و کوہسار و رودبار
ہوتے ہیں آخر عروسِ زندگی سے ہمکنار

* * *

یاد سے تیری دلِ درد آشنا معمور ہے

* * *

دستِ دولت آفریں کو مزد یوں ملتی رہی

* *

خونِ جگر سے صدا سوز و سرور و سرود

* * *

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں ، کار کشا ، کارساز

انیس اور اقبال کے شعری سرمائے میں سے صرف چند حصے پیشِ نظر رکھ کر ان دونوں عظیم شاعروں کے فن کے جن مشترک پہلوؤں کی نشاندہی میں نے کی ہے ، یہ حقیقت میں ہماری مخصوص شاعرانہ روایت کے ایسے پہلو ہیں کہ اردو کے کسی دو بڑے شاعروں کے کلام کو ایک دوسرے کے مقابل رکھ کر ان عناصر کی تلاش کریں تو ہمیں اندازہ ہوگا کہ جن شاعروں نے روایت کو اپنا عزیز سرمایہ جانا اور اس کے قرب اور ہم نشینی کی لذتیں

اٹھائی ہیں ، ان کے فکر و خیال کی دنیائیں ایک دوسرے سے خواہ کتنی ہی مختلف اور کتنی ہی دور کیوں نہ ہوں ، ان تک رسائی حاصل کرنے کے لیے طواف ، روایت ہی کے کعبے کے گرد کرنا پڑتا ہے اور سر اسی کے آستانے پر جھکانا پڑتا ہے ، اس لیے کہ جو اس آستانے سے روگردانی کرے ، دو چیزیں اس کا مقسوم و مقدر بنتی ہیں :

گم کردہ راہی اور دوریِ منزل!

(ماہِ نو ، کراچی ، انیس نمبر ، اضافی شمارہ ، ۱۹۷۲ء
صفحہ ۲۰۰ - ۲۰۸ و ۲۶۷)

شذرات متعلق بہ اقبال

''شذرات— متعلق بہ اقبال'' کے بارے میں یہاں کچھ کہنا شاید بے محل نہ ہو - یہ اقبال پر وقار عظیم صاحب کی کوئی مستقل تحریر نہیں - اقبال یا اقبالیات کے بارے میں بعض استفسارات کا جواب دیتے ہوئے ، یا اقبال سے قطع نظر اپنے دوسرے ادبی اور تنقیدی مقالات میں ضمناً وقار عظیم صاحب نے اقبال کے بارے میں اگر کہیں اظہارِ خیال کیا ہے تو اسے بقیدِ حوالہ اقتباس کر لیا گیا ہے - اس کام کی بجاآوری میں وقار عظیم صاحب کی ساری تحریریں لازماً پیش نظر نہیں رہیں ، اس لیے ان متفرق تراشوں میں اضافے کی گنجائش سے انکار نہیں کیا جا سکتا -

اقبال ، یا اقبالیات کے سلسلے میں یہ آراء اگرچہ ضمناً ظاہر کی گئی ہیں ، لیکن ان پر وقارعظیم صاحب کی مانوس خوش بیانی اور منطقی خوش استدلالی کی مخصوص چھاپ ہر جگہ صاف دکھائی دیتی ہے - بعض صورتوں میں ان ''شذرات'' سے اقبال اور اقبالیات سے متعلق وقارعظیم صاحب کے نقطۂ نظر پر روشنی پڑتی ہے یا اس کے آئینے میں اقبال پر کام کرنے کی نئی راہیں مستنیر ہوتی ہیں - اس بنا پر یقین ہے کہ ان کا مطالعہ لطف سے خالی نہیں ہوگا اور اس کوشش کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا -

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن

○

''اقبال کے خطبات میں جس طرح کے مطالب اور مباحث آئے ہیں ، اس سے پہلے اردو میں پیش نہیں کیے گئے اور اردو خواں طبقے کے سامنے انگریزی میں بھی ایسے مطالب کبھی نہیں آئے ۔ اقبال کا اسلوب ایک ایسے آدمی کا ہے جو ہر بات کو فلسفی کی نظر سے دیکھتا ہے اور ہر مسئلے پر مفکر کی حیثیت سے غور کرتا ہے ۔ بعض اوقات اس کے ذہن میں کچھ چیزیں محفوظ ہوتی ہیں ، وہ ان کا اظہار بعض الفاظ کے ذریعے کرتا ہے ۔ اپنی طرف سے تو وہ سمجھتا ہے کہ میں نے بات پوری طرح بیان کر دی ، مگر کچھ چیزیں اس کے ذہن میں ہی رہتی ہیں ، جو اس بات کا اصل پس منظر ہوتا ہے ۔ چنانچہ اسی وجہ سے عام قاری انھیں سمجھنے میں دقت محسوس کرتا ہے ۔ اس مشکل کو آسان بنانے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ اقبال کے کلام کے علاوہ ، ان خطوں اور بیانات کو پڑھا جائے جو انھوں نے اپنے فلسفے کی توضیح و تشریح میں لکھے ہیں ۔ دراصل یہ خطبات ایک دفعہ پڑھنے کے بعد تو واقعی سمجھ میں نہیں آتے ، مگر دو چار بار پڑھنے سے ضرور سمجھ میں آ سکتے ہیں ۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم نے ''فکرِ اقبال'' میں خطباتِ اقبال کا جو خلاصہ دیا ہے وہ عام اردو قاری کے لیے بہت اچھا ہے ۔

خطبات میں جو اصطلاحیں اردو ترجمے میں استعمال کی گئی ہیں ، ان سے لوگ مانوس نہیں ، انگریزی اصطلاح کا مفہوم بالعموم ذہن میں واضح ہوتا ہے ، لیکن اردو کی اصطلاح کا مفہوم ، اس کے متعلقات خود فراہم کرنے ہوتے ہیں اس لیے دقت ہوتی ہے ۔ نذیر نیازی صاحب نے اقبال کے کہنے پر ہی ترجمہ شروع کیا تھا اور کچھ حصوں کا ترجمہ

اقبال نے خود بھی دیکھا تھا - حال ہی میں مجلس ترقیِ ادب، لاہور نے خطباتِ اقبال کے ترجمے کا منصوبہ بنایا ہے - اس میں ہر خطبے کا ترجمہ الگ الگ آدمی سے کرایا جائے گا - ترجمہ کرنے والوں میں پروفیسر حمید احمد خاں اور ڈاکٹر محمد اجمل وغیرہ شامل ہیں - ایک باب کا ترجمہ میرے سپرد بھی کیا گیا ہے[1] — اولاً اصطلاحات کے ترجمے متعین کیے جائیں گے اور پھر آخر میں پورا مسودہ دیکھ کر اسے یکساں اور درست کر لیا جائے گا ، اس لیے امید ہے کہ ترجمے میں کوئی اجنبیت نہیں رہے گی -"

(پروفیسر سید وقار عظیم سے ایک انٹرویو ،
رفیع الدین ہاشمی ، یکم اپریل ۱۹۷۳ء)

* * *

"اقبال کی تاریخِ پیدائش کے متعلق مختلف روایتیں ہیں — ۱۸۷۵ء والی روایت تو خاصی کمزور ہے - میونسپل کمیٹی، سیالکوٹ کے رجسٹر پیدائش میں جو اندراجات ہیں ، ان کے مطابق ۱۸۷۳ء کے سال میں دو لڑکوں کی پیدائش دکھائی گئی ہے - کہا جاتا ہے کہ یہ دونوں شیخ نور محمد کے لڑکے تھے اور ان میں سے ایک اقبال تھے - دونوں بچوں کی پیدائش کے درمیان دس مہینے کا وقفہ ہے اور یہ بات کچھ دل کو نہیں لگتی - اب اگر اس بات کی تحقیق ہو جائے کہ ان دونوں میں سے ایک تو شیخ نور محمد کا لڑکا تھا اور دوسرا کسی اور نور محمد کا — تو پھر اقبال کا سالِ ولادت

---

۱ - پروفیسر حمید احمد خاں (وفات ۲۲ مارچ ۱۹۷۴ء) اور پروفیسر سید وقار عظیم (۱۷ نومبر ۱۹۷۶ء) کی رحلت سے خطبات کے ترجمے کا یہ منصوبہ ناتمام رہ گیا -

۱۸۷۳ء ہی درست ہوگا ـــــ اس سلسلے میں ایک بات اور ہے اور وہ یہ کہ اقبال کی زندگی میں ۹ - جنوری ۱۹۳۸ء کو ہندوستان بھر میں پہلا ''یومِ اقبال'' منایا گیا - اس موقع پر لاہور انٹر کالجیٹ مسلم برادر ہڈ کی طرف سے ''مقالاتِ یومِ اقبال'' نام کا جو مجموعہ چھپا ، اس کے دیباچے میں کہا گیا تھا کہ اقبال نے زندگی کی پینسٹھ منزلیں طے کر لی ہیں -[1] اس حساب سے ان کا سنِ پیدائش ۱۸۷۳ء بنتا ہے - یہ بات اقبال کی زندگی ہی میں کہہ دی گئی تھی اور وہ اس پر خاموش رہے ، گویا اس بات کو خود ان کی تائید بھی حاصل ہے ، اس لحاظ سے تو ۱۸۷۳ء ہی درست ہے -

اقبال نے اپنے پی ایچ - ڈی - کے مقالے کے شروع میں اپنے مختصر حالاتِ زندگی لکھے ہیں ، اس میں انھوں نے اپنے ہجری سنِ پیدائش کے ساتھ بریکٹ میں عیسوی سن ۱۸۷۶ء لکھ دیا مگر دونوں میں مطابقت نہیں ، اس پر بہت بحث ہوئی ہے - اس معاملے میں تحقیق کرنے کے لیے ''بزمِ اقبال'' لاہور نے ایک کمیٹی مقرر کی تھی - اس کے تین چار اجلاس ہو چکے ہیں - اب فیصلہ ہوا ہے کہ نذیر نیازی صاحب اور محمد عثمان صاحب (سیکرٹری ''بزمِ اقبال'') سیالکوٹ جائیں اور وہاں بعض افراد خصوصاً علامہ اقبال کے خاندان کے افراد سے مل کر ، سوالات کر کے تحقیق کریں اور پھر اس رپورٹ کی روشنی میں کمیٹی کوئی فیصلہ کرے گی - اندازہ ہے کہ

---

۱ - ''حضرت علامہ مرحوم کو تو دنیا کے ہر کونے سے . . . . زندگی کی پینسٹھ منزلیں طے کرنے پر مبارکباد کے خطوط اور تار موصول ہوئے -'' (محمد شفیع ، مقالاتِ یومِ اقبال ، لاہور ، صفحہ ۷)

اس میں تقریباً ایک ماہ لگے گا۔"[1]

(سید وقار عظیم ، ایضاً ، گفتگو یکم اپریل ۱۹۷۳ء)

* * *

"اقبال کی وفات کو صرف پینتیس سال گزرے ہیں مگر اس عرصے میں اقبال پر اس قدر لکھا جا چکا ہے ، جتنا غالب کی وفات کے پینتیس سال بعد تک یقیناً نہیں لکھا گیا تھا ، بلکہ وہ اس کے مقابلے میں بہت ہی کم تھا - آپ یوں دیکھیے کہ اس عرصے میں اقبال کے مختلف پہلوؤں پر پنجاب یونیورسٹی میں ایم - اے کے چالیس پچاس کے قریب مقالات لکھے گئے - اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو اقبال سے کتنی دلچسپی ہے - ظاہر ہے یہ کام شوق اور وابستگی کے بغیر نہ ہو سکتا ہے ، نہ کرایا جا سکتا ہے - پھر آپ دیکھیں گے کہ اقبال اکیڈمی نے اقبال پر خاصی بڑی تعداد میں کتابیں شائع کی ہیں ، البتہ یہ درست ہے کہ اقبال پر تحقیقی کام نہیں ہوا -"

(ایضاً ، گفتگو ، یکم اپریل ۱۹۷۳ء)

* * *

"اقبالیات پر اب تک جو لٹریچر شائع ہوا ہے ، اس میں ایک بات بڑی وضاحت سے طے کر دی گئی ہے کہ اقبال کا اسلام سے بڑا گہرا تعلق تھا اور انہوں نے قیامِ پاکستان پر

---

۱ - اقبال کی تاریخ ولادت کا صحیح تعین کرنے کے لیے حکومت پاکستان نے وفاقی سیکرٹری تعلیم ڈاکٹر محمد اجمل کی سرکردگی میں جو تحقیقاتی کمیٹی قائم کی تھی ، اس نے روزنامہ نوائے وقت ، لاہور کی اشاعت مورخہ ۲ فروری ۱۹۷۴ء کے مطابق ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کی توثیق کی ہے - (مرتب)

بڑا زور دیا اور اس کی تخلیق میں ان کا بڑا دخل ہے ۔''

(ایضاً ، یکم اپریل ۱۹۷۳ء)

* * *

''ہندوستان میں اقبال پر پی ایچ ۔ ڈی ۔ کے چند مقالات لکھے گئے ہیں ۔ ایک تو ڈاکٹر اکبر حسین قریشی کا مقالہ ''تلمیحات و اشاراتِ اقبال''[۱] ہے ۔ دوسرے ڈاکٹر عبدالحق کے تحقیقی مقالے کے ایک حصے کا اضافہ شدہ متن ''اقبال کے ابتدائی افکار''[۲] —— اس کے علاوہ بعض لوگ اقبال پر مسلسل لکھتے رہے ہیں جن میں رشید احمد صدیقی[۳] ، آل احمد سرور[۴] ڈاکٹر یوسف حسین خان[۵] ، جگن ناتھ آزاد[۶] ، غلام السیدین مرحوم اور ڈاکٹر عابد حسین خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں ۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ پاکستان بن جانے کے بعد بھی اقبال سے ان کی وابستگی قائم ہے ۔''

(ایضاً ، یکم اپریل ۱۹۷۳ء)

* * *

---

۱ ۔ شائع کردہ : انجمن ترقیِ اردو (ہند) علی گڑھ ، ۱۹۷۰ء ۔

۲ ۔ شائع کردہ : مسعود احمد ، پہاڑ پور ، مچھلی شہر ، جون پور ، مارچ ۱۹۶۹ء ۔

۳ ۔ اقبال ، شخصیت اور شاعری (رشید احمد صدیقی) ، اقبال اکادمی ، لاہور ، ۱۹۷۶ء ۔

۴ ۔ عرفانِ اقبال (آلِ احمد سرور) مرتبہ : زہرا معین ، مطبوعہ ، تخلیق مرکز ، شاہ عالم مارکیٹ ، لاہور ، ۱۹۷۰ء ۔

۵ ۔ حافظ اور اقبال (ڈاکٹر یوسف حسین خاں) : صفحات ۳۲۲ ، ۱۹۷۶ء ۔

۶ ۔ اقبال اور مغربی مفکرین (جگن ناتھ آزاد) : اکتوبر ۱۹۷۶ء ۔

''اقبال پر بعض لوگ اس لیے بھی کھل کر نہیں لکھتے کہ اعتراضات کا خدشہ ہوتا ہے اور لوگوں کو ایسی باتیں اچھی نہیں لگتیں جن سے اقبال کی زندگی کا بے تکلفانہ پہلو سامنے آتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اندر انسانی کمزوریاں تھیں ، مثلاً خان نیازالدین خاں مرحوم کے نام خطوں میں اقبال کبوتروں کا ذکر بڑے شوق اور دلچسپی کے ساتھ برابر کرتے ہیں —— اسی طرح جب میں ''ماہِ نو'' میں تھا' تو ایک بار مرزا جلال الدین سے ملاقات ہوئی ، انھوں نے بتایا کہ میرے پاس اقبال سے متعلق بعض ایسی چیزیں ہیں جو اور کسی کے پاس نہ ہوں گی ، مگر انھیں منظرِ عام پر لانا اس لیے مشکل ہے کہ ہر طرف سے اعتراضات کی بوچھاڑ ہوگی - بات یہ ہے کہ اقبال ہمارا ہیرو ہے مگر جو لوگ ان کے بارے میں سچی بات کہتے ہوئے ڈرتے ہیں ، شاید وہ سمجھتے ہیں کہ اس سے ان کی عظمت میں فرق آ جائے گا - در حقیقت وہ اقبال کی عظمت کو نہیں پہچانتے - اقبال کی عظمت اس میں ہے کہ ان کی زندگی اور شخصیت کی سچی تصویر لوگوں کے سامنے پیش کی جائے -''

(ایضاً ، یکم اپریل ۱۹۷۳ء)

* * *

''ایک بار مجلسِ ترقیِ ادب (لاہور) نے طے کیا کہ دیہات میں اقبال کا کلام پہنچانے کے لیے اس کے ترجمے علاقائی زبانوں مثلاً پنجابی اور پشتو وغیرہ میں وسیع پیمانے پر شائع کیے جائیں —— لیکن میرا خیال تھا کہ اقبال کی ایک ایک کتاب کا پورا ترجمہ شائع کرنے کے بجائے یہ زیادہ بہتر ہوگا

---

۱ - سید وقار عظیم : مدیر ماہِ نو ، کراچی ۱۹۴۷ء — جنوری ۱۹۵۰ -

کہ اقبال کے پورے کلام سے ایسے آسان حصے انتخاب کیے جائیں جو دیہاتیوں کے مزاج کے مطابق ہوں اور جسے وہ آسانی سے سمجھ سکیں۔ ان منتخب حصوں کے ترجمے ایک کتاب کی شکل میں شائع کیے جائیں تو یہ زیادہ مفید ہوگا۔ امید ہے کہ اس شکل میں کلامِ اقبال کی اشاعت کے لیے کوئی نہ کوئی ادارہ کچھ کام کرے گا۔"

(ایضاً ، یکم اپریل ۱۹۷۳ء)

* * *

"اقبال پر مغربی شعراء اور مغربی مفکروں کے اثرات پر بھرپور تحقیق ہونی چاہیے۔ اس موضوع پر کافی لکھا گیا ہے مگر مزید گہرے تحقیقی مطالعے کی ضرورت ہے۔"

(ایضاً ، یکم اپریل ۱۹۷۳ء)

* * *

"یہ بھی ضروری ہے کہ پاکستان کے لیے کلامِ اقبال کی اہمیت واضح کی جائے اور بتایا جائے کہ نوجوانوں کے لیے اور مسلمانوں کے لیے اقبال کا کیا پیغام ہے اور اس کی کیا اہمیت ہے ، صرف اسی طرح مطالعۂ اقبال کے تقاضے پورے ہو سکتے ہیں۔" (ایضاً ، یکم اپریل ۱۹۷۳ء)

* * *

"مجلسِ ترقیِ ادب (لاہور) نے ایک کام میرے سپرد کیا ہوا ہے اور وہ یہ کہ اقبال کی زندگی میں اُن کی شخصیت اور فکر و فن پر جو مضامین شائع ہوئے ، اُن کا ایک اچھا سا انتخاب مرتب کر دوں ، اس کے ساتھ مقدمہ ہو اور حواشی بھی۔ میں ایسے مضامین کی تلاش کر رہا ہوں اور خاصا کام

ہو چکا ہے ۔[1] حواشی اور مقدمہ اس غرض سے لکھا جائے گا کہ اقبال کی شخصیت اور شاعری کے متعلق بعض باتوں اور اعتراضات کی وضاحت کی جائے ۔[2] مثلاً اقبال کو ''سر'' کا خطاب ملا تو اس کی حمایت و مخالفت میں کئی مضمون لکھے گئے ۔ اسی طرح ''اسرارِ خودی'' کی بحثوں پر مشتمل کئی مضامین اقبال کی زندگی میں شائع ہوئے ۔ اقبال نے اپنے بعض خطوں میں بعض کتابوں کا حوالہ دیا ، حواشی میں ان کی وضاحت ہوگی ۔ غرض اس طرح کی وضاحتیں ہوں گی جو اقبال کے متعلق بہت سی باتوں کو سمجھنے میں مدد دیں گی۔''

(ایضاً ، یکم اپریل ۱۹۷۳ء)

* * *

''یہ بہت ضروری ہے کہ اقبال کے خطوں پر حواشی لکھے جائیں ۔ میں ''اقبال---معاصرین کی نظر میں'' کے تحت جو مجموعہ مرتب کر رہا ہوں ، اس میں ، میں نے حواشی کا اہتمام کیا ہے ۔ مثلاً اقبال نے کہیں لکھا کہ فلاں کتاب میں یہ بات آئی ہے تو میں نے اس کتاب کا متعلقہ حصہ حاشیے میں درج کر دیا ، خطوں کو بھی اسی طرح مرتب ہونا چاہیے ۔''

(ایضاً ، یکم اپریل ۱۹۷۳ء)

* * *

---

۱ ۔ یہ انتخاب ''اقبال—معاصرین کی نظر میں'' کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہو چکا ہے ۔ ناشر : مجلسِ ترقیِ ادب ، لاہور ، طبع اول : دسمبر ۱۹۷۳ء ، صفحات : ۵۴۳ ۔

۲ ۔ مقدمہ : صفحہ ۱۱-۲۴ حواشی : ۴۲۳-۵۰۳ ۔

"حالی کے مسدس کی ایک حیثیت تو اس کا وہ تقدس ہے جو اس کے بے لوث خلوص کی بنا پر اسے ملا ہے لیکن اس کی دوسری حیثیت اس کی وہ مقناطیسی کشش ہے جس نے حالی کے ہم عصروں اور آن کے بعد آنے والے شاعروں کو اپنی طرف کھینچا اور آنھوں نے بھی مسلمان کے خوابوں اور اس کی آرزوؤں کو اپنی شاعری کا محور و مرکز بنایا اور یوں ملی شاعری کے پرخار و پرخطر سفر میں حالی کی مثال نے ایک سنگِ میل اور اس کے میلِ حوادث میں ایک روشنی کے مینار کا کام دیا۔

اس واضح سنگِ میل اور اس روشن مینار نے شبلی، حسرت، ظفر علی خاں اور اقبال جیسے شاعروں کو شعر و سخن کی ایک نئی راہ دکھائی اور اس راہ پر چل کر ان شاعران ملت نے جو کچھ کہا، وہ مسلمان کی زندگی کے ہر دور کا آئینہ ہے۔ یہاں آس کا ماضی، حال اور مستقبل سب اپنے اصلی روپ میں دکھائی دیتا ہے۔ یہاں آس کے ماضی کا شکوہ، حال کی مایوسی اور اس کے مستقبل کی آرزو ایک ہی زنجیر کی کڑیاں بن جاتی ہیں۔ لیکن ان چاروں شاعروں کی ملی شاعری کا انداز اور اسلوب ایک دوسرے سے الگ اور دائرۂ فکر و خیال ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ . ."

(فن اور فن کار، لاہور ۱۹۶۶ء ص ۲۴۷)

* * *

"اقبال کی ملی شاعری ایک بحر ناپیدا کنار ہے جو پوری حیاتِ انسانی پر محیط ہے۔ آس کی شاعری کی بنیاد قرآنِ حکیم کی تعلیم اور رسولِ کریم ؐ کے آن ارشادات و معمولات پر ہے

جن سے ہر زمانے کا انسان اپنے لیے زندگی کا صحیح اور متوازن ضابطہ مرتب کر سکتا ہے - اقبال نے اسلام کے ماضی کی روشنی میں عہد حاضر کے مسلمانوں کو عمل کی وہ راہ دکھائی جو اُسے شرف و بزرگی کی اعلیٰ ترین منزل تک پہنچاتی ہے - اقبال نے مسلمان کو ایک بار پھر مسلمان اور نیابتِ الٰہی کا حق دار بننے کا فلسفہ سکھایا ہے اور یوں اُن کی ملی شاعری ، ملت کی آرزوؤں اور اُمنگوں کا آئینہ ہونے کے ساتھ ساتھ زندگی کا مربوط فلسفہ ہے جس کا رازداں بننے کے لیے انسان کو حکمت کے سمندروں کی غواصی کرنی پڑتی ہے -''

(فن اور فن کار ، ص ۲۴۸)

* * *

''غزل ایسے بے شمار مضامین کا مجموعہ ہوتی ہے جنھیں کسی طرح بھی باہم ایک رشتے میں نہیں پرویا جاسکتا - یہاں تک کہ اکثر اوقات یہ ہوتا ہے کہ ان مختلف النوع مضامین کا اظہار کرنے والے شعروں میں کیفیت یا Mood کی یکسانی بھی نہیں ہوتی--- کیفیت کی وہ یکسانی یا رچاؤ جس کی بدولت میر ، مصحفی ، مومن ، غالب . . . - اقبال . . . اور فیض کو اُن کا مخصوص مقام اور مرتبہ ملا ہے -''

(فن اور فن کار ، ص ۲۶۱)

* * *

''غزل خواہ میر کی ہو ، خواہ درد ، مصحفی . . . مومن ، غالب . . . . اقبال . . . فراق اور فیض کی ، شاعروں کے انفرادی مزاج اور طرز کی نمائندگی کرنے کے علاوہ ، جس

کیفیت میں مشترک ہے ، اسے ہم نے تغزل کا نام دیا ہے اور خیال ، جذبے اور بیان کی بعض جمالیاتی خصوصیتوں کو اس کی اساس ٹھہرایا ہے ۔''

(فن اور فن کار ، ۲۷۳)

* * *

''غزل کی روایت فارسی سے کیف و سرور کا سرمایہ فراہم کرتی ہوئی میر اور اقبال کے واسطے اور وسیلے سے جس حالت میں ہم تک پہنچی ہے اس میں جذبے کی شدت اور گہرائی ، خیال کی وسعت اور پہنائی ، تجربے کا تنوع اور ہمہ گیری ، بیان کی لطافت اور نزاکت اور بہ حیثیتِ مجموعی مزاج کا لوچ اور لچک اس کی امتیازی خصوصیات ہیں ۔ اس کے مزاج کی انھیں خصوصیات نے اسے ایک ایسی قائم اور باقی رہنے والی روایت دی ہے جس کا سلسلہ . . . ایک مخصوص انداز میں میر سے شروع ہو کر اقبال تک پہنچتا ہے ۔''

(قلمی مقالہ : غزل اور ناصر کاظمی)

* * *

''میر ، غالب ، حالی ، اکبر اور اقبال کی شخصیتیں ہماری شاعری میں روایت اور تجربے کے امتزاج کی نمایاں مثالیں ہیں ۔ یہ سب شاعر ارادتاً یا غیر ارادی طور پر اپنے آپ کو بدلتے ہوئے زمانے سے ہم آہنگ بنانے کی کوشش میں مصروف رہے ہیں ۔''

(مغتنم روایتیں ، نقوش ، لاہور ، شمارہ ۱۳ ، ص ۳۰)

* * *

''انتظار حسین کے یہ بارہ افسانے (''گلی کوچے'') جس طرح

فن کے نقطۂ نظر سے تکلفات سے بری ہیں ، اسی طرح بیان کے رسوم میں بھی ہر طرح آزاد ہیں - یہاں پر بڑی سے بڑی بات بھی اسی سادگی سے اور بغیر کسی اہتمام کے کہی جاتی ہے جیسے کوئی معمولی بات---غالب ، میر اور اقبال کے شعروں کا کوئی مضمون اگر افسانہ نگار کی بات کے اظہار کے لیے سب سے اچھا وسیلہ ہے تو اس مضمون کو یوں اپنا لیا جاتا ہے، جیسے وہ اسی خاص محل کے لیے مخصوص تھا ۔''
(روزنامہ آفاق ، لاہور ، ۳۰ جون ۱۹۵۲ء ، ص ۵)

* * *

''بعض شاعروں کے یہاں انیس کے رنگ کی جھلک ہے اور بہت سے شاعروں نے اقبال کے ملے جلے فکری اور رومانی انداز کو اپنایا ہے - اقبال نے نئی شاعری کو نمایاں فکری رجحان دیا جس میں انسان کی عظمت کے ذکر کو سب سے نمایاں حیثیت حاصل ہے -

اس میں شک نہیں کہ اپنے اپنے مخصوص طرز میں احسان دانش ، احمد ندیم قاسمی ، جعفر طاہر ، مصطفیٰ زیدی اور سجاد باقر رضوی انسان کے بلند رتبے کا ذکر بڑے جوشیلے اور حقیقت پسندانہ انداز میں اپنی نظموں میں بھی کرتے ہیں اور غزلوں میں بھی ، لیکن بعض جگہ صاف معلوم ہوتا ہے ، یہ خیال شاعروں نے اقبال سے لیا اور اسے اپنا بنا کر پیش کر دیا ہے - میں دو مثالوں پر اکتفا کرتا ہوں---جمیل ملک کے ان اشعار میں اقبال کی ''پیام مشرق'' والی آواز صاف سنائی دے رہی ہے :

یہ منظر ، یہ روپ انوکھے ، یہ شہ کار ہمارے ہیں
ہم نے اپنے خونِ جگر سے کیا کیا نقش اُبھارے ہیں

صدیوں کے دل کی دھڑکن ہے ان کی جاگتی آنکھوں میں
یہ جو فلک پر ہنس مکھ جگ مگ، جگ مگ کرتے تارے ہیں

ایک ذرا سی بھول پہ ہم کو اتنا تو بدنام نہ کر
ہم نے اپنے گھاؤ چھپا کر تیرے کاج سنوارے ہیں

کچھ باتیں ، کچھ راتیں ، کچھ برساتیں ، اپنا سرمایہ
ماضی کے اندھیارے میں یہ جلتے دیپ ہمارے ہیں

دوسری آواز ، احمد فراز کی ہے جو اپنے عہد میں پیام اقبال کی ناقدری دیکھ کر تڑپ اٹھتا ہے اور پیمبرِ مشرق کے حضور میں اپنے دردِ دل کا حال یوں پیش کرتا ہے :

خیال تھا کہ شکستِ قفس کے بعد بھی ہم
ترے پیام کے روشن چراغ دیکھیں گے

رہے گا پیشِ نظر تیرا آئنہ جس میں
ہم اپنے ماضی و فردا کے داغ دیکھیں گے

مگر جو حال طلوعِ سحر کے بعد ہوا
جو تیرے درس کی تحقیر ہم نے دیکھی ہے

بیاں کریں بھی تو کس سے، کہیں تو کس سے کہیں
جو تیرے خواب کی تعبیر ہم نے دیکھی ہے

عروجِ عظمتِ آدم تھا مدعا تیرا
مگر یہ لوگ نقوشِ فنا اُبھارتے ہیں

کس آسماں پہ ہے تو اے پیمبرِ مشرق
زمیں کے زخم تجھے آج بھی پکارتے ہیں

''عظمتِ آدم کا یہ تصور ہمارے شاعروں کو میر اور غالب کی شاعری سے بھی ملا ہے ، لیکن اس کی تکمیل کلام اقبال میں ہوئی اور اقبال نے اس عظمت کو جس ذات میں مجسم دیکھا وہ رسولِ مقبول ؐ کی ذات تھی ۔

پاکستان کے قیام کے بعد شاعری میں دینی احساس نے جو مختلف صورتیں اختیار کیں ان میں حمد بھی ہے ، نعت بھی اور منقبت بھی لیکن نعت ہماری نظم اور غزل کا مستقل موضوع بن گئی ہے ، اس لیے کہ یہاں اقبال کی عظمتِ آدم تصور اور عشقِ رسول ؐ ایک دوسرے میں جذب ہو گئے اور ہمارے شاعروں نے آں حضرت ؐ کی ذاتِ گرامی کا ذکر ایسے والہانہ انداز میں کیا کہ نعت ، تغزل کی معراج بن گئی ۔''

(اردو ادب کے بیس سال ، المعارف ، لاہور ،
جنوری ، فروری ۱۹۶۸ء ص ۳۸-۳۹)

* * *

''میں اقبال کو محض مفکر نہیں ، مفکر شاعر ، بہت بڑا مفکر مانتا ہوں جس نے شاعری کو اظہار کا وسیلہ بنایا اور شاعری کے سارے تقاضے پورے کیے ۔''

(نقوش ، لاہور ، شمارہ ۲۲ ، جنوری ۱۹۷۷ء ص ۶۱۰)

* * *

''علامہ اقبال سے پروفیسر حمید احمد خاں کے علاوہ اور بھی بہت سے لوگ ملے اور شاید وقت اور مدت کے اعتبار سے دیکھا جائے تو بعض صاحبان ایسے ہوں گے جن کا زیادہ وقت اقبال کے ساتھ گزرا لیکن وہ اپنے بیانات میں وہ گہرا تأثر پیدا نہیں کر سکے جو حمید احمد خاں نے کیا تو اس کی وجہ بھی تو کچھ ہے؟ میں جو تجزیہ کر سکا ہوں ، حمید احمد خاں مرحوم میں اہم اور غیر اہم کے درمیان امتیاز کرنے کی غیر معمولی صلاحیت تھی۔عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ لوگ بڑی چیزوں پر نظر رکھتے ہیں ، چھوٹی چیزوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں ۔ حمید احمد خاں کی نظر بڑی چیزوں پر ہوتی تھی مگر اس سے زیادہ ان کی نظر چھوٹی چیزوں پر ہوتی تھی اور اسی کا نتیجہ ہے کہ اقبال کی لفظی تصویر بھی اتنی ہی مکمل ہے جتنی کہ اور بادیں اور ملفوظات ۔''

(اقبال کی شخصیت اور شاعری ۔
ٹی وی ریکارڈنگ جون ۱۹۷۵ء)

* * *

''اقبال کو سمجھنے کے لیے جن باتوں کی ضرورت ہے وہ بدرجۂ اتم پروفیسر حمید احمد خاں میں موجود تھیں ۔ فلسفے

پر آن کی گہری نظر ، اسلامی تاریخ سے گہرا شغف اور ادب کے ساتھ اور خصوصیت کے ساتھ انگریزی ادب ، فارسی ادب ، اور اردو ادب ، تینوں سے یکساں تعلق اور یکساں شغف ، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اقبال کے کلام کو وہ جس طرح سمجھتے ہیں اور جس طرح اس کا تجزیہ کرتے ہیں وہ صرف اسی شخص کے لیے ممکن ہے جو ان تینوں زبانوں کے ادب پر ایک گہری عالمانہ نظر رکھتا ہو۔"

(اقبال کی شخصیت اور شاعری ،
ٹی وی ریکارڈنگ ، جون ۱۹۷۵ء)

* * *

"حیاتِ جاوید" کے بارے میں شبلی کا ایک قول ہے کہ وہ مدلل مداحی ہے۔ حمید احمد خاں صاحب نے بے شک اقبال کی مدح کی ہے لیکن مدلل مدح۔ یہ آن کا اسلوب ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ مدح کر رہے ہیں لیکن وہ مدح اتنی صریح ہوتی ہے اور صحیح ہوتی ہے اور حق بجانب ہوتی ہے اور اتنی دلائل پر مبنی ہوتی ہے کہ کوئی آن پر یہ الزام نہیں لگا سکتا کہ آنھوں نے وکالت کی۔ تو سب سے بڑی خوبی وکالت کی یہی ہے کہ وکالت ہوتے ہوئے بھی دیانت کو ترک نہیں کرتے۔"

(اقبال کی شخصیت اور شاعری ،
ٹی وی ریکارڈنگ جون ۱۹۷۵ء)

* * *

"پروفیسر حمید احمد خاں کی کتاب "اقبال کی شخصیت اور شاعری" کے مضامین کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ لکھنے

والے کو اگرچہ اقبال سے گہری عقیدت ہے لیکن اس عقیدت کے باوجود ، اقبال کی شخصیت کا جو تصور ان مضامین کو پڑھ کر ابھرتا ہے وہ حقیقت پسندانہ رہتا ہے ، اس لیے یہ بڑا قابلِ قدر اضافہ ہے اقبالیات میں۔"

(اقبال کی شخصیت اور شاعری ،
ٹی وی ریکارڈنگ ، جون ۱۹۷۵ء)

'عقل و دل' اقبالؒ کی نظر میں

اقبال ایک فلسفۂ حیات کے واضع اور اس فلسفے کے آئین و ضوابط کے مبصر اور مفسر ہیں ۔ اس آئین کی فلسفیانہ اور منطقی تفسیر بھی انھوں نے اپنے شعر کے ذریعے کی ہے اور ان ضوابط کی عملی تعبیر کا وسیلہ بھی اسی شعر کو بنایا ہے ۔ شعر جو ہنر و فن کی لفظی صورت گری ہے ہیچ ، نا کارہ و بے معنی ہے اگر وہ سوز خودی کے جوہر سے خالی ہو ۔ جو ہنر (اور یہاں یہ سمجھ لیجیے کہ جو شعر) ضرب کلیمی کے معجزے کا امانت دار نہیں ، اقبال کی نظر میں وہ ہنر (یا فن) نہیں کچھ اور ہے ۔

ان کی آرزو مندی کی نظر اس نوائے کارگر پر ہے جو ستاروں کو پگھلا دینے کے وصف سے متصف ہو ۔ رنگ و خشت و سنگ اور چنگ و حرف و صوت کے معجزات کا وجود اس فلسفی شاعر کے نزدیک خودی کی تعمیر و نگہبانی ہے ۔ اقبال تعمیر و نگہبانی کا یہ فریضہ انجام دینے اور اس منصب سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ''یک چمن گل ، یک نیستان نالہ ، یک خم خانۂ مے'' کا سرمایہ لے کر بزم شوق میں آتے اور موقع محل کی مناسبت اور نفسیاتی تقاضوں کی مطابقت کے لحاظ سے خطیب ، واعظ ، ناصح ، مصلح ، فلسفی اور شاعر کے انداز اور لہجے میں اپنی بات دوسروں تک پہنچاتے ہیں ۔

اقبال کی پوری شاعری اور خصوصاً اس دور کی شاعری جس

میں ان کے افکار اور تصورات میں ایک مخصوص فلسفۂ حیات کے مختلف رخوں کا جلوہ نظر آتا ہے ، خودی کے مفہوم کی مفسر اور ترجمان ہے - کلام اقبال کا یہ حصہ کبھی خطیبانہ اور ناصحانہ انداز میں ، کبھی منطقی اور فلسفیانہ لہجے میں اور اکثر و بیشتر بڑے لطیف اور دل نشیں شاعرانہ اسلوب میں خودی کے کسی نکتے اور خودی کی تشکیل و تعمیر کرنے والے کسی تصور یا جز کی وضاحت کرتا ہے - ان مختلف اجزا اور عناصر میں سے ایک ، یعنی عشق ایسا ہے جس کے مفہوم کے اظہار اور ابلاغ میں اقبال کے ملے جلے حکیمانہ اور شاعرانہ مزاج کو بے حد دخل ہے -

عشق کو اقبال زندگی کا زبردست محرک عمل کہتے ہیں - اسی محرک کی مدد سے انسان فطرت کی تسخیر کرتا ہے - انسانی وجود کے صحیح اور مکمل مفہوم کا ادراک عشق کی رہنمائی میں ہوتا ہے- وہ نہ صرف مادی زندگی کی ضمانت ہے بلکہ حیات بعد ممات بھی اسی کی بدولت ممکن ہوتی ہے - عشق کے یہ معنی سمجھاتے ہوئے اقبال نے عقل کے معنی بھی سمجھائے ہیں اور انسانی زندگی میں اس کی اہمیت کے اعتراف کے باوجود اسے عشق کے مقابلے میں ایک کمتر درجے کی چیز بتایا ہے اور یہ بات کہنے کے لیے بے شمار اسلوب اختیار کیے ہیں - یہ تقابل جن مختلف صورتوں میں پڑھنے والے کے سامنے آتا ہے ، اس کی چند مثالیں ملاحظہ کیجیے :

در بود و نبودِ من اندیشہ گماں ہا داشت
از عشق ہویدا شد این نکتہ کہ ہستم من

گویا جس انسانی زندگی کی حقیقت کا ادراک اندیشے یا عقل کے ذریعے ممکن نہ ہوا ، اس کے معنی عشق نے بتائے - یا یوں کہ

جس وجود کے ہست و بود یا بقا و فنا کے متعلق عقل کے دل میں طرح طرح کے وسوسے تھے ، اسے عشق کی بدولت بقائے دوام حاصل ہوئی ۔ اب کچھ شعر اور سن لیجیے :

خرد سے راہرو روشن بصر ہے
خرد کیا ہے ؟ چراغِ رہگزر ہے

درونِ خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا
چراغِ رہگزر کو کیا خبر ہے

* * *

عقل گو آستاں سے دور نہیں
اس کی تقدیر میں حضور نہیں

علم میں بھی سرور ہے لیکن
یہ وہ جنت ہے جس میں حور نہیں

دلِ بینا بھی کر خدا سے طلب
آنکھ کا نور ، دل کا نور نہیں

* * *

یا پھر عقل اور عشق کا فرق ان مصرعوں میں دیکھیے :

علم مقامِ صفات ، عشق تماشائے ذات

* * *

علم ہے پیدا سوال، عشق ہے پنہاں جواب

*　　*　　*

عشق سراپا حضور ، علم سراپا حجاب

اقبال نے عقل اور عشق کا فرق بیان کرنے کے جو مختلف انداز اختیار کیے ہیں ، ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ عقل اور عشق کی باہمی گفتگو سے ان کی امتیازی خصوصیات نمایاں کرتے ہیں اور یہ بات پڑھنے اور سننے والے پر چھوڑ دیتے ہیں کہ وہ عقل کے مقابلے میں عشق کے مرتبے اور مقام کا تعین کرے ۔ لیکن مکالمے کا انداز اس طرح کا ہوتا ہے کہ قاری یا سامع بھی اقبال کا ہم خیال بن کر عشق کی بدیہی برتری کا قائل ہو جاتا ہے ۔ اسی طرح کا ایک مکالمہ پیام مشرق میں ہے ۔ علم (جو عقل کا نمائندہ ہے) کہتا ہے :

نگاہم رازدارِ ہفت و چار است
گرفتارِ کمندم روزگار است

جہاں بینم باین سو باز کردند
مرا با آنسوے گردوں چہ کار است

چکد ار نغمہ از سازے کہ دارم
بیازار افگنم رازے کہ دارم

اب عشق کا جواب ملاحظہ کیجیے :

ز افسونِ تو دریا شعلہ زار است
ہوا آتش گزار و زہردار است

چو با من یار بودی ، نور بودی
بریدی از من و نورِ تو نار است

بخلوت خانهٔ لاہوت زادی
ولیکن در نخِ شیطان فتادی

بیا این خاکدان را گلستان ساز
جہانِ پیر را دیگر جوان ساز

بیا یک ذرہ از دردِ دلم گیر
تنِ گردوں بہشتِ جاوداں ساز

ز روزِ آفرینش بےدم استیم
بہاں یک نغمہ را زیر و بم استیم

اس مکالمے کے دونوں کرداروں کی زبان سے نکلی ہوئی باتیں ایک طرف تو عقل اور عشق کی صلاحیتوں کے حدود متعین کرتی ہیں اور دوسری طرف ان دونوں کرداروں کے مزاج پر روشنی ڈالتی ہیں ۔ علم (عقل) کو اپنی صلاحیتوں پر ناز بلکہ غرور ہے جس نے اس کے لہجے میں خود پسندی کا رنگ پیدا کر دیا ہے ۔ عشق کا لہجہ اس کے برخلاف سنجیدہ اور متانت آمیز ہے اور یہ اس کی بزرگی اور وقار کی علامت ہے ۔

علم اور عشق (یا عقل اور عشق) کی اس گفتگو کو اپنے سامنے رکھیے اور بانگ درا کے پہلے دور کی ایک سیدھی سادی نظم ''عقل و دل'' پر نظر ڈالیے ۔ جس طرح پیام مشرق والی نظم میں

علم نے عقل کی نمائندگی کی ہے ، بانگ درا والی نظم میں دل عشق کا ترجمان ہے - ''عقل و دل'' اس لحاظ سے ''پیام مشرق'' کی نظم (محاورۂ علم و عشق) سے مختلف ہے کہ اس میں علم اور عشق دونوں اپنی اپنی بات اس طرح کرتے ہیں کہ شاعر ان کے درمیان نہیں آتا - نہ صرف یہ بلکہ علم اپنی بات یوں شروع کرتا ہے جیسے وہ ہوا سے باتیں کر رہا ہے ، کسی سے مخاطب نہیں - عشق نے علم کی خود ستائی کے جواب میں جو کچھ کہا ہے اس میں وہ علم سے مخاطب تو ضرور ہے لیکن اس کا انداز کسی روٹھے ہوئے شخص کا سا ہے - اس کی گفتگو میں بھی قرب ، نزدیکی یا یگانگت کے بجائے ایک طرح کا بعد ، دوری ، غیریت اور بے گانگی ہے اور اس لیے اس کے باوجود کہ علم اور عشق دونوں نے جو کچھ کہا ہے اس میں بڑی معنوی گہرائی ہے ، لیکن دل میں اتر جانے کی کیفیت ذرا بھی نہیں - اس کے برخلاف عقل و دل میں وہ سب باتیں ہیں جو دل کو اپنی طرف کھینچتی اور بالآخر دل میں گھر کرتی ہیں -

اقبال کی اس مختصر نظم کو جو بانگ درا میں ''عقل و دل'' کے عنوان سے چھپی ہے ، میں نے ''عقل و دل'' کی کہانی کا نام دیا ہے اس لیے کہ اس نظم کا سارا اثر ایک دل نشیں کہانی کا سا ہے - کہانی جن دو کرداروں کی ہے ، وہ اپنی بات اس طرح کرتے ہیں کہ ان کی ذات مجسم ہو کر ہمارے سامنے آ جاتی ہے - ان کی شخصیتوں میں جو انفرادیت ہے ، اس کا نقش ان کی زبان سے نکلے ہوئے ایک ایک لفظ سے ابھرتا اور کہانی کے خاتمے تک ایک مستقل صورت اختیار کر لیتا ہے - کہانی کو ایک طرف تو دو کرداروں کی صاف ، سچی اور بے لوث باتوں نے اچھی کہانی بنایا ہے اور دوسری طرف خود کہانی کہنے والے کی دخل اندازی نے اس میں صداقت کا وہ رنگ بھرا ہے ، جو کہانی کے دل نشیں ہونے

کی لازمی شرط ہے - معلوم ہوتا ہے کہ ہم دو کرداروں کی جو کہانی سن رہے ہیں ، وہ کسی تیسرے شخص کا ذاتی مشاہدہ ہے - یوں دو کرداروں کی کہانی ایک تیسرے کردار کی آپ بیتی بن گئی ہے - ایسی آپ بیتی جو کسی تکلف اور تصنع کے بغیر سنائی گئی ہے - اور جب کہانی کہنے کے انداز میں تکلف اور تصنع نہ ہو تو کہانی سننے والا کہانی کہنے والے کے قریب آ جاتا ہے اور کہانی کی رفتار کے ساتھ قرب کا یہ احساس بڑھتا رہتا ہے - - - اس تمہید کے بعد اب سنیے عقل و دل کی کہانی :

عقل نے ایک دن یہ دل سے کہا
بھولے بھٹکے کی رہنما ہوں میں

ہوں زمیں پر ، گزر فلک پہ مرا
دیکھ تو کس قدر رسا ہوں میں

کام دنیا میں رہبری ہے مرا
مثلِ خضرِ خجستہ‌پا ہوں میں

ہوں مفسر کتابِ ہستی کی
مظہرِ شانِ کبریا ہوں میں

بوند اک خون کی ہے تو ، لیکن
غیرتِ لعلِ بے‌بہا ہوں میں

کہانی بغیر کسی تمہید کے اُسی روائتی بیانیہ انداز میں شروع ہوتی ہے ، جو لقمان اور سعدی نے اپنی حکایتوں میں اختیار

کیا اور جسے ہر دور میں اچھی کہانی کا معیار سمجھا گیا ۔ یہ سیدھا سادا بیانیہ انداز پہلے ہی جملے سے ایک ایسی فضا کی تخلیق کرتا ہے ، جس میں کہانی کہنے والا اور کہانی سننے والا دونوں ایک دوسرے کے سامنے آ جاتے ہیں ۔ دونوں کی آنکھیں چار ہوتی ہیں اور ان میں غیر ارادی طور پر ذہنی مفاہمت کا رشتہ قائم ہو جاتا ہے ۔ کہانی کہنے والا جب یہ کہتا ہے کہ ایک دن عقل نے دل سے یہ کہا ، تو ایک زود اثر برقی رو کی طرح تصورات کی کئی لہریں سننے والے کے ذہن میں دوڑ جاتی ہیں ۔ اس کا ذہن چند لفظوں کی مدد سے ایک فضا تعمیر کرتا ہے جس میں تین کردار سرگرم عمل نظر آتے ہیں ۔ عقل کچھ کہہ رہی ہے ، دل کچھ سن رہا ہے اور ایک غیر جانبدار سامع ان دونوں کرداروں کے عمل اور ردِ عمل کو ایک رشتے میں جوڑ رہا ہے ۔

کہنے اور سننے کے متوازی عمل اور رد عمل سے جو فضا بنتی ہے اس میں ''ایک دن'' کی ترکیب ایک زمانی اور بالواسطہ ایک مکانی ماحول کی تشکیل کا کام کرتی ہے اور ساتھ ہی ''یہ'' ایک ایسا اشاریہ بن جاتا ہے جس میں نظر اور ذہن کو کچھ تصویریں چلتی پھرتی دکھائی دیتی ہیں ۔ ان تصویروں کے نقش مبہم اور غیر واضح ہوتے ہیں ۔ اس لیے ذہن فوراً یہ سوال کرتا ہے کہ ''کیا کہا ؟'' ''یہ'' کا لفظ بڑی خاموشی سے اپنا کام کرکے رخصت ہو جاتا ہے اور وہ کام سوالوں کے اس سلسلے کی تخلیق ہے جن کے جواب کی جستجو میں کہانی سننے والا ہمیشہ اُس کھلے ہوئے دروازے کی طرف لپکتا ہے جس میں قدم رکھ کر اسے ایک ان دیکھی دنیا کے نظارے کا یقین ہوتا ہے ۔ نئی اور ان دیکھی دنیاؤں کے نظارے کا یہی شوق سننے والے کے سفر کی مہمیز ہے ۔

کہانی کہنے والے کا کمال یہ ہے کہ اس جذبۂ شوق کو

ابھار کر فوراً اس کی تسکین کا سامان مہیا کرے - قبل اس کے کہ یہ شوق بے چینی اور اضطراب کی صورت اختیار کرے - کہانی کے ابتدائی مرحلے اور تمہیدی منزل میں جس طرح سوال کا پیدا کرنا اچھی قصہ گوئی کی شرط لازم ہے ، اسی طرح اس سوال کا فوری جواب مہیا کرنا بھی اس فن کا ابتدائی اور بنیادی لازمہ ہے - اقبال نے بغیر کسی تاخیر کے دوسرے مصرعے میں یہ لازمی شرط پوری کی ہے اور ''یہ کہا'' کے فوراً بعد در دل پر ''کیا کہا ؟'' نے جو دستک دی تھی ، فوراً اس کا جواب دیا ہے : بھولے بھٹکے کی رہنما ہوں میں - لیکن اس جواب میں سے فوراً ایک سوال صادر ہوتا ہے - مانا کہ عقل بھولے بھٹکے کی رہنما ہے لیکن اس رہنمائی کا انداز کیا ہے ؟ اس سوال کے جواب میں وہ اگلا شعر پڑھتا ہے :

ہوں زمیں پر ، گزر فلک پہ مرا
دیکھ تو کس قدر رسا ہوں میں

جواب میں سب سے پہلے پیدا ہونے والے سوال کا جواب تو نہیں لیکن ایک دعویٰ اور ایک للکار ہے ، دعویٰ پہلے مصرعے میں ''ہوں زمیں پر، گزر فلک پہ مرا -'' اور للکار دوسرے میں ''دیکھ تو کس قدر رسا ہوں میں -'' سننے والے کے لیے دعویٰ میں بھی دلچسپی کا سامان موجود ہے - لیکن زیادہ دلچسپی دوسرے مصرعے کی للکار میں ہے - جس میں کہانی سننے والے کو ''تصادم'' کی ایک ہلکی سی جھلک نظر آتی ہے - یہ تصادم اچھی کہانی کی دوسری لازمی شرط ہے کہ کہانی جتنی مختصر ہو اس شرط کو اتنی ہی جلدی پورا ہونا چاہیے - چنانچہ یہ بات یہاں ہوئی اور عین اس وقت ہوئی جب اسے ہونا چاہیے تھا - سننے والے کا شوق اور بڑھا اور

اس نے تیسرا شعر پڑھا :

کام دنیا میں رہبری ہے مرا
مثلِ خضرِ خجستہ پا ہوں میں

رہنمائی کے دعویٰ نے زیادہ واضح اور زیادہ پر زور صورت اختیار کی ـــ مثل خضر خجستہ پا ہوں میں ، دعویٰ آسان لفظوں کی جگہ پر شکوہ لفظوں میں کیا گیا اور یوں للکار کے اس تصور کو جس کا اظہار دوسرے شعر میں ہوا تھا اور زیادہ تیزی ملی ۔ لہجے کی اس تیزی میں بھی کہانی سننے والے کے لیے آگے بڑھنے کی دعوت موجود ہے ۔ وہ اس دعوت پر لبیک کہتا اور یہ شعر پڑھتا ہے :

ہوں مفسر کتابِ ہستی کی
مظہرِ شانِ کبریا ہوں میں

یہاں لفظوں کا شکوہ بھی بڑھا ہے اور دعویٰ کی لے بھی تیز ہوئی ہے اور اظہار خیال میں استعاروں سے مدد لی گئی ہے ۔ پڑھنے والے کے سامنے بہ یک وقت کئی سوال آ گئے ـــ عقل بھولے بھٹکے کی رہنما ہے ، کس طرح ؟ عقل زمین پر ہے لیکن اس کا گزر فلک پر ہے ـــ اس کے کیا معنی؟ عقل خضر خجستہ پاکی ہم سری کی دعویدار ہے ۔ اس دعویٰ میں کس حد تک صداقت ہے ؟ عقل کتاب ہستی کی مفسر اور شان کبریا کی مظہر ہے ـــ کتاب ہستی اور شان کبریا سے کیا مراد ہے ؟ سوالوں کی اس یورش سے گھبرا

کر وہ جوابوں کی تلاش میں اگلے شعر کی طرف رخ کرتا ہے :

بوند اک خون کی ہے تو ، لیکن
غیرتِ لعلِ بےبہا ہوں میں

لیکن یہ شعر تو اس کے سوالوں کا جواب اور اس کی الجھنوں کا مداوا نہیں - یہاں تو دعویٰ میں غرور کا رنگ شامل ہوگیا ہے اور للکار نے اپنی ستائش کی خاطر دوسرے کی تحقیر و تذلیل کو اپنا شیوہ بنایا ہے - صورت حال اب محض نفسیاتی تصادم کی نہیں رہی - اس کا انداز کھلم کھلا اشتعال انگیز ہے ، اور کہانی پڑھنے والے کے لیے سخت پر تشویش - اس کے دل میں اب تک سوالوں کا جو ہجوم تھا ، ان میں ایک سوال کا اضافہ ہوگیا اور یہ سوال سب سوالوں کو پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھا —— ارے اب کیا ہوگا؟ اور اس سوال میں کئی چھوٹے چھوٹے سوال چھپے ہوئے ہیں - یہ اشتعال آخر کیا صورت اختیار کرے گا ؟ عقل نے دل کی جو توہین کی ہے ، اس سے دل کیا اثر لے گا؟ وہ کیا جواب دے گا ؟ چنانچہ وہ کھلے ہوئے تصادم کا تماشائی بن جاتا ہے اور فوراً اگلا شعر پڑھتا ہے :

دل نے سن کر کہا یہ سب سچ ہے
پر مجھے بھی تو دیکھ کیا ہوں میں

سارے وسوسے ،سارے اندیشے دور ہو جاتے ہیں - تحقیر آمیز اور اشتعال انگیز للکار کے باوجود تصادم کا خطرہ ٹل گیا - بڑی حیرت کی بات ہے - حیرت و استعجاب کے اس عالم میں قاری کے ذہن میں سوال اٹھتا ہے - خطرہ کیسے ٹل گیا ؟ جواب ملتا ہے ''دل کی

دانش مندی سے" اور یہ دانش مندی اور اس دانش مندی کی بدولت اختیار کیا ہوا نرم لہجہ دل کی شخصیت کی بزرگی کا مظہر ہے - دل اس کے لیے محترم بن جاتا ہے اور احترام کے اسی جذبے کے تحت وہ دل کی باتیں سننے کے لیے ہمہ تن گوش بن جاتا ہے - دل نے بڑی نرمی سے جب یہ کہا کہ "پر مجھے بھی تو دیکھ کیا ہوں میں" تو قاری کو یہ احساس بھی ہوا کہ اس نرم لہجے میں ایک عظمت ہے ، ایک وقار ہے اور ایک وقیع اظہار نفس ہے ، اور اس لیے وہ اگلے شعروں کی طرف اس توقع کے ساتھ متوجہ ہوتا ہے کہ اسے اپنے احساس کی صداقت کا امتحان مقصود ہے ، اور اس کے لیے اس سے زیادہ خوشی کی کوئی بات نہیں کہ پہلا ہی شعر اس کے احساس پر صداقت کی مہر ثبت کرتا ہے اور اگلا شعر ، اس سے اگلا شعر اور پھر اس سے اگلا شعر، ان سے صداقت کا نقش مستحکم اور مستحکم تر ہوتا چلا جاتا ہے :

رازِ ہستی کو تو سمجھتی ہے
اور آنکھوں سے دیکھتا ہوں میں

ہے تجھے واسطہ مظاہر سے
اور باطن سے آشنا ہوں میں

علم تجھ سے تو معرفت مجھ سے
تو خدا جُو ، خدا نما ہوں میں

علم کی انتہا ہے بےتابی
اس مرض کی مگر دوا ہوں میں

اور پھر یہ دھیمی لے آہستہ آہستہ تیز اور زیادہ تیز ہوتی ہے :

شمع تو محفلِ صداقت کی
حسن کی بزم کا دیا ہوں میں

تو زمان و مکاں سے رشتہ بپا
طائرِ سدرہ آشنا ہوں میں

اور بالآخر ایک پر وقار اور مسکت ڈرامائی اعلان پر ختم ہوتی ہے :

کس بلندی پہ ہے مقام مرا
عرش رب جلیل کا ہوں میں

نظم کا یہ ٹھہرا ہوا ، متین ڈرامائی انجام قاری کے لیے حد درجہ سکون بخش ہے - چند شعروں میں بیان کی ہوئی اس چھوٹی سی کہانی میں اس کا تعارف دو کرداروں سے ہوا - پہلے کردار نے اپنے متعلق اپنی زبان سے جو جو باتیں کہیں ، ان سے اس کا دل کئی سوالوں کی آماجگاہ بنا ، لیکن اس انکشاف نے کہ یہ پہلا کردار غرور کے نشے میں چور ہے اور اس غرور کے عالم میں خودستائی پر اکتفا نہ کر کے ایسی دریدہ دہنی کا مرتکب ہو رہا ہے ، جس سے کسی کی تحقیر بھی ہو اور دل بھی دکھے تو وہ اس سے بد دل ہو جاتا ہے - اس کا دل چاہتا ہے کہ جو کچھ اس کردار نے کیا ہے ، اسے اس کی سزا ملے ، اسی لیے جب دوسرا کردار اس کے اوصاف کا اعتراف کرتے ہوئے بھی انکسار کے لہجے

میں اپنے اوصاف بیان کرتا ہے تو قاری کے احساسِ انتقام کو تسکین ملتی ہے اور جب بات ساری کی ساری ختم ہو چکتی ہے تو یہ احساس اسے مطمئن اور خوش کرتا ہے کہ لفظوں کے اس تصادم اور پیکار میں جیت اس کی ہوئی جو معزز اور محترم ہے ، لیکن اس معزز اور محترم کردار کی فتح کے تصور سے بھی زیادہ مسرت بخش یہ احساس ہے کہ کمتر درجے کے کردار کو ایسی شکست ہوئی کہ وہ واضح طور پر بے حقیقت اور بے حیثیت نظر آنے لگا۔

'عقل و دل' کو اس نظر سے دیکھیے کہ وہ کس حد تک اقبال کے تصور عقل و عشق کی وضاحت کرتے ہیں اور کس حد تک اس نظم کے ذریعے اقبال عقل و عشق کے فلسفیانہ امتیاز کو نمایاں کر سکے ہیں ، تو نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ اقبال نے عقل و عشق کے متعلق اس چھوٹی سی نظم میں وہ سب باتیں بیان کر دی ہیں جو وہ اپنے فارسی اور اردو کے متفرق اشعار ، غزلوں اور نظموں میں طرح طرح سے بیان کرتے رہے ہیں۔

فنی نقطۂ نظر سے اس نظم کا تجزیہ کیا جائے تو اقبال کے اسلوب اظہار کی کئی خصوصیتیں سامنے آتی ہیں۔ پہلی بات تو یہی کہ نظم کہانی کے انداز میں لکھی گئی ہے۔ اقبال کا کردار اس چھوٹی سی فلسفیانہ کہانی میں کہانی سنانے والے کا ہے اور اس کردار یا منصب کے تقاضے انھوں نے بڑی خوبی اور بڑی جابک دستی سے پورے کیے ہیں۔ اقبال کا مقصود فلسفیانہ تصورات کا تجزیہ کرنا ہے لیکن یہ تجزیہ کرنے کے لیے انھوں نے اپنے اظہار کو کہانی کی شکل دی ہے۔ اور دو فلسفیانہ تصورات کی تجسیم کر کے انھیں اس کہانی کے بولتے چالتے کردار بنایا ہے اور ان کے منہ سے ان اوصاف کا بیان کرایا ہے جن سے ان دونوں

کرداروں کی تصوراتی شخصیت اور ذات کی تشکیل ہوئی ہے۔ دونوں کردار خود اپنی اپنی ذات کا تجزیہ کرتے اور بتاتے ہیں کہ ہم کیا ہیں اور ان کی بتائی ہوئی باتوں سے ہمارا ذہن ان کی شخصیت کی وحدت اور انفرادیت کا ادراک کرتا ہے۔ اقبال کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے دونوں کرداروں کو بات کرنے کا ایسا انداز اور لہجہ دیا ہے کہ ہم ان کی بتائی ہوئی باتوں سے قطع نظر ان کے لہجوں سے ان کی شخصیتوں کے مدارج کا تعین کرتے ہیں اور بالآخر ایک کی پستی اور دوسرے کی بلندی ، ایک کی کمتری اور دوسرے کی برتری کا نقش دلوں میں جاگزیں ہوتا ہے۔ ایک ہماری نظروں میں ذلیل ٹھہرتا ہے اور دوسرا عزیز ہونے کا شرف حاصل کرتا ہے۔

کہانی آغاز ، اٹھان اور تذبذب کے مرحلوں سے گزرتی ہوئی ایک قابل قبول انجام تک پہنچتی ہے۔ اس کا اثر آہستہ آہستہ دلوں میں جگہ کرتا اور بالکل ایک گہرے اور پر معنی تأثر کی صورت میں دل نشین ہوتا ہے۔ نظم کا زور آہستہ آہستہ بڑھتا ہے اور اس وقت ذہن کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیتا ہے جب دل اپنے اور عقل کے اوصاف کو بار بار ترازو کے دو پلڑوں میں رکھ کر دونوں کے فرق کو واضح کرتا جاتا ہے۔

نظم کے اس حصے میں جو اس مصرعے سے شروع ہوتا ہے ''راز ہستی کو تو سمجھتی ہے'' کئی باتیں ہیں ، ان سب سوالوں کا جواب جو عقل کی گفتگو کے دوران میں پیدا ہوئے تھے ، ان اوصاف کا بڑا نازک اور لطیف فرق جس کی بنا پر عقل کو کمتری اور دل کو برتری کا مقام ملا ہے اور سب سے بڑھ کر لفظوں کے انتخاب کی جچی تلی موزونیت ، ان کا باہمی دروبست ، ان کی برابر

بدلتی ہوئی رفتار کا تسلسل اور آہنگ ۔ رفتار کے تسلسل سے پیدا ہونے والی اندرونی موسیقی ، دل کے کردار اور شخصیت کی متانت اور بردباری کے اعتبار سے لفظوں کی روانی میں خوش گوار ٹھہراؤ ۔ ہر شعر کی ردیف میں تعزز نفس کے وجود کا اعلان اور اس اعلان کی پیہم دستک نظم کے وہ فنی وسیلے ہیں جن کی مدد سے اقبال نے اس سیدھی سادی نظم کو حسن بیان کا اعجاز بنانے میں مدد لی ہے ۔ کہانی کے انداز میں لکھی ہوئی یہ چھوٹی سی نظم اسی سہل ممتنع کا نمونہ ہے جس کی آخری شکل اقبال کا ''ساقی نامہ'' ہے ۔

[ماہنامہ ''المعارف'' لاہور ، اپریل ۱۹۷۰ء]

IQBAL–POET AND PHILOSOPHER

"IQBAL is a reformer."

"Iqbal is a philosopher."

Those who think that only these things really matter, announce it from house tops (or whisper when they choose to do so), with just the same volubility or secrecy with which others from pulpits or across the table declare that "Iqbal was a disbeliever" or that "Iqbal was an infidel", Confronted with these solemn confident pronouncements one begins to wonder if it is really a sin to be a reformer or a philosopher. Does Iqbal really deserve to be condemned, so haphazardly and injudiciously as a poet, just because he at times behaves like a reformer (or even a preacher) and employs the technique usually associated with those of this category ? Or does he deserve to be declared an outcast in the realm of poetry because his verse some times bears a semblance of the metaphysical or transcendental—considered to be the sole monopoly of a philosophical thinker?

Yes, Iqbal is a reformer, and yes, he is a philosopher, but my logic, strange though it may seem to some of Iqbal's critics, is that the very fact that Iqbal is a reformer or a philosopher makes him a poet. And my reason for believing in this strange logic is very simple.

Iqbal is a philosopher in the sense that he offers to his readers a coherent and complete philosophy of life, which includes, among other things, the elucidation of the meaning of the concept of 'self or 'Individuality, the process of its

growth through ceasless effort, man's relation with the material values of life which constantly confront and challenge him, his relationship with the social environment and the ultimate reality and the place of intellect and intuition as the guiding forces in the different stages of the human ego's growth.

"This coherent philosophy is the result of an intense emotional and intellectual experience. This intense emotional and intellectual experience which has entered into Iqbal's life in fact into his full being when expressed in words takes either the form of a direct and forceful sermon or a delicate piece of poetry. This is true of all his poetry. Urdu or Persian. And it is only rarely that Iqbal's intensity of feeling has found expression through the technique of the reformer or the preacher. A few illustrations, taken at random, from his poetry will perhaps make my point clear.

Iqbal's concept of the Ego is the basis of his philosophy of life. All other components of his thought structure or philosophy revolve round this axis. Iqbal has given an intellectual elucidation of its meaning in his Lectures and its poetical exposition in his famous. *Mathnawi.* 'Asrar-i-Khudi' and elsewhere in his Persian and Urdu poetry. But never has he failed to put this delicate or intricate subject in words other than poetical. His feeling and thought, blended into a dynamic philosophy have, when put into words, almost always been guided by the laws of "poetic beauty."

One of the several instances of Iqbal's exposition in poetry of the ideal of 'self' is the 'Saqi Namah' After putting forward his concept of life somewhat at length, he asks himself the question.

یہ موج نفس کیا ہے

and readily gets an answer in two simple words :

تلوار ہے

and the complete line reads :.....

یہ موجِ نفس کیا ہے تلوار ہے

And then in the next line of the couplet, he raises another question to which readily comes the answer:

خودی کیا ہے ، تلوار کی دھار ہے

This leads to the 12 couplets which very aptly prove that Iqbal the thinker or philosopher is also a poet in the real sense of the word. To be convinced of it, one has only to read these beautiful lines.

یہ موجِ نفس کیا ہے تلوار ہے
خودی کیا ہے تلوار کی دھار ہے

خودی کیا ہے رازِ درونِ حیات
خودی کیا ہے بیداریِ کائنات

خودی جلوہ بدمست و خلوت پسند
سمندر ہے اک بوند پانی میں بند

اندھیرے اُجالے میں ہے تابناک
من و تو سے پیدا من و تو سے پاک

ازل اس کے پیچھے ، ابد سامنے
نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے

زمانے کے دریا میں بہتی ہوئی
تجسس کی راہیں بدلتی ہوئی

دما دم نگاہیں بدلتی ہوئی

سبک اس کے ہاتھوں میں سنگِ گراں
پہاڑ اس کی ضربوں سے ریگِ رواں

سفر اس کا انجام و آغاز ہے
یہی اس کی تقویم کا راز ہے

کرن چاند میں ہے شرر سنگ میں
یہ بے رنگ ہے ڈوب کر رنگ میں

اسے واسطہ کیا کم و بیش سے
نشیب و فراز و پس و پیش سے

ازل سے ہے یہ کشمکش میں اسیر
ہوئی خاک آدم میں صورت پذیر

خودی کا نشیمن ترے دل میں ہے
فلک جس طرح آنکھ کے تل میں ہے

Mathnavi as a form of poetry although a highly popular form of verse with a tradition of rhythmic fluency and simple chastity is known to be an impossible medium for the expression and

exposition of philosophical ideas for more reasons than one. Firstly because the short metric span of the '*Mathnavi*' can sustain the burden of hardly a dozen words or so in a couplet. Secondly every couplet in this, has to be a '*Matla*,' with the last word of both the lines of the couplet rhyming together. And, thirdly because the language employed has to be very simple and as close to the spoken word as possible.

Iqbal has, while employing this difficult, and at times impossible, form, fulfilled the basic technical requirements of conventional *Mathnawi* using simple and chaste language, arranging aptly chosen words in a rhythmic order, and employing similes, simple yet suggestive and meaningful to make it a beautifully wellknit and fluent poetical unit, which is at once a highly refreshing, invigorating stimulating and convincing intellectual experience. How a poetic mind can turn an essentially intellectual experience into an emotional one is easily manifested here. And it is not here alone that the philosopher Iqbal emerges as the poet Iqbal. Iqbal is capable of doing it whenever he likes. I shall quote two more instances. The first one is a piece from Iqbal's second *Mathnavi*, 'Rumuz-i-Bekhudi' (the Mysteries of selflessness) where Iqbal elucidates the nature of relationship between the individual and his social environment. This elucidation is again a very happy synthesis of thought and emotion. Here it is :

فرد و قوم آئینهٔ یک دیگر اند
ملک و گوہر کہکشان و اختر اند

فرد می گیرد ز ملت احترام
ملت از افراد می یابد نظام

فرد تا اندر جماعت گم شود
قطرۂ وسعت طلب قلزم شود

لفظ چون از بیت خود بیرون نشست
گوہرِ مضمون بجیب خود شکست

برگِ سبزے کز نہالِ خویش ریخت
از بہاران تارِ امیدش گسیخت

فرد تنہا از مقاصد غافل است
قوتش آشفتگی را مائل است

قوم با ضبط آشنا گرداندش
نرم رو مثلِ صبا گرداندش

The poetical devices that Iqbal has used here are surely more convincing than the soundest logic. The thinker in Iqbal appears to be fully conscious of the fact that, unless the poet in him can also make his philosophy aesthetically satisfying to the reader, the impression created would be weak and shortlived. Here again it is through the unity of emotional and the intellectual outlook and through a harmonious fusion of thought and feeling that a piece of poetic art has emerged.

The other piece to which I made a reference just now, is the oft-quoted poem "Haqiqat-eHusn" from Bang-i-Dara, This poem is really a piece of artistic perfection in the sense that Iqbal's philosophical views on what 'Husn or Beauty is, have been condensed in a small poetic unit of seven couplets, which

reveal a series of colour images full of life and drama. The poem begins in a mild, tender and pathetic note with this couplet :

خدا سے حسن نے اک روز یہ سوال کیا
جہاں میں کیوں نہ مجھے تو نے لازوال کیا

And promptly comes the short and slightly curt reply :

ملا جواب کہ تصویر خانہ ہے دنیا
شبِ درازِ عدم کا فسانہ ہے دنیا

ہوئی ہے رنگِ تغیر سے جب نمود اس کی
وہی حسیں ہے حقیقت زوال ہے جس کی

The reply at once puts a dramatic machinery into motion. One character after another plays his brief part and moves away from the scene. One image quickly follows another, and with every couplet the dramatic action develops and finally ends in a tragic note :

کہیں قریب تھا ، یہ گفتگو قمر نے سنی
فلک پہ عام ہوئی اخترِ سحر نے سنی

سحر نے تارے سے سن کر سنائی شبنم کو
فلک کی بات بتادی زمیں کے محرم کو

بھر آئے پھول کے آنسو پیامِ شبنم سے
کلی کا ننھا سا دل خون ہوگیا غم سے

چمن سے روتا ہوا موسمِ بہار گیا
شباب سیر کو آیا تھا سوگوار گیا

Here the drama comes to an end, but not before the cumulative effect of the poetic images has completely taken the enchanted reader into its grip. The task which the thinker-philosopher undertook has finally been accomplished by the poet-artist. This phenomenon often manifests itself, Iqbal the poet has always superseded Iqbal the thinker in turning an intellectual experience into one emotional. There almost always comes a point in all his poetry where the philosophical sense and the aesthetic sense lie very close together. And this is how my strange logic stands proved.

[Civil & Military Gazettee, Lahore May 27, 1962].

اشاریه

۱ - اشخاص

۲ - کتب ، جرائد ، اخبارات

۳ - اماکن

اشخاص

الف

آدمؑ ، ۲۱۱ ، ۲۲۳ ، ۲۲۵ ، ۲۵۷
آذر ، ۷۷
آرنلڈ ، ۶۳
آزاد ، جگن ناتھ ، ۱۶۹ ، ۳۰۸ بتکرار
آل احمد سرور ۔ دیکھیے : سرور ، آل احمد
آل عثمان ، ۲۵۳
آنحضرتؐ ۔ دیکھیے : محمدؐ
آنند ، ملک راج ، ۲۷م ، ۱۳۲
ابراہیمؑ ، ۱۳ ، ۲۳ ، ۴۰ ، ۲۷۲
ابنِ سینا ، ۱۳ ، ۱۳۶ ، ۱۶۱
ابنِ عربی ، ۱۶۱
ابواللیث صدیقی ، ڈاکٹر ، ۱۴۴
ابو ظفر عبدالواحد ، ۱۲۳ ، ۱۲۶
اجمل ، ڈاکٹر محمد ، ۳۰۵ ، ۳۰۷
احمدالدین ، مولوی ، ۱۱۳ ، ۱۲۵
احمد مرسلؐ ۔ دیکھیے : محمدؐ
اختر انصاری ، ۱۴م
اختر جوناگڑھی ، قاضی احمد میاں ، ۳۸م ، ۳۹م بتکرار ، ۴۰م بتکرار ، ۱۴۱م ، ۱۳۰ ، ۱۴۳ ، ۱۵۴ ، ۱۶۸ ، ۱۷۶ ، ۱۸۳ بتکرار
اختر وقار ، ۲۴م
احسان دانش ۔ دیکھیے : دانش ، احسان
ادیب ۔ اے آبادی ، ۲۷م
اسٹالن ، ۱۶۰
اسٹائن گلس ، ۱۰۲ بتکرار
اسکندر ، ۶۰ ، ۲۴۱
اسلم جیراج پوری ، ۲۷م ، ۲۸م بتکرار
اسماعیلؑ ، ۲۷۲ بتکرار
اسماعیل میرٹھی ، ۱۲م
اسیر ، ۱۵۲
اشرف علی تھانوی ، مولانا ، ۳۵ بتکرار
اصغر ، ۱۴۷
اظہر وقار ، ۴۱م
افتخار احمد صدیقی ، ڈاکٹر ، ۲۲م ،

۲۲۴م
افسر میرٹھی ، ۱۱م ، ۱۲م بتکرار
افضل ، محمد رفیق ، ۱۴ ، ۳۴
افلاطون ، ۲۰۰
اکبر الہ‌آبادی ، ۱۳م ، ۴۲ ،
۶۹ بتکرار ، ۷۱ ، ۱۲۵ ،
۱۲۷ ، ۱۴۷ ، ۲۰۵ ، ۲۰۶
بتکرار ، ۲۰۸ بتکرار ، ۲۰۹ ،
۳۱۴
اکبر حسین قریشی ، ڈاکٹر، ۳۰۸
اکرام ، ڈاکٹر ایس - ایم ، ۲۲۶م ،
۲۲۸م
اکرام‌الحق سلیم — دیکھیے : سلیم،
اکرام‌الحق
امان اللہ خان ، امیر ، ۲۵۳
امجد ، امجد اسلام ، ۲۰۵
انتظار حسین ، ۳۱۴
انیس ، ۱۲م بتکرار ، ۳۷م بتکرار،
۱۱۳ بتکرار ، ۲۴۵ ، ۲۷۱
بتکرار ، ۲۷۳ بتکرار ، ۲۷۴
بتکرار ، ۲۷۶ بتکرار ، ۲۷۷
بتکرار ، ۲۷۸ بتکرار ، ۲۷۹
بتکرار ، ۲۸۰ بتکرار ، ۲۸۳ ،
۲۸۶ ، ۲۸۹ بتکرار ، ۲۹۴ ،
۲۹۸ بتکرار ، ۲۹۹ بتکرار ،
۳۰۱ ، ۳۰۲ ، ۳۱۵
اویس قرنی ، ۳۰۰
ایڈلر ، ۱۶۱
ایمرسن ، ۶۰
اینگلز ، ۱۸۷ ، ۲۰۰

ب

بابا فغانی ، ۱۴۹
باقر رضوی ، سجاد ، ۳۱۵
براؤننگ ، ۱۵۶ ، ۱۶۰
براہیم[۴] - دیکھیے : ابراہیم[۴]
برکت علی ، ملک ، ۱۹۵
برگساں ، ۲۲ ، ۱۶۱
برناڈشا ، ۱۶۰
بروہی ، اے - کے ، ۲۰۱
بشیرالدین احمد ، سید ، ۱۲۳
بلال[رض] ، ۲۲۷ ، ۲۶۳
بلقیس جمال افسرہ ، ۲۱م بتکرار
بوذر[رض] ، ۲۶۳
بو عبید ، ۲۶۳
بو علی ، ۲۰ ، ۲۳
بیدل ، مرزا ، ۷ ، ۱۴۹ بتکرار ،
۱۵۰ بتکرار ، ۲۴۹

پ

پرویز (بادشاہ) ، ۱۶ ، ۱۸۶
پرویز ، غلام احمد ، ۲۴۷م
پطرس بخاری ، ۱۴م
پلاٹس ، ۱۰۲
پیر رومی - دیکھیے : رومی

ت

تبسم ، صوفی غلام مصطفٰی ، ۲۷م
تسنیم ، ۶۲

ج

جاپان ، ۲۶۳
جابرؓ ، حضرت ، ۱۵۱
جاسیؒ ، ۱۵۱
جاوید ، ۱۹ بتکرار ، ۲۹ بتکرار ، ۳۰ ، ۲۱۹
جاوید ، محمد صدیق ، ۹ م ، ۲۰م
جذبی ، معین احسن ، ۱۴م
جعفر طاہر ، ۳۱۵
جگر ، ۱۴۷
جلال ، ۱۵۲
جلال الدین ، مرزا ، ۳۰۹
جمیل ملک ، ۳۱۵
الجیلی ، ۱۶۱

چ

چراغ حسن حسرت ۔ دیکھیے : حسرت ، چراغ حسن
چکبست ، ۱۲م بتکرار ، ۱۳م

ح

حافظ ، ۱۴۹ بتکرار ، ۱۵۰ ، ۱۵۱ بتکرار
حالی ، ۵ ، ۴۴ ، ۱۰۱ ، ۱۲۷ ، ۱۴۵ ، ۲۴۳ ، ۳۱۲ بتکرار ، ۳۱۴
حامد علی خاں ، ۱۴م
حر ، ۲۷۹
حریت ناصر ، ۲۰م
حسرت ، ۱۴۷ ، ۳۱۲
حسرت ، چراغ حسن ، ۱۴م ، ۱۲۵
حسینؓ ، ۲۷۲ بتکرار ، ۲۷۳ ، ۲۷۶
حفظ الرحمان سہروردی ، مولانا ، ۱۸۹
حفیظ (جالندھری) ، ۲۳۹
حفیظ سید ، ۱۴م
حفیظ ملک ، ۱۷۹
حکیم سلطان ، ۱۶۱
حمید احمد خاں ، پروفیسر ، ۱۴م ، ۴۱م ، ۱۳۸ بتکرار ، ۱۳۹ ، ۱۷۰ ، ۱۷۳ بتکرار ، ۱۷۴ بتکرار ، ۱۷۵ ، ۲۴۷ بتکرار ، ۲۴۸ بتکرار ، ۲۴۹ بتکرار ، ۲۵۰ بتکرار ، ۳۰۵ بتکرار ، ۳۱۸ بتکرار ، ۳۱۹ بتکرار
حمیداللہ خاں ، ۱۰۱
حمیدہ ملک ، ۱۹م
حنیف رامے ، محمد ، ۴۱م ، ۱۹۳ ،

۱۹۴ ، ۱۹۵ بتکرار
حیدرؓ ـ دیکھیے : علیؓ

خ

خالدؓ (بن ولید) ، ۲۵۴
خالد علوی ، ۱۹۹ بتکرار
ختم الرسل ﷺ ـــ دیکھیے : محمد ﷺ
خدیجہ (ایک طالبہ) ، ۲۰م
خسرو ، ۲۰
خضرؑ ، ۱۲ ، ۳۲۷ ، ۳۳۰ بتکرار
خلیلؑ ـــ دیکھیے : ابراہیمؑ

د

دارا ، ۳ ، ۶۰ ، ۲۳۱
دانش ، احسان ، ۲۳۹ ، ۳۱۵
درد ، ۳۱۳

ڈ

ڈانتے ، ۱۷۰ ، ۱۷۲
ڈینی سن راس ، سر ـ دیکھیے : راس ، سر ڈینی سن

ذ

ذاکر ، محمد ، ۱۹۴
ذاکر حسین ، ڈاکٹر ، ۱۴م

ر

رازی ، ۲۰
رامن ، سر ڈینی سن ، ۲۶۳
راس مسعود ، ۸۸ ، ۲۸۵
راغب احسن ، ۲۶م ، ۱۷۸
رحمان ، ڈاکٹر ایس ۔ اے ۔ ، ۱۹۹ ، ۲۰۱ بتکرار
رحمت للعالمین ـ دیکھیے : محمد ﷺ
رسالت مآب ﷺ/رسول اکرم ﷺ/رسول مقبول ﷺ ـ دیکھیے : محمد ﷺ
رشید احمد صدیقی ، ۱۴م بتکرار ، ۲۷م ، ۳۰۸
رفیع الدین ، محمد ، ۱۷۹ ، ۱۸۰ ، ۱۹۶ ، ۱۹۷
رفیع الدین ہاشمی ، ۱۱م ، ۱۵م ، ۱۶م ، ۱۷م ، ۲۳م ، ۳۰م ، ۳۰۵
رومی ، ۱۶ بتکرار ، ۴۰ ، ۱۱۷ ، ۱۲۱ بتکرار ، ۱۲۲ بتکرار ، ۱۴۸ ، ۱۴۹ ، ۱۵۰ بتکرار ، ۱۵۱ ، ۱۶۱ ، ۱۷۲
ریحانہ دارا ، ۲۰م

ز

زاہدہ نزہت ، ۲۲م بتکرار
زبیر ، سید ، ۲۶م ، ۱۷۷ ، ۱۸۴
زرین اختر زیدی ، ۲۲م بتکرار
زرینہ احمد علی ، ۲۱م بتکرار
زہرا معین ، ۲۰۵ ، ۳۰۸

غلام احمد پرویز ـ دیکھیے :
پرویز غلام احمد
غلام السیدین ، خواجہ ، ۱۳م
بتکرار ، ۱۴م بتکرار ، ۳۰۸

ف

فارابی القمری ، ۱۲۵
فاروق رض ، ۲۵۴
قانی ، ۱۴۷
فراز ، احمد ، ۳۱۶
فرائڈ ، ۱۶۱
فرہاد ، ۱۶ ، ۱۸۶
فریدہ مفتی ، ۱۹م
فگار ، چوہدری غلام سرور ، ۱۱۴
فلاطینوس ، ۱۳۶
فیض (فیض احمد) ، ۱۴م ، ۲۳۹ ،
۳۱۳ بتکرار
فیضی ، ۸ ، ۱۵۲ بتکرار

ق

قا آنی ، ۱۵۳ بتکرار
قائد اعظم ، ۳۴م بتکرار
قنبر ، ۲۶۳
قیس ـ دیکھیے : مجنوں
قیصر ، ۱۶۰

ک

کارل مارکس ـ دیکھیے : مارکس
کارلائل ، ۱۶۰
کانٹ ، ۱۶۱
کلیم ۳ ، ۴۰ ، ۷۳ ، ۲۱۸
کوہ کن ـ دیکھیے : فرہاد
کیٹس ، ۱۲۲

گ

گوئٹے ، ۱۶۱ ، ۱۷۲

ل

لقمان ، ۳۲۷
لیلیٰ ، ۲۹۶ ، ۲۹۷
لینن ، ۱۹۲ ، ۲۰۰

م

مارکس ، ۱۸۵ ، ۱۶۱ ، ۱۸۶
بتکرار ، ۱۸۷ بتکرار ، ۱۸۸ ،
۱۹۲ ، ۱۹۸ ، ۲۰۰
مارگن ، لائڈ ، ۱۶۰
ماکیا فیلی ، ۱۷۸
مبارک علی مرزا ، ۱۹م
مجتبیٰ مینوی ، ۱۹م
مجنوں ، ۱۱۵ ، ۲۹۶ ، ۲۹۷ ،
محمد (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) ،
۲۳ ، ۴۰ ، ۴۱ ، ۴۵ بتکرار ،
۴۶ ، ۴۸ ، ۱۰۷ بتکرار ، ۱۱۷
بتکرار ، ۱۳۶ ، ۱۸۲ ، ۲۲۶
بتکرار ، ۲۲۷ ، ۲۲۸ بتکرار ،
۲۲۹ بتکرار ، ۲۳۰ ، ۲۳۱ ،

۲۵۴ ، ۲۵۵ بتکرار ، ۲۵۸ ،
۲۹۶ ، ۳۱۲ ، ۳۱۷
محمد اکبر خاں ، ۲۷م
محمد حسن قرشی ، حکیم ، ۱۲۵
محمد حسین ، مولوی ، ۱۲م بتکرار
محمد حسنین ، سید ، ۱۱۵
محمد مجیب ، پروفیسر ، ۱۱۵ ،
۱۱۸
محمد محمود زمان خاں ، ۲۷م
محمد منور ، مرزا ، ۱۴۴ بتکرار
محمود ، ۲۰ ، ۱۰۳ ، ۲۲۱
مزدک ، ۱۸۶ ، ۲۰۰
مسعود احمد ، ۳۰۸
مسعود حسن رضوی ادیب ، سید ،
۱۲م
مسولینی ، ۱۶۰
مسیح ؑ ، ۴۰
مصحفی ، ۳۱۳ بتکرار
مصطفٰی - دیکھیے : محمد
مصطفٰی زیدی ، ۳۱۵
مظفر ، سلطان ، ۳۶ بتکرار
معراج نیر ، ۲۰۵
معین احسن جذبی - دیکھیے :
جذبی معین احسن
معین الرحمان ، ڈاکٹر سید ، ۱ ،
۳ ، ۵ ، ۷ ، ۹ ، ۱۹م ، ۲۱م ،
۲۲م بتکرار ، ۲۴م ، ۲۸م ،
۴۳م ، ۲۴۶ ، ۳۰۳
ملک قمی ، ۸
ممتاز حسن ، ۲۶م ، ۲۷م ، ۱۳۱ ،
۱۳۲ ، ۱۷۸
منظور الاسلام ، ۲۲م بتکرار
منظورالحق صدیقی ، ۱۹م
منظور حسین ، خواجہ ، ۱۴م
منیر ، ۲۳۱
مولانا روم - دیکھیے : رومی
مولائے کل - دیکھیے : محمد ؐ
مومن ، ۱۴۷ ، ۳۱۳ بتکرار
مہر ، ۱۲۵
مہر افروز درانی ، ۱۹م
میڈو گل ، ۱۶۰
میر (میر تقی) ، ۱۵م ، ۱۴۷ ،
۳۱۳ ، ۳۱۴ بتکرار ، ۳۱۵

ن

ناز کاظمی ، ۲۰۵
ناصر (کاظمی) ، ۲۳۹
ناصر ، نصیر احمد ، ۱۶۳ بتکرار ،
۱۶۵ ، ۱۶۷ بتکرار
ناہید طلعت ، ۲۱م بتکرار
نبی کریم ؐ - دیکھیے : محمد ؐ
نپولین ، ۱۶۰
نجم الحسن خواجہ ، ۲۲۶
ندیم قاسمی ، احمد ، ۱۲۵ ، ۲۳۹ ،
۳۱۵
نذیر احمد (ڈپٹی) ، ۲۰۵ ، ۲۰۶

بتکرار ، ۲۰۸ ، ۲۰۹
نذیر نیازی ، سید ، ۱۲۴ بتکرار ،
۱۲۵ ، ۳۰۴ ، ۳۰۶
نطشے ، ۱۲۱ بتکرار ، ۱۲۲ بتکرار
نمرود ، ۲۳۴
نواب صاحب بھوپال - دیکھیے :
حمیداللہ خان
نور محمد ، ۳۰۵
نور محمد ، شیخ ، ۳۰۵ بتکرار
نیازالدین خان ، خان ، ۳۰۹
نیر جہان نامی ، ۱۹م

و

ورڈز ورتھ ، ۱۵۶ ، ۱۷۵
وزیر آغا ، ڈاکٹر ، ۱۴۵
وقار عظیم ، پروفیسر سید ، ۱ ،
۵ ، ۷ ، ۱۰م بتکرار ، ۱۱ ،
۱۵ ، ۱۶م بتکرار ، ۱۹م بتکرار ،
۲۰م بتکرار ، ۲۱م بتکرار ،
۲۲م بتکرار ، ۲۳م بتکرار ،
۲۴م بتکرار ، ۲۵م ، ۲۶م
بتکرار ، ۲۸م ، ۲۹م بتکرار ،
۳۰م بتکرار ، ۳۱م ، ۳۲م
بتکرار ، ۳۵م بتکرار ، ۳۷م ،
۳۸م بتکرار ، ۴۰م بتکرار ،
۴۱م بتکرار ، ۴۲م بتکرار ،
۴۳م بتکرار ، ۱۳۰ ، ۱۳۴ ،
۱۴۴ ، ۱۴۶ بتکرار ، ۱۴۷ ،
۱۷۷ ، ۱۸۴ ، ۲۰۵ بتکرار ،
۲۴۶ ، ۲۷۴ ، ۲۷۹ ، ۲۹۱ ،
۳۰۳ بتکرار ، ۳۰۵ بتکرار ،
۳۰۷ ، ۳۰۹
ویلز ، ایچ - جی ، ۱۶۰

ہ

ہاشم ، ۱۰۳
ہٹلر ، ۱۶۰
ہومر ، ۱۷۰
ہیگل ، ۲۲ ، ۱۸۷ بتکرار

ی

یاسمین سلطانہ ، ۲۰م
یوسف[۴] ، ۲۶۵ ، ۲۸۷ ، ۲۹۰
بتکرار
یوسف حسین خاں ، ڈاکٹر ، ۱۲۲
بتکرار ، ۱۲۳ ، ۱۴۳ ، ۱۴۴ ،
۳۰۸ بتکرار
یوسف سلیم چشتی ، ۱۲۷ بتکرار
Abdul Qadir, 169
Brohi, A..K., 200
Rehman, S.A., 200
Sharif, M.M., 159
Waheed, K.A., 13م

کتب ، جرائد ، اخبارات

الف

آفاق (روزنامہ) ، ۳۱۵
ادب لطیف (مجلہ) ، ۲۴م ، ۲۵م
ادبی دنیا (مجلہ) ، ۲۴م
اردو (مجلہ) ، ۱۱۴ ، ۱۱۸ ، ۱۲۷
اردو ترجمہ اقبال لاہور (مقالہ) ، ۱۹م
اردو شاعری پر اقبال کے اثرات (مقالہ) ، ۱۹م
ارمغان حجاز ، ۴ ، ۱۷ بتکرار ، ۲۶ ، ۳۲ ، ۳۸ ، ۴۲ بتکرار ، ۸۸ ، ۸۹ بتکرار ، ۹۰ ، ۹۵ بتکرار ، ۹۶ ، ۱۰۵ ، ۱۵۹ ، ۲۰۱ ، ۲۲۶ ، ۲۲۷ ، ۲۷۸ ، ۲۸۵ بتکرار ، ۲۸۶
اسلام کا اقتصادی نظام ، ۱۸۹
استقلال ، ۲۴م بتکرار ، ۲۵م بتکرار
اسرار خودی ، ۲۷م ، ۷۲ ، ۷۵ ، ۷۶ ، ۱۰۴ ، ۱۰۵ ، ۱۴۱ ، ۲۰۱ ، ۲۵۴ ، ۲۶۰ ، ۲۶۶ بتکرار ، ۳۱۱
اسرار و رموز ، ۱۹ ، ۴۶ ، ۲۱۴ ، ۲۲۷
اقبال (کتاب) ، ۱۱۳ ، ۱۱۴ ، ۱۱۸ بتکرار
اقبال (مجلہ) ، ۲۵م ، ۳۱م ، ۳۶م بتکرار ، ۴۹
اقبال اور احیائے دین ، ۹۹ ، ۱ بتکرار
اقبال اور اس کا عہد ، ۱۶۹
اقبال اور اس کی شاعری اور پیغام ، ۱۱۴
اقبال اور جمالیات ، ۱۶۳ بتکرار ، ۱۶۴ ، ۱۶۷ بتکرار
اقبال اور سوشلزم ، ۱۹۳ ، ۱۹۵ بتکرار ، ۲۰۰
اقبال اور مغربی مفکرین ، ۳۰۸
اقبال اور مناظر فطرت (مقالہ) ، ۲۱م بتکرار
اقبال ریویو (مجلہ) ، ۲۵م ، ۳۶م ، ۱۰۹
اقبال ریویو کی وضاحتی فہرست ، ۲۱م بتکرار
اقبال شاعر اور فلسفی ، ۱۰م ،

۱۵م ، ۲۴م بتکرار ، ۲۵م ،
۲۶م ، ۳۱م بتکرار ، ۳۸م
بتکرار ، ۴۳م ، ۱۳۴ ، ۱۴۶
بتکرار ، ۱۴۷
اقبال ، شخصیت اور شاعری ،
۳۰۸
اقبال کا ذہنی ارتقاء (مقالہ) ،
۱۹م
اقبال کا علم کلام ، ۱۳۶ بتکرار
اقبال کا فلسفۂ حیات (مقالہ) ،
۱۹م
اقبال کی اردو غزل (مقالہ) ، ۱۹م
اقبال کی امیجری (مقالہ) ، ۲۰م
اقبال کی شاعری کا فنی پہلو (مقالہ)
۲۰م
اقبال کی شخصیت اور شاعری ،
۴۱م بتکرار ، ۱۳۸ ، ۱۳۹ ،
۱۷۰ ، ۱۷۳ بتکرار ، ۱۷۴
بتکرار ، ۱۷۵ ، ۲۴۵ ، ۲۴۷
بتکرار ، ۲۴۹ ، ۳۱۸ ، ۳۱۹
بتکرار ، ۳۲۰
اقبال کی طویل نظموں کا تجزیہ
(مقالہ) ، ۲۰م
اقبال کی قومی شاعری (مقالہ ،
۲۰م
اقبال کی ملی شاعری (مقالہ) ،
۱۹م
اقبال کے ابتدائی افکار ، ۱۳۳ ،
۳۰۸
اقبال کے سیاسی نظریات (مقالہ) ،
۲۰ م
اقبال کے معاشی تصورات ، ۲۲م
بتکرار ،
اقبال معاصرین کی نظر میں ، ۱۰م
۲۶م بتکرار ، ۲۹م بتکرار ،
۳۰م ، ۱۳۱ ، ۱۷۷ بتکرار ،
۱۷۸ بتکرار ، ۱۸۴ بتکرار ،
۳۱۱ بتکرار
اقبال نامہ ، ۴۲ ، ۶۹ ، ۷۰ ،
۱۱۴ ، ۱۲۵ بتکرار ۲۶۹ ،
اقبال ، نئی تشکیل ۱۳۷ ، ۱۷۹ ،
۱۸۵ بتکرار ،
اقبالیات کا مطالعہ ۱ ، ۵ ، ۷ ،
۱۰م ۳۵م ۴۲م
اقبالیات کا تنقیدی جائزہ ، ۳۸م
۳۹م ۴۰م ، ۱۳۰ ، ۱۴۳ ،
۱۵۴ ، ۱۶۸ ، ۱۷۶ ، ۱۸۳
بتکرار ،
ام الکتاب دیکھیے : قرآن
امروز (روز نامہ) ، ۲۴م ، ۳۷م ،
۲۷۰
اوراق (مجلہ) ۲۰۹
الاوسط ، ۴۱

ب

باقیات اقبال ، ۱۰۱ بتکرار ، ۱۳۳

بال جبریل ، ۴ ، ۱۶ ، ۱۸ ، ۱۹ بتکرار ، ۲۱ ، ۲۶ ، ۳۰ ، ۶۲ ، ۷۸ ، ۸۵ بتکرار ، ۸۸ ، ۹۹ ، ۱۰۴ ، ۱۰۵ ، ۱۰۶ ، ۱۰۷ بتکرار ، ۱۴۱ ، ۱۴۴ ، ۱۴۵ بتکرار ۱۴۶ ، ۱۵۹ ، ۲۰۱ ، ۲۱۰ ، ۲۱۱ ، ۲۱۷ ، ۲۱۸ ، ۲۱۹ ، ۲۲۲ ، ۲۲۳ ، ۲۲۵ ، ۲۳۰ ، ۲۳۵ ، ۲۵۴ ، ۲۷۲ بتکرار ، ۲۷۸ ، ۲۸۳ ، ۲۸۴ بتکرار ، ۲۸۵ ، ۲۹۷ ، ۲۹۸ بتکرار ،

بال جبریل کا تنقیدہ جائزہ (مقالہ)، ۲۰م

بانگ درا ، ۱۳م ، ۲ ، ۴ ، ۷ بتکرار، ۱۳ ، ۱۵ ، ۱۶ ، ۱۸ ، ۲۶ ، ۵۴ ، ۵۵ ، ۵۷ ، ۵۹ بتکرار ، ۶۳ بتکرار، ۶۴بتکرار، ۶۷ ، ۷۶، ۷۹ ، ۱۰۰ بتکرار، ۱۳۱ ، ۱۳۷ ، ۱۴۴ ، ۱۵۶ ، ۲۰۱ ، ۲۲۶ ، ۲۲۷ بتکرار ، ۲۳۴ ، ۲۳۵ ، ۲۵۱ ، ۲۷۸ ، ۲۸۰ بتکرار ، ۲۷۸ بتکرار ، ۲۹۲ ، بتکرار ، ۲۹۳ ، ۲۹۶ بتکرار ، ۳۲۵ ، ۳۲۶ بتکرار

بانگ درا کا تنقیدی تجزیہ (مقالہ) ، ۲۰م

پ

پس چہ باید کرد ، ۱۹ ، ۴۵ بتکرار ، ۴۷ ، ۱۰۰ ، ۱۰۳ ، ۱۰۵ ، ۲۲۷ ، ۲۵۴

پیام اقبال ، ۱۱۴ ، ۱۲۶

پیام مشرق ، ۲۸م ، ۴ ، ۷۸ بتکرار ، ۷۹ بتکرار ۸۰ ، ۹۹، ۱۰۰ ، ۱۰۳ ، ۱۰۴ بتکرار ، ۱۰۵ بتکرار ۱۰۷ ، ۱۲۷ ، ۱۴۱ ، ۱۵۱ بتکرار ۱۵۹ ، ۱۸۶ ، ۱۸۷ ، ۱۹۰ بتکرار ، ۲۰۱ ، ۲۱۱ ، ۲۵۳ ، ۲۷۸ ، ۳۱۵ ، ۳۲۴ ، ۳۲۵ ، ۳۲۶

ت

تصورات اقبال ، ۱۴۴ ، ۱۴۶ ، ۱۷۹ ، ۱۸۰ ، بتکرار

تعلیمات اقبال ، ۱۱۴ ۱۲۶ ،

تلمیحات و اشارات اقبال ، ۳۰۸

ج

جامعات میں اقبال کا تنقیدی اور تحقیقی مطالعہ—ایک جائزہ ، ۱۹م

جامعہ (مجلہ) ، ۱۱۴

جاوید نامہ ، ۲۸م ، ۴ ، ۱۹ ،
۲۹ بتکرار ، ۳۰ ، ۳۳ ، ۳۴ ،
۳۶ ، ۳۸ ، ۴۲ ، ۱۰۰ ،
۱۰۵ ، ۱۰۶ بتکرار ۱۰۷ ،
۱۵۹ ، ۱۸۴ ، ۲۰۱ ، ۲۵۷ ،
۲۷۸ ،

جوہر اقبال ، ۱۱۴ ، ۱۱۵ ، ۱۱۸
بتکرار ، ۱۱۹

ح

حافظ اور اقبال ، ۳۰۸

حیات اقبال ایک جذباتی دور ،
۵۸ ، ۱۳۶ ، ۱۹۲ بتکرار

حیات جاوید ، ۳۱۹

حکمت اقبال ، ۱۷۹ ، ۱۸۰ ،
۱۹۶ ، ۱۹۷

خ

خیابان اقبال ، ۱۷۰

ذ

ذکر اقبال ، ۶۳

ر

رموز بے خودی ، ۲۸م بتکرار ،
۱۴۱ ، ۲۶۱ ، ۲۶۴ ، ۲۶۵

روح اقبال ، ۱۴۳

ز

زبور عجم ، ۱۰۰ ، ۱۰۶ ، ۱۵۱ ،
بتکرار ، ۱۵۹ ، ۱۶۷ ، ۲۰۱ ،

س

سب رس (مجلہ) ، ۱۲۷

سول اینڈ ملٹری گزٹ (روز نامہ)
۳۷م

سہ ماہی 'اقبال' کی وضاحتی فہرست
(جنوری ۱۹۶۰ء — اپریل
۱۹۶۷ء) ، ۲۲م بتکرار

سہ ماہی 'اقبال' کی وضاحتی فہرست
(جولائی ۱۹۵۲ء — اکتوبر
۱۹۵۹ء) ، ۲۲ بتکرار

سہیل (مجلہ) ، ۲۷م

سیرت اقبال ، ۱۱۴ ، ۱۲۶

ش

شعر اقبال ، ۱۳۵ ، ۱۵۷ بتکرار ،
۱۵۸ ، بتکرار ۱۵۹

شیرازہ (مجلہ) ، ۱۱۴ ، ۱۲۵ ،
بتکرار

ص

صبح وطن ، ۱۳م

ض

ضرب کلیم ، ۱۴م بتکرار ، ۲۸م ،

۱۹ بتکرار ۲۰ ، ۲۱ ، ۲۲ ،
۲۶ ، ۹۹ ، ۱۰۶ ، ۱۰۸
بتکرار ، ۱۶۷ ، ۲۰۱ ، ۲۵۳ ،
۲۵۵ ، ۲۵۷ ، ۲۸۳ بتکرار ،
۲۸۵ بتکرار ،
ضرب کلیم اور ارمغان حجاز کے
موضوعات کا تنقیدی تجزیہ ،
۲۱م بتکرار

ع

عرفان اقبال ، ۳۰۸
علامہ اقبال کی وفات پر ہندوستان
کے مقتدر شعرا کا اظہار عقیدت
مندی ، ۱۱۳
علامہ اقبال کے کلام میں حکمرانوں
کا تذکرہ (مقالہ) ، ۱۹م

غ

غزل اور ناصر کاظمی (مقالہ) ،
۳۱۳

ف

فاران ، (مجلہ) ۲۳۹
فرہنگ آصفیہ ، ۱۰۲
فرہنگ آنند راج ، ۱۰۲
فکر اقبال ، ۱۳۳ ، ۱۳۵ ، ۱۳۷ ،
۱۳۸ بتکرار ۱۶۹ ، ۱۸۹
بتکرار ، ۱۹۱ ، ۳۰۳
فن اور فن کار ۳۱۲ ، ۳۱۳ بتکرار ،
۳۱۳
فنون (مجلہ) ، ۲۵م

ق

قرآن ، ۳۱ ، ۳۷ ، ۳۰ ، ۱۲۲ ،
۱۷۲ ، ۱۹۳ ، ۱۹۹ ، ۲۱۱ ،
۲۲۶ بتکرار ۲۶۹ ، ۲۸۰ ،
۲۸۹ ، ۲۹۲ ، ۳۱۲

ک

کاروان (مجلہ) ، ۲۳۳
کتاب—دیکھیے : قرآن
کلام اقبال میں تاریخی شخصیتیں
(مقالہ) ، ۲۰م
کلیات (اکبر الہ آبادی) ، ۱۳م

گ

گفتار اقبال ، ۱۳ ، ۳۳ ، ۲۶۳
گلکدہ ، ۱۳م
گلی کوچے ، ۳۱۳

ل

لیل و نہار ، ۲۳م

م

ماہ نو (مجلہ)، ۲۳م بتکرار ، ۳۷م،
۳۰۲ ، ۳۰۹ بتکرار ،
متاع اقبال ، ۱۱۳ ، ۱۲۶ بتکرار ،

مختصر شرح الجامع الصغیر للمناوی، ۳۱
مخزن (مجلہ) ، ۲۸م
مراثی انیس ، ۲۷۳ بتکرار ، ۲۷۴ بتکرار ، ۲۸۱ ، ۲۸۲ بتکرار ، ۲۸۶ بتکرار ، ۲۸۷ بتکرار ، ۲۸۸ ، ۲۹۰ بتکرار ، ۲۹۱ بتکرار ، ۲۹۴ بتکرار ، ۲۹۵ بتکرار ، ۲۹۹ ،
مسافر (مثنوی) ، ۲۰۱
مسائل اقبال ، ۱۵۴ ، ۱۷۹ ، ۱۹۶ بتکرار
معارف (مجلہ) ، ۲۷م بتکرار ، ۲۸م ،
المعارف (مجلہ)، ۳۷م، ۳۱۷، ۳۳۶
مقالات اقبال ، ۲۵۶
مقالات یوم اقبال ، ۱۱۴ ، ۱۲۶ ، ۳۰۶ بتکرار
مقامات اقبال ، ۱۴۹ بتکرار، ۱۵۰ بتکرار ، ۱۵۱ بتکرار ، ۱۵۲ بتکرار ، ۱۵۳ بتکرار ، ۱۵۴ ، ۱۵۶ بتکرار ، ۱۵۷ ،
مکاتیب اقبال کا تجزیہ (مقالہ) ، ۲۰م
مکاتیب اقبال کا فکری و فنی پہلو، ۲۱م بتکرار
میزان اقبال، ۱۴۴ بتکرار ، ۱۴۵،

ن

الناظر (مجلہ) ، ۲۷م
نقوش (مجلہ) ۳۱م ، ۲۴۹ ، ۳۱۴ ۳۱۸
نوائے وقت (روز نامہ) ، ۳۰۷
نور اللغات ، ۱۰۲
نیرنگ خیال (مجلہ) ، ۲۶ بتکرارم ۲۷م بتکرار ، ۱۸۳ ، ۱۸۴

ہمایوں (مجلہ)، ۲۴م ، ۲۶م، ۲۷م ، ۲۸م ،

ی

یاد اقبال ، ۱۱۴
Asrar-i-Khudi, 338
Bang-i-Dara, 342
Bibliography of Iqbal, 13م
Civil and Military Gazettee, 344
Great Men of India, 185
Great Poet of Islam, 169
Iqbal, Poet Philosopher of Pakistan, 179

Iqbal's Thought and Art, 159, 162
Rumuz-i-Bekhudi, 341
Iqbal and Socialism, 200
Iqbal's Educational Philosophy, 13م

کنعان ، ۲۶۵ بتکرار

ل

لاہور ، ۱۱ ، ۱۵ ، ۱۶ بتکرار ، ۱۷ بتکرار ، ۱۸ ، ۲۳ ، ۲۴ بتکرار ، ۲۵ بتکرار ، ۲۶ بتکرار ، ۲۷ بتکرار ، ۲۸ بتکرار ، ۳۰ ، ۳۱ بتکرار ، ۳۲ بتکرار ، ۳۳ بتکرار ، ۳۴ بتکرار ، ۳۵ ، ۳۶ بتکرار ، ۳۷ بتکرار ، ۳۸ ، ۴۰ بتکرار ، ۷ ، ۱۶ ، ۱۷ ، ۱۹ ، ۲۹ ، ۴۹ ، ۵۸ ، ۷۰ ، ۷۱ ، ۱۱۳ ، ۱۱۴ ، ۱۲۵ بتکرار ، ۱۲۶ بتکرار ، ۱۲۷ بتکرار ، ۱۳۰ ، ۱۴۶ ، ۱۷۷ ، ۱۸۳ ، ۱۸۴ ، ۱۹۳ ، ۲۰۵ ، ۲۰۹ ، ۲۱۰ ، ۲۱۶ ، ۲۱۷ ، ۲۱۹ ، ۲۲۷ ، ۲۳۳ ، ۲۳۹ ، ۲۴۷ ، ۲۴۹ بتکرار ، ۲۶۸ ، ۲۷۰ ، ۲۷۳ ، ۳۰۵ ، ۳۰۶ بتکرار ، ۳۰۷ ، ۳۰۸ بتکرار ، ۳۰۹ ، ۳۱۰ ، ۳۱۱ ، ۳۱۲ ، ۳۱۴ ، ۳۱۵ ، ۳۱۷ ، ۳۱۸ ، ۳۳۶

لکھنؤ ، ۲۷م

لندن ، ۱۵ ، ۳۴ ، ۲۱۹

م

مچھلی شہر ، ۳۰۸

مزار اقبال ، ۳۴م

مسجد قرطبہ ، ۱۰۷ ، ۲۸۴

مصر ، ۲۵۵ ، ۲۶۵ بتکرار

مکہ ، ۲۵۷

ن

نجد ، ۲۹۶

نیکر (دریا) ، ۶۵ بتکرار

نیل (دریا) ، ۲۵۳ ، ۲۵۶

ہ

ہندوستان ، ۲۳م ، ۴ ، ۶۸ ، ۱۱۸ ، ۱۳۹ بتکرار ، ۱۴۲ ، ۱۴۹ ، ۱۵۰ ، ۱۵۱ ، ۱۵۲ ، ۱۷۱ بتکرار ، ۱۷۷ ، ۱۹۲ ، ۲۱۹ ، ۲۵۵ ، ۲۸۵ ، ۳۰۶ ، ۳۰۸ بتکرار

ی

یثرب ، ۹۰ ، ۲۲۷ ، ۲۲۸

یو - پی - ، ۱۵م

یورپ ، ۲ ، ۳ ، ۶۴ ، ۶۷ ، ۶۸ ، ۱۳۴ بتکرار ، ۱۳۵ ، ۱۳۹ ، ۱۴۰ بتکرار ، ۱۶۰ ، ۱۶۱ ، ۱۷۷ ، ۱۸۷ بتکرار ، ۲۲۷ ، ۲۵۶

Karachi, 200

Lahore, 344